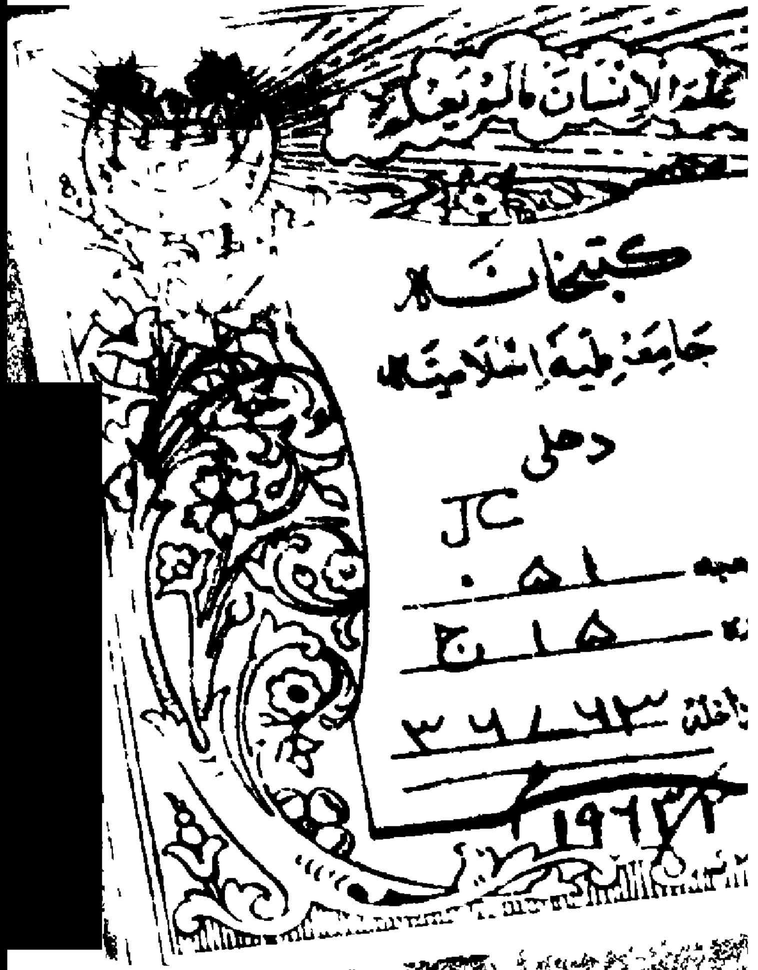

کتبخانہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
JC

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۹	بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۳ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب — ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ — ضیاء الحسن فاروقی

عبداللطیف اعظمی (مرتب)

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

"مرقع دہلی"

پروفیسر محمد مجیب

"مرقع دہلی" میں کچھ الف لیلا کی شان ہے، کچھ محتسب کی رپورٹ کا شائبہ، در اصل وہ ایسے شخص کا بیان ہے جس نے آنکھ کی دیکھی بات قلم سے لکھ دی، بغیر اس بحث کو چھیڑے ہوئے کہ لوگ کیا کرتے ہیں اور مذہب کا تقاضا کیا ہے "مرقع" اخلاقی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہوتا تو اس میں حالات کا ایسا صاف عکس نہ ہوتا اور پڑھنے والے کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوتا کہ کسی ناصح نے اپنا غصہ اتارنے کے لیے بیگناہوں کو خواہ مخواہ بدنام نہیں کیا ہے تو کم از کم ایسی باتوں کو جن میں کوئی خاص عیب نہیں ہے بداخلاقی کی مثال بنا لیا ہے۔ اپنی موجودہ صورت میں "مرقع" حقیقت نگاری کی ایک مشق ہے جسے اعلیٰ اور پست اخلاق کے مقامات اور مراتب سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ نتیجہ پڑھنے والا خود نکال سکتا ہے کہ اگر نادر شاہ کے حملے کے بعد دہلی کا وہ حال تھا جو "مرقع" میں نظر آتا ہے تو نادر شاہی حملہ اور نادر کی فوج کی زیادتیوں پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں، جو ہوا اسے ہونا چاہیے تھا۔

لیکن کیا کل حقیقت وہی ہے جو "مرقع" کے مصنف نے دیکھی اور بیان کی ہے؟ کیا اورنگ زیب، شاہ جہاں، جہانگیر اور اکبر کے زمانے میں امردوں، طوائفوں، قحبہ خانوں کی کچھ کمی تھی؟ کیا کبھی کسی بڑے ملک کے دار السلطنت اور دربار کی زندگی ان عیبوں سے پاک تھی جو "مرقع" میں حالات کے روپ میں پیش کیے گئے ہیں؟ کیا یہ عیب ہمیشہ زوال کی علامت تھے؟ مورخ مثالیں تلاش کرے گا تو ہر طرح کی ملیں گی، مگر غالباً زیادہ تر ایسی جن سے ثابت ہوگا کہ زوال کے دور میں ہر جگہ بداخلاقی کے آثار ملتے ہیں اور یہ ثابت نہ ہوگا کہ ترقی کے دور میں یہ آثار موجود نہ تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں غنڈہ گردی کا یہ عالم تھا کہ شریف عورتوں کو اکیلے گھر سے نکلنے اور زیارتوں کو جانے کی ممانعت کرنی پڑی، لیکن خلجی دور میں جب شیخ نظام الدین غیاث پور سے شیخ قطب الدین

مختیار کے مزار پر تشریف لے جاتے تھے تو طوائفیں راستہ کے دونوں طرف قطاریں بنا کر سلام کرنے کو کھڑی ہو جاتی تھیں اور تغلق کے عہد میں دہلی اور دولت آباد میں بڑے محلے تھے جو طرب آباد کہلاتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں دارالسلطنت کی طوائفوں کو الگ آباد کیا گیا اور ان کے پاس جانے والوں کے نام رجسٹروں میں درج کئے جانے لگے۔ اس آبادی میں اضافہ اس تیزی کے ساتھ ہو رہا تھا کہ اکبر اس کی تحقیق کرنے پر مجبور ہوا کہ نوجوان عورتوں کو خاندانی زندگی کے لئے نا قابل بنانے میں اس کے امراء کا کتنا قصور ہے۔

انسان کی طبیعت پر ماحول کا اثر بے شک پڑتا ہے، مگر اتنا نہیں کہ ہر ملک اور زمانہ کی عادت اور عمل کو الگ نفسیاتی اصولوں کے مطابق جانچنا پڑے۔ ہندوستان میں اور اسباب کے علاوہ جدید اخلاقی کی طرف مائل کرنے ایک اور مذہبی [illegible] اس کے لئے گنجائش نکالتے ہیں، ذاتوں کی تقسیم کا ایسا دستور تھا جو ہر کام اور پیشے کے برتنے والوں کو چاہے وہ برہمن کی مذہبی پیشوائی ہو یا کشتری کی سپہ گری، ٹھگ کی ٹھگی یا [illegible] کا ناچ، سب کو قاعدہ قانون کے تحت کر کے اخلاقی اعتبار سے خودمختار کر دیتا تھا، کسی پیشے کو برا مانا جا سکتا تھا مگر پیشے کا برتنے والا اس کے تمام لوازمات کو اپنا فرض اور حق قرار دیتا اور اس طرح اس کے نزدیک خود اس پر کوئی الزام نہیں آتا تھا۔ پیشے کے اصولوں کے لحاظ سے طوائف کا مخصوص چالیں چل کر کسی کی دولت کو لوٹنا اور لٹانا مناسب تھا، مگر کسی کی منکوحہ بیوی بن کر گھر بیٹھنے کا حوصلہ کرنا مناسب نہیں تھا، کیونکہ پہلی صورت میں روایات اور تصورات کی تصدیق ہوتی تھی اور دوسری صورت میں ذاتوں کے قاعدے قانون کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ راج کی قسموں میں ایک قسم راجہ کا راج تھا، ایک قسم تیوریا کا راج، اور ہر تیوریا کا حق تھا کہ وہ اپنا راج قائم کرنے کی کوشش کرے، مسلمانوں نے ذاتوں کے قانون کو اصولاً کبھی تسلیم نہیں کیا، لیکن اس کے مطابق جو نظام قائم ہو چکا تھا اسے بدل نہیں سکتے تھے اور ان کے دور حکومت میں علاوہ ان ذاتوں کے جن کا منصب لہو و لعب کو فروغ دینا تھا، غلاموں اور لونڈیوں کی بے حساب تعداد ہوا و ہوس کی خدمت کرنے کو پیدا ہو گئی۔

اخلاقی محاسبہ کرکے شاید یہ معلوم نہ کیا جا سکے کہ ہماری تاریخ کا کونسا دور بہتر تھا اور کونسا بدتر لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ تعمیر و تسخیر کا میلان کب قوی اور کامیاب تھا اور کب وہ کمزور ہوا یا غائب ہو گیا۔ یہ میلان کسی معقول قاعدے کے مطابق قوی اور کمزور نہیں ہوتا، کبھی کوئی شخصیت اسے بیدار کرتی ہے، کبھی ترقی کا موقع، کبھی کوئی بڑا خطرہ۔ یہ نظریہ منطق کے لحاظ سے لازمی اور تعلیم کے لئے مفید ہے کہ جب کسی قوم کے اخلاق اچھے ہوتے ہیں تو وہ ترقی کرتی ہے اور برے ہوتے ہیں تو اسے زوال اور ناکامی کی بھیانک شکل دیکھنی پڑتی ہے، مگر تاریخ میں اس کے مستند اور قطعی ثبوت نہیں ملتے۔ جن ترکوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا ان کے اخلاق راجپوتوں سے بہتر نہیں تھے، بلکہ بعض اعتبار سے راجپوت ہی بہتر ثابت ہوں گے۔ ترکوں کو کامیابی اس وجہ [illegible] ان میں ایک خاص قسم کی ہمت تھی اور فنِ جنگ میں وہ زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ ہمت ان میں فوقیت کے نسلی اور مذہبی احساس نے پیدا کی تھی جو عمل کے نیک بندوں میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ فنِ جنگ بھی انھیں مذہب اور اخلاق نے نہیں سکھایا، بلکہ خانہ بدوشی کے نظامِ حیات نے۔ یہی باتیں کم و بیش مغلوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں اور ان کی طرف سے یہ دعویٰ بالکل کیا ہی نہیں جا سکتا کہ ان کے حوصلوں کو بڑھانے اور ان کے مخالفوں کی ہمت پست کرنے میں مذہب اور اخلاق کو دخل تھا۔ مغل سلطنت کے زوال کا ایک سبب یہ تھا کہ شریعت اور سیاسی رواج دونوں کے لحاظ سے تاج و تخت کی وراثت کا کوئی مسلّم قانون نہیں تھا۔ دوسرا سبب اورنگ زیب کی پالیسی تھی جسے ملک گیری کی ہوس کہا جا سکتا ہے یا حالات کا غلط اندازہ یا ایک سیاسی الجھاؤ جس سے مسلسل جنگ کے سوا رہائی کی کوئی صورت نہیں تھی اور جس نے اس کے امراء کو عاجز اور خزانہ کو خالی کر دیا۔ اورنگ زیب نے اپنے کسی لڑکے کو حکومت کے فرائض انجام دینے کے لئے تیار نہیں کیا اور اس کی وفات پر ملک میں انتشار پیدا کرنے والی جو طاقتیں تھیں ان کا کوئی تجربہ کار اور صاحبِ تدبیر حاکم ہی مقابلہ کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں یہ کہنا تو بے شک صحیح ہو سکتا ہے کہ زوال اور پستی اخلاق کو بگاڑ دیتی ہے مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مغلیہ سلطنت کو زوال اخلاقی بگاڑ کی وجہ سے ہوا۔

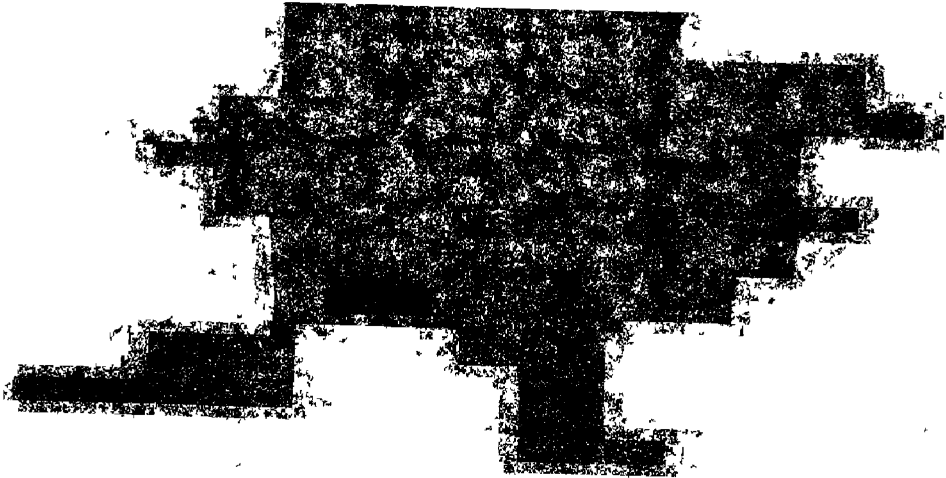
نہ بل کا مصنف زندگی کو اخلاق کا پابند رکھنے کی ضرورت کو مانتا ہو گا۔ گر ۱۸۳۹ء کی دلّی کو اخلاق کی عینک لگا کر دیکھا جاتا

تو ہزار نظر جان جاناں چند اور شخصیتوں نے جو روشنی پھیلائی تھی اس کے سوا ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ۔

پھر بھی اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے کہ اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے اخلاقی اور معاشرتی زوال کے اسباب کیا تھے۔ سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے، مگر اس کا تعلق اخلاقیات اور مذہب سے نہ ہوگا۔ اس وقت کی حکومت، خواہ وہ کسی مسلمان بادشاہ کی ہوتی یا ہندو راجہ کی، دراصل ایک حاکم طبقے کا راج تھا، اور راج کے معنی یہ تھے کہ محنت دوسرے کرتے اور محنت کے حاصل کو حاکم طبقہ سیاسی، انتظامی اور قومی ضرورتوں کی بنا پر مختلف ٹیکسوں کے نام سے یا محض زبردستی اپنے قبضے میں کر لیتا تھا۔ کسان زمین کی کاشت کرتا، اور غلہ یا اس کی قیمت شاہی عمال، جاگیردار، زمیندار اور ان کے متعلقین اس طرح اور اس مقدار میں وصول کر لیتے کہ کسان بس اس قابل رہتا کہ غلہ پیدا کرنے کے سلسلے کو جاری رکھ سکے۔ صنعت پیشہ لوگوں سے خام مال حاصل کرنے اور اس سے چیزیں بنا کر خریدار کے ہاتھ بیچنے تک کئی منزلوں پر مختلف قسم کے ٹیکس وصول کئے جاتے، بادشاہوں اور امرا کی کبھی کبھی یہ کوشش ہوتی کہ بہترین ماہروں کو بالکل اپنے قابو میں کر لیں، اس طرح کہ وہ مال تیار کرنے پر مجبور رہیں اور انھیں اپنا بنایا ہوا مال بیچنے کی آزادی نہ ہو۔ اس نظام معیشت کو "جاگیری" کہا گیا ہے، اور اسے یورپ کے فیوڈل نظام کا مماثل مانا گیا ہے، لیکن ان دونوں میں بنیادی فرق تھا۔ فیوڈل نظام کا انحصار اس اصول پر تھا کہ ہر شخص کی حیثیت، اس کے حقوق اور اختیارات ایک معاہدے کے مطابق مقرر ہوتے ہیں، اور یہی حقوق اور اختیارات کا مجموعہ اسے ایک وجود، ایک شخصیت بنا دیتا تھا۔ یورپ میں بادشاہوں، امرا اور کلیسا نے ہر طرح کی زیادتیاں کیں، فیوڈل نظام ان کی اغراض کی کشمکش کی وجہ سے قائم نہ رہ سکا، پھر بھی حقوق کا ایک تصور باقی رہا، جو ہمارے زمانے کی جمہوریت اور شخصی آزادی کی بنیاد ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے اور خاص طور سے راجپوت ریاستوں میں دستور اور رواج کو سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بہت دخل تھا، لیکن رواج نے کبھی قانون کی شکل اختیار نہیں کی، اور اس کے مطابق حقوق افراد کے نہیں تھے بلکہ قبیلوں، ذاتوں یا خاندانوں کے۔ مسلمانوں کے زمانے میں سیاسی اقتدار ایک ننگی تلوار کی طرح ان تمام تعلقات کو کاٹتا رہا

جو اس کے مفاد یا مصلحت کے خلاف تھے۔ اور صرف رعایا نہیں بلکہ امرا بھی اپنے کسی روایتی حق کو فرمان بردار کی شرط نہیں بنا سکتے تھے۔ اس کی وجہ سے بادشاہوں کا اختیار تقریباً غیر محدود اور حکومت کے انتظام کو سیاسی مصلحت کے مطابق شکل دی جا سکتی تھی۔ لیکن اس کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ بادشاہ اور امرا صرف سیاسی نہیں بلکہ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے مختار بن گئے، اور دوسری طرف سے مہاجنوں اور بڑے تاجروں کے سوا ہر قسم کے لوگوں نے اپنی پرورش کی ذمہ داری اصولاً اور عملاً بادشاہ اور امرا پر ڈال دی۔ جب تک حاکموں کو اپنے فرائض کا احساس تھا اور ان میں اتنی قوت اور صلاحیت تھی کہ اپنے فرائض کو انجام دے سکیں، ان کے اخلاقی عیب زوال کا سبب نہیں بنے، جب قوت اور صلاحیتوں میں بہت کمی ہو گئی تو یہی عیب انھیں لے ڈوبے، طبی نقطۂ نظر سے جوانی اور بڑھاپے کے نزلہ زکام میں کوئی فرق نہیں ہوتا، لیکن جس مرض کو جوان نظر انداز کرتا ہے وہ بوڑھے کو بستر پر لٹا دیتا ہے حاکموں کو زوال ہوا تو وہ لوگ جو ان کے متعلقین میں شمار ہوتے تھے مرض کے جراثیم بن گئے اور اسے بڑھاتے رہے۔

"مرقع دہلی" شاید ہمیں ایسے ہی ایک عمر رسیدہ اور جراثیم زدہ معاشرہ کا نقشہ دکھاتا ہے۔



غزل

حضرت روش صدیقی

کیا ستم کر گئی اے دوست، تری چشمِ کرم
جیسے تیرے نہیں، دنیا کے گنہگار ہیں ہم
[illegible] عالم [illegible] گذر جاتا
[illegible] آغوش [illegible] غم
[illegible] وں کی گھنی چھاؤں، بہت دور سہی
جادہ پیما [illegible] کی کڑی دھوپ ہیں ہم
نکہتِ گل [illegible] قات ہوئی
یاد آیا تری [illegible] کا عالم
ہم ہیں، طوفانِ ملامت ہے، گلی ہے تیری
[illegible] تقدیر سے ہوتے ہیں یہ حالات بہم
[illegible] عشق [illegible] دیدہ تک
مدتوں ذوقِ پرستش نے تراشے تھے صنم
ہم نے ہر عقدۂ دشوار کا منہ چوم لیا
کتنے دل کش ہیں تری زلفِ گرہ گیر کے خم
کوئے قاتل ہی سہی منزلِ راحت نہ سہی
تھک کے بیٹھے ہیں کہ آتے ہیں بہت دور سے ہم
کوئے جاناں میں کہیں آج تو ہم بھی تھے روشؔ
شکر ہے ہم کو نہ پہچان سکے دیر و حرم

ڈاکٹر غلام یزدانی

جناب سید غلام ربانی

ڈاکٹر غلام یزدانی ملک کے ان گنے چنے بزرگوں میں سے تھے جن کو زندگی میں لافانی شہرت حاصل ہو جاتی ہے۔ علم و فضل کی دنیا میں وہ جس مقام پر پہنچ گئے تھے، اس پر اخیر تک جمے رہے، کوئی ان کو وہاں سے نہ ہٹا سکا۔ اب آئندہ کے مورخ اور تنقید نگار اس بات کا فیصلہ کریں گے علم الآثار کی دنیا میں وہ جس بلندی پر پہنچ گئے تھے، وہاں کوئی ہندوستانی پہنچا ہے یا نہیں؟

میں نے پہلی بار مرحوم کو دلی کے قدسیہ باغ میں کرکٹ کھیلتے دیکھا تھا، وہ فٹ بال بھی کھیلتے تھے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے، اس وقت آپ سینٹ سٹیفنز کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ کرکٹ کا شوق آپ کو شروع سے تھا اور کالج کی ٹیم کے اسپن بولر تھے۔ ان دنوں کالج کے فاسٹ بولر فرحت اللہ بیگ مرحوم تھے جو ململ کا کرتا اور ایک بڑا ڈھیلا پاجامہ پہنے، ننگے سر اور ننگے پاؤں بولنگ کرتے تھے۔ سی۔ ایف۔ اینڈروس اور آپ اسپن بولر تھے۔ جینڈگز کا اسٹارٹ لیتے تھے۔ عینک اس وقت بھی لگی رہتی تھی اس زمانہ میں کرکٹ کے آداب کا کچھ زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ آپ کھیل کے میدان میں باریک ململ کا کرتہ پہنے رہتے تھے، اب اسے قدامت پسندی کہیے یا وضع داری، کرتے کو آپ نے اخیر تک نہیں چھوڑا۔ قمیص صرف سوٹ پر پہنتے تھے ورنہ شیروانی کے نیچے ہمیشہ کرتا ہی ہوا کرتا تھا۔ کرتا پرانی وضع کا کلی دار ہوتا تھا، جسم اکہرا تھا جو آخر تک اس حالت میں قائم رہا۔ روزمرہ کے معمول میں بڑی باقاعدگی تھی، آپ کی صحت بہت اچھی تھی، بیمار بہت کم ہوتے تھے۔

آپ دلی کے ایک معزز اور قدیم خاندان سے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے سینٹ سٹیفنز کالج سے بی اے پاس کیا اور انگریزی اور عربی میں یونیورسٹی میں اوّل آئے، کئی طلائی تمغے حاصل کیے۔

ایم اے کلکتہ یونیورسٹی سے کیا۔ شروع میں آپ مشن کالج دہلی میں فارسی کے پروفیسر ہوئے، اس کے بعد گورنمنٹ کالج راج شاہی میں عربی کے پروفیسر ہو گئے۔ اس زمانے میں حکومت پنجاب کو ایسے اساتذہ کی ضرورت ہوئی جو علوم شرقیہ کے ساتھ انگریزی میں بھی کامل مہارت رکھتے ہوں۔ چنانچہ بنگال سے آپ کو پنجاب بلا لیا گیا۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہو گئے۔

لاہور ہمیشہ سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی ایک علمی سوسائٹی کے سامنے آپ نے "جہاں آرا" پر مضمون پڑھا۔ انگریزی میں یہ آپ کا پہلا مقالہ تھا[1] جو بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھا گیا تھا، اس سے انگریز صاحبان بہت متاثر ہوئے، چنانچہ سر ایڈورڈ میکلیگن (گورنر پنجاب) اور سر جان ٹومسن کی معیت میں آپ نے پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی یہ ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے۔ انہی دنوں حیدرآباد میں محکمۂ آثار قدیمہ کا قیام عمل میں آیا اور سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل آف آرکیولوجی، کے مشورے سے آپ یہاں کے ناظم مقرر ہوئے۔

ریاست حیدرآباد آثار قدیمہ سے مالامال تھی بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم یادگاروں کی کثرت نوعیت اور عظمت کے لحاظ سے یہ ریاست دنیا کے کسی خطہ سے کم نہ تھی۔ یہاں حجری عہد سے لے کر انسانی تہذیب کے ہر دور کی یادگاریں موجود ہیں، جن کی تلاش اور تحقیق، پیمائش اور مطالعہ میں آپ کو سخت محنت اور مشقت اٹھانی پڑی۔ آثار قدیمہ کا مزاج کچھ ویرانی پسند ہے ان کا ٹھکانا لق و دق میدان، ویران جنگل اور پہاڑ ہوتے ہیں چنانچہ دشوار گزار راستوں میں اکثر جگہ میلوں پیدل چلنا پڑتا تھا۔ ان سنسان مقامات میں پھرنا اور بھوک پیاس کی تکلیف اٹھانا آپ کی عادت ہو گئی تھی۔

اس موقع پر ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا جس کو آپ نے ہنس ہنس کر سنایا تھا میں اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک دن باتوں میں غار ہائے پیتل کھورا[2]

---

[1] یہ مقالہ "جہاں آرا" کے نام سے کتاب کی صورت میں چھپ چکا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ جناب ضیاء الدین برنی نے کیا ہے جو اردو اکادمی سندھ، کراچی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ [2] پیتل کھورا کے غار اورنگ آباد

(باقی نوٹ اگلے صفحے پر)

کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے جب میں پہلی بار ان غاروں کو دیکھنے گیا تو اورنگ آباد سے مولوی صاحب (بابائے اردو) بھی ساتھ تھے ہوئے۔ کنٹر (ضلع اورنگ آباد) تک تو پختہ سڑک تھی، اس کے بعد پہاڑی راستہ شروع ہوا۔ کئی گھنٹے پیدل چلنے کے بعد ہم دونوں غاروں میں پہنچے۔ یہ پُرفضا مقام مولوی صاحب کو بہت پسند آیا، کہنے لگے تھکان کا بدلہ تو مل گیا مگر بھائی صاحب مجھے بھوک لگ رہی ہے" میرے پاس کچھ سنترے تھے، وہ دئے تو کہنے لگے، بھلا ان سنتروں سے پیٹ بھرتا ہے، وہ بھوک سے کچے تھے، بے چین ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے ایک جگہ ان کو کپڑے میں کچھ بندھا ہوا دکھائی دیا۔ انھوں نے اسے اٹھا لیا اور کھول کر دیکھا تو اس میں دو تین جوار کے روٹ تھے اور ان پر چٹنی رکھی ہوئی تھی مولوی صاحب بے تکلف اس طرح کھانے لگے جیسے کوئی خیر پال کھا رہا ہو۔ یہ روٹیاں ایک بھیل کی تھیں جو ان غاروں کا چوکیدار تھا۔

چند سال کی محنت کے بعد آپ [illegible] پر قابو پایا اور یہاں کے آثار کی وہ صورت نکلی کہ دنیا بھر کے اہل علم اور صاحبان فن ان کے دیکھنے کی تمنا کرنے لگے۔

ان دنوں حیدر آباد میں یہ دستور تھا کہ یہاں کے مختلف محکموں کے عہدہ دار ٹریننگ کے لئے برطانوی ہند بھیجے جاتے تھے لیکن یہاں کے سررشتہ آثار قدیمہ کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ خود برطانوی ہند کے عہدہ دار ٹریننگ کے لئے یہاں بھیجے جاتے تھے۔ یہی حال آثار کے تحفظ اور نگہداشت کا تھا۔ بیرونی سیاح ان کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے تھے، چنانچہ جسٹس EDGLAY (ایجلے)[1] لکھتے ہیں:

(بقیہ صفحہ سابق) کی شمالی سرحد پر اجنتا کی طرح یہاں بھی تصویریں ہیں۔ جن میں بابلی اور اشوری اثر جھلکتا ہے۔

[1] ایجلے (EDGLAY) کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ آثار قدیمہ سے ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ سر پرسی براؤن نے اپنی مشہور کتاب INDIAN ARCHETECTURE کی تالیف میں ان کی مدد کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

"...... ریاست حیدرآباد کا سب سے چھوٹا محکمہ غالباً "آثار قدیمہ" ہے لیکن مجھے یہ سررشتہ یہاں کے سب محکموں سے بڑا نظر آیا۔ آثار کا تحفظ اور نگہداشت یہاں جس سلیقہ سے ہوتی ہے برطانوی ہند میں نہیں ہوتی۔ کیا اچھا ہو کہ حکومت ہند اپنے تمام آثار کو نظام گورنمنٹ کی نگرانی میں دے دے کیونکہ یہاں کا محکمہ قدیم یادگاروں کو اچھی حالت میں رکھنا چاہتا ہے ......"

ڈاکٹر غلام یزدانی خاموش کام کرنے والوں میں تھے۔ مزاج میں سادگی تھی، نمود و نمائش سے بچتے تھے۔ محنت بہت کرتے تھے، جس کام کو اٹھاتے اس کو بڑی مستعدی اور سرگرمی سے پورا کرتے تھے۔ فرض شناسی ان کا ایمان تھی، ایک نمازی کی طرح اپنے فرض کو قضا نہیں ہونے دیتے تھے۔ دل میں قومی درد اس درجہ تھا کہ جب کبھی اسلاف کے کارناموں کا ذکر آجاتا تو بے اختیار آبدیدہ ہوجاتے تھے۔ حکومت ہند نے ان کی بڑی قدر کی اور [illegible] کا خطاب دیا۔ جامعہ عثمانیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی نے اعزازی ڈگریاں دیں۔ آخر میں بھارت سرکار نے پدم بھوشن کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

دنیا کی ہر قوم کو اپنی گزشتہ تہذیب پر ناز ہوتا ہے اور وہ اپنے اسلاف کے کارنامے معلوم کرنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی سے علم الآثار میں بہت ترقی ہوئی ہے چنانچہ "ہند قدیم" کی تاریخ زیادہ تر اسی علم کے ماہروں کی کوششوں سے مدون ہوئی ہے۔ قومی تمدن میں انسانی زندگی کے بہت سے پہلو شامل ہیں۔ اس لئے علم الآثار کے شعبے بھی بہت ہیں۔ ڈاکٹر یزدانی نے قریب قریب تمام شعبوں میں کام کیا، لیکچر دیئے اور ان پر کتابیں لکھیں جن کا مختصر حال بیان کیا جاتا ہے۔

مانڈو

سرسبز پہاڑوں اور خوبصورت جھیلوں سے گھرا ہوا مانڈو شاہان مالوہ کا پایہ تخت تھا، یہ شہر بندھیاچل کی گود میں پلا تھا جس نے اپنی ساری رعنائیاں یہاں لا کر رکھ دی تھیں۔ مہاراجہ دھار کی خواہش تھی کہ مانڈو پر ایک کتاب لکھوائی جائے۔ سر جان مارشل نے لکھنے کا وعدہ کیا تھا مگر کسی وجہ سے وہ نہ لکھ سکے۔ اس زمانہ میں سر ریجنالڈ گلانسی جو حیدرآباد میں وزیر مالیات

رہ چکے تھے۔ اندور میں ایجنٹ گورنر جنرل ہوکر آئے وہ آپ کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ انھوں نے مہاراجہ دھار کے ایما سے نظام گورنمنٹ کو لکھا کہ وہ یزدانی صاحب سے مانڈو پر کتاب لکھوانی چاہتے ہیں چنانچہ حکومت حیدرآباد کی اجازت سے آپ مانڈو گئے۔ یہاں کے آثار بہت بڑے رقبہ پر پھیلے ہوئے تھے جن میں بہت سے محل، ایوان، برج، بارہ دری، دروازے، مسجدیں، مقبرے اور دوسری عمارتیں تھیں، آپ نے ان سب کا مطالعہ کیا، تصویریں تیار کرائیں، نقشے کھنچوائے اور "مانڈو" [illegible] THE CITY OF JOY کے نام سے کتاب لکھی۔ ہر چند یہ ایک فنی کتاب ہے مگر آپ کا بیان اس قدر دلچسپ اور انداز اتنا دلفریب ہے کہ پڑھنے والے کی نظروں میں اس اجڑی نگری کی گزشتہ [illegible] ساتھ ان کے تاریخی پس منظر بھی بیان کئے ہیں، چنانچہ آخری تاجداروں کے ذکر میں 'باز بہادر' اور 'روپامتی' کے عشق کی داستان ہے۔ یہ وہی حزینہ ہے جس کے درد بھرے گیت آج بھی مالوے میں سنائی دیتے ہیں۔ انگریزی زبان میں آپ کی پہلی کتاب تھی جو اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔

مانڈو کی تصنیف سے آپ کے جوہر پہلے [illegible] شہرت کو دیکھ کر حیدرآباد کی حکومت کو خیال ہوا کہ آپ سے اجنتا پر کتاب لکھوائی جائے، اس طرح حکومت کی خواہش سے آپ اس یادگاری کتاب کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔

اجنتا کی تصویریں جو دو ہزار برس سے زمانہ کا مقابلہ کر رہی تھیں، تھک کر چور ہو گئی تھیں اور خستگی کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ لگانے سے ریزہ ریزہ ہوئی جاتی تھیں۔ حیدرآباد میں سررشتہ آثار قدیمہ کے قیام سے پہلے ان کے تحفظ کا انتظام صوبہ بمبئی سے متعلق تھا۔ اس زمانہ میں نگرانی کا یہ حال تھا کہ لوگ ان تصویروں کی پپڑیاں کھرچ کھرچ کرلے جاتے تھے۔ ایک انگریز تصویر کا ایک ٹکڑا لندن لے گیا تھا وہاں وہ ایک ہزار پونڈ میں فروخت ہوا۔ تصویر کا یہ ٹکڑا اس وقت بوسٹن (امریکہ) کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔

اجنتا کی تصویروں کے تحفظ کی داستان بہت طویل ہے ان کی درستی میں بڑی احتیاط

برتی گئی ہے۔ اس کام پر جس فراخ دلی سے خرچ ہوا ہے، اس کا اندازہ ان دو اطالوی کی تنخواہوں سے لگایا جا سکتا ہے جو تصویروں کی درستی اور صفائی کے لئے بلائے گئے تھے۔ ان کی تنخواہ چھ ہزار ماہانہ تھی۔ خورد نوش، سواری، ریل، اور جہاز کے کرایہ کے اخراجات سب حکومت کے ذمہ تھے، ان کی جسمانی آسائش کے علاوہ روحانی میلان کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ اس کے لئے اطالوی مشن کے ایک پادری کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ اجنٹہ میں انھوں نے دو موسم سرما گزارے۔ تصویروں کے تحفظ کے لئے انھوں نے ایک کیمیاوی عمل تجویز کیا جو بہت کامیاب ثابت ہوا، اس سے تصویروں کی عمر میں اضافہ ہو رہا ہے۔

کئی سال کی محنت کے بعد کتاب اجنٹہ کی پہلی جلد شائع ہوئی جس نے علم وفن کی دنیا میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ ہندوستان اور مغربی ملکوں کے علمی اور فنی رسالوں میں اس پر جو تبصرے ہوئے ہیں ان میں سے ایک دو کو بیان کرنا بے موقع نہ ہوگا۔

برلنگٹن میگزین لندن نے مئی ۱۹۳۱ء کی [illegible] کی بہت تعریف کی اس کے اقتباس کا کچھ حصہ پیش ہے:

"...... اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی ان مشہور تصاویر کا بیان اگرچہ پہلے شائع ہو گیا ہے اور حال میں مسٹر گریفتھ (GREFITH) اور لیڈی ہیرنگھم کی کتابوں میں نقول بھی نہایت خوبی سے چھاپی گئی ہیں لیکن ان سب کی بنیاد دستی نقول پر ہے، کوئی انسان خواہ وہ کتنا ہی ماہر ہو صحت کے لحاظ سے فوٹو کا مقابلہ نہیں کر سکتا موجودہ کتاب کی شاندار تصاویر کا جب پہلی تالیفات کی تصاویر سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو لیڈی ہیرنگھم کے اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اصلی تصاویر کے فنی محاسن ایسے محکم اور مکمل ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی ان کو خاطر خواہ نقل نہ کر سکا۔ ہز اگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام کی شاہانہ فیاضی اور شوق کا شکر کرنا چاہیئے کہ ایشیا کے ان عجوبہ روزگار تصاویر کی نقول کی تیاری میں موجودہ زمانہ کے علم وکمال سے پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے اور اب صحیح اور مکمل شائع ہو گئیں۔۔۔۔"

رسالہ انڈین انٹی کیوری (INDIAN ANTIQUARY)، اگست ۱۹۳۱ء کی اشاعت

میں اس کتاب کی بڑی لمبی چوڑی تعریف کی گئی ہے۔ اور آخر میں ان لفظوں پر ختم کیا ہے :

"...... ویئیلئے فن اعلیٰ حضرت کی فیاضی اور سرپرستی امداد کے قابل وزیر مالیات سر اکبر حیدری کی تدبیر کی رہین منت ہے کہ یہ عظیم الشان کارنامہ اس خوش اسلوبی سے شائع ہوگیا ہے ......"

لندن ٹائمز اور نیویارک ٹائمز نے بھی اس کتاب پر تبصرے کئے تھے، فرانس کی ایشیاٹک سوسائٹی نے بھی اس کو بہت سراہا ہے۔

کتاب اجنٹہ چار جلدوں پر مشتمل ہے جن کی تیاری میں کوئی دو لاکھ کی لاگت آئی۔ سررشتہ نے یہ رقم حکومت سے قرض لی تھی۔ چنانچہ اس کی فروخت سے قرضہ تقریباً بے باق ہوگیا ہے اور بہت بڑی مالیت کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس مقام پر یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس کتاب کے خریدار ہندوستان میں سو بھی نہیں نکل سکے۔ کتاب کا قرض مغربی ملکوں کے قدردانوں کے شوق سے ادا ہوا ہے۔ کتاب لکھنے سے پہلے اس کے مصنف کا یہ اندازہ لگانا، کہ اس کی تصنیف کس پایہ کی ہوگی، آسان نہیں ہے مگر آپ کو اپنے اوپر اعتماد تھا اور اس یقین کے ساتھ لکھنا شروع کیا کہ اس کتاب کی عالم گیر شہرت ہوگی۔[1]

[redacted]

بیدر

دکن کے تاریخی شہروں میں بیدر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہاں کی عمارتیں اسلامی فن تعمیر کی تاریخ میں ایک مقام رکھتی ہیں جن سے بہمنی فرمانرواؤں کی سطوت اور جلال ٹپکتا ہے مدرسہ محمود گاواں ہندوستان میں اپنی وضع کی ایک ہی عمارت ہے۔ بہمنی دور میں ایران کے اہل علم اور طلبان اس کثرت سے جمع ہوگئے تھے کہ یہاں کی تہذیب میں ایرانی اثر سرایت کر گیا۔ چنانچہ اس عہد میں جو عمارتیں تیار ہوئیں، ان میں ایرانی طرز تعمیر نمایاں تھا۔ اس زمانہ میں بیدر ایران کا ایک ٹکڑا معلوم

[redacted]

---

[1] کتاب اجنٹہ کی قیمت چھ سو (۶۰۰) روپیہ ہے۔ ڈائرکٹر آف پبلی کیشن حیدرآباد کے دفتر سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

ہوتا تھا لیکن زمانہ کسی کی عظمت یا خوبصورتی کا لحاظ نہیں کرتا، شاہی خاندانوں کے زوال اور جنگی محاصروں کے تھپیڑوں نے ان شاندار عمارتوں کو ایسا تباہ کیا کہ ملبے کے ڈھیر اور ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ سررشتہ نے قلعہ کی صفائی کرادی اور زمین میں دبے ہوئے آثار کو برآمد کرکے ان کا تحفظ کیا۔ کئی سال کی محنت اور کاوش کے بعد آپ نے بیدر کے آثار پر کتاب لکھی جس میں ڈیڑھ سو سے زیادہ نقشے اور تصویریں ہیں۔ یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی اور کتاب اجنٹہ کی طرح اس کو بھی عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ اعلیٰ حضرت نے اس کو اپنی خاص سرپرستی میں شائع کرانے کی اجازت عطا فرمائی۔ چنانچہ کتاب کی جلد پر شاہی نشان (CREST) بطور امتیاز ثبت ہے[1]۔ آپ کا ارادہ تھا کہ کتاب بیدر کی طرح گلبرگہ اور حیدرآباد پر بھی کتابیں لکھیں مگر اے بسا آرزو کہ خاک [illegible]

اپی گریفیا انڈو مسلمکا

حکومت ہند کی جانب سے اپی گریفیا انڈو مسلمکا کے نام سے جو جرنل نکلتا تھا اس میں ہندوستان کے اسلامی کتبات چھپتے تھے۔ ڈاکٹر غلام یزدانی نے ۲۴ برس اس [illegible]رت کے فرائض انجام دئے۔ قدیم کتبوں کا پڑھنا بڑی دیدہ ریزی اور پتہ ماری کا کام ہے اور مسخ شدہ کتبوں کی تعبیر کے لئے بڑی ذہانت کی ضرورت ہے۔ اس جرنل میں ایک آدھ مضمون کسی دوسرے کا ہوتا تھا ورنہ باقی تمام رسالہ آپ ہی کے قلم کی پیداوار ہوتا تھا۔ تاریخ کی تدوین میں کتبوں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ آپ نے بعض ایسے کتبے شائع کئے ہیں جن سے بعض بڑی غلطیاں دور ہوگئی ہیں مثلاً گولکنڈہ کی جامع مسجد کے دروازہ پر ایک کتبہ ہے جس سے ظاہر ہوا کہ فرشتہ نے قطب شاہی خاندان کے بانی کی تخت نشینی کا سن صحیح نہیں لکھا ہے ــــ اسی طرح محمد تغلق دکن کی مہم کے دوران میں جہاں جہاں گیا اس کا ذکر متداول تاریخوں میں نہیں ہے۔ آپ نے کتبوں کے ذریعہ ان مقامات کا پتہ لگایا۔ سکوں کے مطالعہ سے آپ نے دکن میں بہت سی نئی

---

[1] کتاب بیدر کی قیمت اسی روپے (۸۰) ہے۔ ڈائرکٹر آف پبلی کیشن حیدرآباد کے دفتر سے مل سکتی ہے۔

دارالعزیز کا بھی پتہ لگایا۔ ان سب باتوں کا حال سررشتہ کی رپورٹوں میں موجود ہے۔ قدیم کتبے تاریخی واقعات کے علاوہ اپنے زمانہ کے ادبی ذوق کا آئینہ ہوتے ہیں۔ کتبہ نگار پہلے ہی سے سمجھ لیتا تھا کہ وہ ایک یادگاری چیز لکھ رہا ہے۔ کوئی چھ سال ہوئے راقم نے "کتبات اور شاعری" کے عنوان سے ایک مقالہ اردو مجلس کے ایک اجلاس میں پڑھا تھا، اس میں کتبوں کی اعلیٰ شاعری کے کچھ نمونے پیش کئے تھے[1]۔ یزدانی صاحب کی سبکدوشی کے بعد یہ جرنل علیحدہ چھپنا بند ہوگیا اور اب اسلامی کتبات ایپی گرافیا انڈیکا کے ضمیمے کے طور پر چھپتے ہیں۔

ڈاکٹر یزدانی اپنے سررشتہ کی جو سالانہ رپورٹ شائع کرتے تھے، اس کی شان بھی نرالی ہوتی تھی۔ یہ درست ہے محکموں کی رپورٹوں کی طرح سال بھر کی کارگزاری، نظم ونسق اعداد وشمار یا جمع وخرچ کا گوشوارہ نہیں ہوتی تھی، بلکہ علم الآثار کے مختلف شعبوں پر تحقیقی رسالے ہوتے تھے جن میں طالب علموں کے لئے مفید مواد موجود ہوتا تھا۔ یورپ کے نامور مصنفین اپنی کتابوں میں ان رپورٹوں کے حوالے درج کرتے تھے۔ سررشتہ کی طرف سے مسکی، پٹن کونڈاپور، حیدرآباد، رائے گیر وغیرہ مختلف مقامات پر جو کھدائیاں ہوئیں، ان میں قدیم سکے، ہانڈیاں، مٹکے، گولیں، مٹی کی مورتیں، کھلونے، منکے، مہریں، ہاتھی دانت اور سنکھ کے زیورات، عمارتوں کے آثار، پختہ اینٹیں، صخری آلات وغیرہ بہت سی چیزیں برآمد ہوئیں۔ یہ اثری باقیات زبان حال سے اپنی بیتی سناتے ہیں جس کو سمجھنے والے سمجھتے ہیں، ڈاکٹر یزدانی ان کی زبان سے واقف تھے۔ چنانچہ رپورٹوں میں ان سب چیزوں کا حال درج ہے۔

یورپ اور امریکہ میں ان رپورٹوں کی بڑی قدر تھی کرن انسٹی ٹیوٹ لیڈن (ہالینڈ) سے ایک ضخیم ششماہی جرنل (BIBLIOGRAPHY OF INDIAN ARCH-AEOLOGY) کے نام سے شائع ہوتا ہے، اس میں ہندوستان کی علمی کتابوں پر تبصرہ ہوتا ہے۔ آپ کی رپورٹ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس جرنل میں سب سے

---

[1] یہ مضمون رسالہ اردو کراچی اور صبا، حیدرآباد میں چھپ چکا ہے۔

پہلے حیدرآباد کے سررشتہ آثار قدیمہ کی رپورٹ کا حال درج ہوتا تھا۔

اسلامی فنِ تعمیر کے مطالعہ کے لئے آپ نے ایران، عراق، شام، لبنان، فلسطین، حجاز، مصر، ٹیونس، الجیریا، مراکش اور اسپین کا سفر کیا اور وہاں کی قدیم عمارتوں اور یادگاروں کو دیکھا، کئی بار انگلستان کا بھی سفر کیا، جب آپ لندن پہنچے تو وہاں کے علمی ادا[illegible] آپ کے لکچر ہوتے تھے چنانچہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے آپ نے [illegible] BUDHIS[illegible] PAINTINGS بودھی عہد کی نقاشی پر جو لکچر دیا وہ رنگین تصویروں کے ساتھ کتاب کی صورت میں شائع ہوگیا ہے، اس میں بودھی عہد کی نقاشی کی خصوصیات اور محاسن بیان کئے گئے [illegible]
انڈیا سوسائٹی کے سامنے [illegible] PLES OF AUR[illegible] یعنی عبادت گاہ ہائے اورنگ آباد پر جو لکچر دیا تھا وہ بھی رسالہ کی صورت میں چھپ گیا ہے، یہ غار بودھی عہد [illegible] ہیں ان میں بت تراشی کے بعض اعلیٰ قسم کے نمونے ہیں جن کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اجنٹہ کی نقاشی

اورنگ آباد کے یوم کلیہ کے موقع پر اجنٹہ کی نقاشی کے نام سے آپ کا لٹریری لکچر ہوا تھا وہ مقبول ہوا، اردو زبان میں آرٹ کے محاسن، فنی خصوصیات اور نزاکتیں بیان کرنا آپ ہی کا کام ہے۔ بیان بہت شگفتہ ہے اس میں سلاست اور روانی ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ فنون لطیفہ کی اصطلاحوں کے روڑوں سے پاک ہے۔ یہ لکچر کچھ اضافہ کے ساتھ کتاب کی صورت میں چھپ گیا ہے۔ اس میں رنگین تصویریں ہیں، کتاب کا متن حیدرآباد کے مشہور خوش نویس جابر صاحب کا لکھا ہوا ہے جس کو میونخ (جرمنی) کے مش[illegible] برکمان میں پلیٹوں کے ذریعہ طبع کرایا گیا ہے۔ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور اب نایاب ہوگئی ہے۔ اس کا ترجمہ مرہٹی زبان میں ہوچکا ہے۔

ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک نظر

یہ بھی ایک فانوسی لکچر ہے جو اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی میں ہوا تھا۔ یہ بھی تصویروں کے ساتھ کتاب کی صورت میں چھپ گئی ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی ملک کے کونے کونے سے

اس کی عادی گئی۔ اس کے پہلے حصہ میں بودھ، جین اور برہمنی مذہب کی عبادت گاہوں کا بیان ہے دوسرے میں اسلامی مذہبی اور غیر مذہبی عمارتوں کا ذکر ہے۔ مسلمان جب یہاں پہنچے، اس وقت دنیا کا بہت بڑا حصہ ان کے زیر نگیں آ چکا تھا اور تمام مفتوحہ ملکوں میں مختلف وضع کی شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں لیکن ہندوستان میں اس فن کو بہت ترقی ہوئی۔ چنانچہ جتنی خوبصورت اسلامی عمارتیں ہندوستان میں ہیں، کسی دوسرے اسلامی ملک میں نہیں۔ یہ کتاب ہے تو مختصر سی مگر اس میں فن تعمیر کی عہد بہ عہد کی تبدیلیوں اور تدریجی ترقی کا حال بڑے دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے[1]۔ کتاب کے شروع میں اکادمی کے ناظم ڈاکٹر سید عابد حسین کا دیباچہ ہے جو ہے تو مختصر مگر بہت ہی پاکیزہ ہے۔

دکن کی زمانۂ ماقبل تاریخ کی یادگاریں

یہ آپ کی ایک ریڈیائی تقریر ہے جو دکن ریڈیو سے نشر ہوئی تھی۔ [illegible] تاریخی زمانہ سے ہزاروں برس پہلے کی قبروں کا حال ہے، اس قسم کی قبروں کا سلسلہ ہندوستان سے باہر ایک طرف ایران سے گزرتا ہوا مغربی یورپ میں اسپین، فرانس اور انگلستان تک چلا گیا ہے اس طرح ہندوستان کے شمالی ملکوں میں وسط ایشیا سے لے کر سلائے بیریا پہنچتا ہے، ان دور دراز ملکوں میں قبروں کی بیرونی ہیئت اور ان کے اندر کا سامان ہر جگہ ایک سا ہے۔ علم الآثار میں "قدیم قبور" ایک مستقل شعبہ ہے جس پر بہت کچھ تحقیقاتی کام ہوا ہے اور اس سے مفید نتیجے نکلے ہیں۔ شمالی ہند میں اس قسم کی کوئی قبر موجود نہیں ہے لیکن دکن میں اضلاع کریم نگر، ورنگل، نلگنڈہ، محبوب نگر، رائچور اور گلبرگہ میں مختلف مقامات پر بے شمار قبریں موجود ہیں۔ چنانچہ سررشتہ نے کوہ مولا اور حشمت پیٹھ (نواح حیدر آباد) میں دو ایک قبروں کو کھولا بھی ہے۔ یہ تقریر بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے جس کو تصویروں کے ساتھ رسالے کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

کھدائیوں میں قدیم زمانے کی جو ہانڈیاں، گھڑے یا مٹکے نکلتے ہیں، ان پر کچھ علامات ہوتی ہیں، اس قسم کی نشانیاں دنیا بھر کی قدیم قبور کے ظروف پر پائی گئی ہیں۔ ڈاکٹر یزدانی نے جو

---

[1] ہندوستان کے آثار قدیمہ: یہ رسالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی طرف سے چھپا ہے۔

نشانیاں ان برآمد کئے ہوئے برتنوں پر دریافت کی تھیں، ان کو بعض علماء نے ہندوستان کے برہمی رسم خط کا ماخذ تسلیم کرلیا ہے۔ اسی قسم کے نشانات موہن جداڑو (MOHAN JO DARO) میں بھی دریافت ہوئے ہیں لیکن آپ نے بہت پہلے ۱۹۱۷ء میں رائے گیر (ضلع ورنگل) کی قبور کے ظروف کے نشانات کا نقشہ شائع کردیا تھا اور ان کی مماثلت بعض برہمی حروف سے ثابت کردی تھی جو بحیرۂ روم کے جزائر مصر اور شمالی افریقہ میں زمانہ قدیم سے رائج تھے ڈاکٹر یزدانی کا یہ انکشاف بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

شاہ جہاں نامہ کی تہذیب

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی درخواست پر آپ نے شاہ جہاں نامہ مصنفہ محمد صالح کنبوہ کو ایڈٹ کیا، اس کی چار جلدیں ٹائپ میں چھپی ہیں۔ شروع میں آپ کا ایک مبسوط مقدمہ فارسی زبان میں ہے۔

مثنوی مولانا روم

اس مشہور مثنوی کا ایک نادر قلمی نسخہ آپ کو دستیاب ہوا۔ اس کا خط بہت پاکیزہ تھا۔ آپ کو اس قدر بھایا کہ آپ نے پوری کتاب کو پلیٹوں کے ذریعہ جرمنی میں چھپوا دیا۔ اس پر بھی اردو اور انگریزی میں آپ کا ایک دلچسپ مقدمہ ہے ـــــ فارسی سے آپ کو خاص شغف تھا پندرہ میں برس سے حیدرآباد کی مجلس مخطوطات فارسیہ کی معتمدی کے فرائض اعزازی طور پر انجام فرماتے رہے۔ اس مجلس نے فارسی کی بعض ایسی نایاب کتابیں چھاپی ہیں جن کا وجود دنیا کے کسی کتب خانہ میں نہیں تھا۔

آرکیولوجیکل سوسائٹی کا جرنل

محکمہ آثار قدیمہ کے قیام کے بعد حیدرآباد میں لوگوں کو علم الآثار سے دلچسپی ہوگئی تھی چنانچہ ایک انجمن (ARCHAEOLOGICAL SOCIETY) کے نام سے قائم ہوئی، کچھ دن بعد اس سوسائٹی کا ایک جرنل جاری ہوا، اس کے ایڈیٹر بھی آپ ہی تھے، اس جرنل میں بہت بلند پایہ مضامین ہوتے تھے، رسالہ کا معیار کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے مضمون نگار سر جان مارشل، ڈاکٹر غلام یزدانی، سر جادو ناتھ

سرکار، ڈاکٹر ہنٹ اور اسی پایہ کے حضرات تھے ۔

دکھنی آرٹ

ہندوستانی اکادمی کی مجلس انتظامیہ نے آپ سے خواہش کی تھی کہ آپ الہ آباد جا کر ادارہ میں دکھنی آرٹ پر لکچروں کا سلسلہ شروع کریں اور ان میں ملک کے فنون لطیفہ کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کریں ۔ آپ نے اس دعوت کو قبول تو کر لیا مگر بعض مجبوریوں اور مصروفیتوں کی وجہ سے الہ آباد نہ جا سکے ۔ البتہ اتنا ہوا کہ آپ نے دو لکچروں کا مسودہ وہاں بھیج دیا ۔ اکیڈمی نے اس کو غنیمت سمجھا اور بڑی خوشی سے ان دونوں مقالوں کو تصویروں کے ساتھ کتاب کی صورت میں چھاپ دیا ۔ پہلی کتاب دکھنی آرٹ کے ابتدائی مسائل سے متعلق ہے ۔ اس میں دکن میں فنون لطیفہ کی ابتدا، ان کی خصوصیات اور دوسرے ملکوں کے آرٹ سے ان کا تعلق بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے ۔ دوسرا مقالہ فن تعمیر پر ہے ۔ اس میں گھاس پھونس کی جھونپڑیوں سے لے کر لکڑی کے مکانات اور اس کے بعد اینٹ پتھر کی عمارتوں کی تدریجی ترقی کا ذکر ہے ۔ فن تعمیر کی ترقی میں مذہبی جوش کو بڑا دخل ہے ہر قوم نے اپنی عبادت گاہوں کو خوب صورت اور شاندار بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے، دکن کے دیول اور مذہبی آثار خواہ وہ بودھ مت سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ جین یا برہمنی مذہب سے، فن تعمیر کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہیں ۔ ان کی بعض خصوصیات کو سمجھنے میں مغربی نقادوں سے جو لغزشیں ہوئی ہیں ان کو بھی واضح کیا ہے ۔ آپ لکھتے ہیں :

"...... دکن کی عبادت گاہوں کا مقابلہ جب دنیا کے اور ملکوں کے معابد سے کیا جاتا ہے تو کمال فن اور حسن تخیل اور جوش عقیدت کے لحاظ سے وہ کسی طرح کمتر نظر نہیں آتے ۔ مثلاً کارلا کے چیتیا، ایلورا کے کیلاش ناتھ دہار کا مقابلہ یونان، روما، مصر، فلسطین کے شاندار سے شاندار معابد سے کیا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح انگی، اونڈھا اور ورنگل کے دیول بعض تعمیری خصوصیات کے لحاظ سے یورپ کے زمانہ کے قوطی طرز (GOTHIC STYLE) کے گرجوں پر فوقیت

رکھتے ہیں ....."

تاریخ دکن

۱۹۲۲ء میں کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کی پہلی جلد شائع ہوئی، نوعیت کے لحاظ سے یہ ایک مثالی کتاب تھی جو انگلستان کے مورخوں علماء، مستشرقین اور محققین کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی مگر اس میں بعض امور ایسے بھی تھے جن سے ہمارے علماء کو اتفاق نہیں تھا اور ان کے جذبات اور قومی وقار کو ٹھیس لگتی تھی۔ چنانچہ ملک میں خیال پیدا ہوا کہ اسی نہج پر ہندوستان کی ایک جامع تاریخ ہندوستانی نقطۂ نظر سے مدون کی جائے۔ اس سلسلہ میں بھارتیہ اتیہاس پریشد، انڈین ہسٹری کانگریس اور علی گڑھ ہسٹاریکل سوسائٹی کی تجاویز قابل ذکر ہیں۔ ملک کی بعض جامعات کو بھی خیال ہوا کہ اپنے اپنے صوبہ کی تاریخ مرتب کریں۔ اس معاملہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی نے پہل کی اور اپنے صوبے بنگال کی تاریخ شائع کی۔

حیدرآباد میں پروفیسر ہارون خاں شروانی اور علی یار خاں (نواب علی یاور جنگ) نے تاریخ دکن کی تدوین کے لئے حکومت کے سامنے تجویز پیش کی۔ اس زمانہ میں [illegible] عالم گیر جنگ زوروں پر تھی، تجویز جھمیلے میں پڑ گئی مگر کچھ دن اور ڈاکٹر یزدانی نے سر اکبر حیدری صدر باب حکومت کی خدمت میں ایک نوٹ پیش کیا جس میں بیان کیا کہ ہندوستان کی مذہبی، معاشی سماجی اور ثقافتی زندگی میں دکن کا بڑا حصہ ہے۔ اور یہ بھی بتایا کہ دکن کی تاریخ کے لئے یہاں ہر قسم کا مواد کتبوں، اثری یادگاروں، تاریخوں، قدیم فرامین اور دستاویزوں کی شکل میں موجود ہے۔ سر اکبر نے علی شروانی تجویز کی اہمیت کو تسلیم کیا اور آخر کار حسب فرمان ضروری تاریخ دکن کی تیاری کی منظوری صادر ہوئی کونسل نے ڈاکٹر یزدانی کو پہلی جلد کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ قرون وسطیٰ اور برطانوی عہد کی متعلقہ جلدوں کے ایڈیٹر پروفیسر ہارون خاں شروانی، اور نواب علی یاور جنگ مقرر کئے گئے۔

سالہا سال کی کوششوں کے بعد (HISTORY OF THE DECCAN (تاریخ دکن)، کی پہلی جلد ڈاکٹر یزدانی کی ادارت میں شائع ہوئی اس کا آٹھواں باب جو فنون لطیفہ پر ہے، آپ ہی کا لکھا ہوا ہے، اس میں فن تعمیر، مجسمہ تراشی اور نقاشی کا بیان ہے۔ اور دکن کی مورتیں

اور نقاشی میں فن نقش کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کا بھی دلچسپ بیان ہے۔

ابھی تاریخ دکن تیار نہیں ہوئی تھی کہ آپ کا یہ باب برسوں پہلے (FINE ARTS) کے نام سے علیحدہ کتاب کی صورت میں چھپ گیا۔ اس میں فنون کی ابتدا ان کی ترقی اور تنزل کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

وطن پرستی کا جذبہ آپ میں اس درجہ تھا کہ ہندوستانی تہذیب کے خلاف کسی کا ایک حرف برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ انگریزی راج میں یورپ کے مصنفین کے قول حرف آخر کا حکم رکھتے تھے کسی کو ان کی تردید کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یہاں کے فن مجسمہ سازی اور نقاشی کے بارے میں یورپ کے ماہر طرح طرح کے خیالات ظاہر کرتے تھے۔ کوئی ان میں یونانی اثر تلاش کرتا تھا کسی کو ان میں اطالوی نقاشی کا روپ نظر آتا تھا۔ آپ نے اس قسم کے خیالات کو ملک کی توہین سمجھا۔ ان کی تردید کی اور بتایا کہ دو ہزار برس پہلے اٹلی میں فن نقاشی اجنتہ کی نقاشی کے مقابلہ میں ہیچ تھی۔ بودھی ستوا پدما پانی کے بارہ میں کہا ہے کہ پندرھویں صدی تک اس تصویر کا جواب دنیا کے پردہ پر کہیں نہیں تھا۔ تاج محل کے نقشہ کو فادر فیریک نے ونیس کے ایک مہندس کی دماغی پیداوار لکھدیا۔ اس پر آپ نے لکھا ہے کہ "خود روضہ کی ساخت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ میں اس ملک کی صنعت اور کمال کا نمونہ ہوں۔ اس عمارت کا نقشہ وہی ہے جو ہمایوں اور خانخاناں کے مقبروں کا ہے۔ مینار ہمایوں کے مقبرہ میں نہیں ہیں لیکن اکبر کے مقبرہ میں جو سکندرہ میں ہے، موجود ہیں۔ تبدیلی اتنی ہوئی ہے کہ دروازہ سے لے کر ان کو چبوترے پر نصب کردیا ہے۔

سر جان مارشل کے چلے جانے کے چند سال بعد ہندوستان کا محکمہ آثار قدیمہ ملکی ماہرین کے ہاتھ میں آگیا۔ لیکن شاید ارباب حکومت کو گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ مشہور ماہر آثار قدیمہ سر لیونارڈ وولے (SIR LEONARD WOOLAY) کو مشورہ کے لئے طلب کیا گیا۔ سر لیونارڈ نے یہاں کے کاموں پر سخت نکتہ چینی کی اور اپنی رپورٹ میں یہاں تک ظاہر کردیا کہ ہندوستان میں آرکیولوجی جاننے والے نہیں ہیں اور ناواقف لوگوں کے ہاتھوں میں یہاں کے آثار برباد ہو رہے ہیں۔ ملک کے

عالموں کو سرلیونارڈ کی اسی قسم کی باتیں ناگوار تو بہت گزریں مگر صبر کرکے خاموش بیٹھ رہے۔ انہی دنوں (۱۹۴۰ء میں) لاہور میں انڈین ہسٹری کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ آپ شعبہ آرکیولوجی کے صدر تھے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں آپ نے سرلیونارڈ وولے کے اعتراضوں کے جواب دیئے[1] اور بیان کیا کہ وہ ہمارے عہدہ داروں کی قابلیت سمجھ نہیں سکے۔ ہندوستان کی آرکیولوجی جتنا ہم سمجھ سکتے ہیں، باہر والے نہیں سمجھ سکتے۔

اس زمانہ میں کے۔ این۔ ڈکشٹ ڈائرکٹر جنرل تھے۔ آنجہانی نے آپ کو جو خط لکھا اس میں شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ آپ نے ہمارے سررشتہ کی لاج رکھ لی۔

دوسرے سال (۱۹۴۱ء میں) جب حیدرآباد میں اوری اینٹل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو آپ نے اپنے صدارتی خطبہ میں ڈکشٹ آنجہانی کے کاموں کو بہت سراہا[2]۔ اور ان کو تفصیل سے بیان کیا۔ اس خطبہ میں محکمہ آثار قدیمہ کی تنظیم کے سلسلہ میں آپ نے ایک اسکیم پیش کی ہے۔

سرجان مارشل یہاں اپنا صحیح جانشین ڈاکٹر یزدانی ہی کو سمجھتے تھے۔ انھوں نے انگلستان سے آپ کو خط لکھا کہ فرگسن (FERGUSSON) اور برجس (BURGESS) کی کتابیں اب پرانی ہو گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم تم مل کر (HISTORY OF THE MONUMENTS OF INDIA) ہندوستان کے آثار پر ایک جامع کتاب لکھیں۔ شمالی ہند کا حال میں لکھوں گا اور جنوبی ہند کا حال آپ لکھیں۔ اس طرح ایک مستند کتاب تیار ہو جائے گی۔ حکومت نے اس تجویز کو بہت پسند کیا غرض کتاب کی تیاری کا کام شروع ہوا اور پہلی جلد کا مواد تیار ہو گیا۔ مگر کچھ دن بعد سرجان مارشل کی صحت نے جواب دے دیا اور یہ یادگاری بند ہو گیا۔

وظیفہ پر سبکدوشی سے چند سال پہلے آپ کو ڈائرکٹر جنرل کا عہدہ بھی پیش کیا گیا تھا مگر آپ کی وضع داری نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ آخری عمر میں حیدرآباد کی ملازمت چھوڑ کر دلی چلے

---

[1] آپ کا یہ صدارتی خطبہ کتابچہ کی صورت میں چھپ چکا ہے۔

[2] یہ خطبہ معلومات سے پر ہے۔ کتابچہ کی صورت میں چھپ چکا ہے۔

آپ نے زیادہ تر انگریزی میں لکھا ہے اردو میں کم لکھا ہے مگر جو رسالے اور مضمون آپ نے لکھے ہیں وہ اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ آپ کا بیان بہت شگفتہ اور دل نشین ہے۔ اس میں روانی ہے اردو زبان کے مالک تھے۔ الفاظ کا انتخاب اور استعمال بڑی خوبی سے کرتے تھے۔ لفاظی کو ناپسند کرتے تھے۔ راقم نے ایک دن آپ سے عرض کیا کہ حساب یا الجبرا کی طرح آپ عبارت میں صرف اتنے ہی لفظ استعمال کرتے ہیں جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے "میاں یہ عادت اینٹ کی کتاب نے ڈال دی ہے۔ وہاں ایک ایک لفظ بڑی احتیاط سے لکھنا پڑتا ہے" آپ کی انشا پردازی کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر آپ اردو میں کچھ اور زیادہ لکھتے تو بہت بڑے صاحب طرز ادیب ہوتے۔

خدا تمام اچھی چیزوں کو فروخت کرتا ہے، عزت، شہرت، حکمت وغیرہ سب کی قیمتیں مقرر ہیں۔ ڈاکٹر یزدانی نے ان کو اپنی خداداد ذہانت، ذکاوت اور سخت محنت سے خریدا ہے۔ اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونا خدا کی دین ہے۔ ترقی کے لئے آپ نے کسی کا سہارا پسند نہیں کیا۔ انسان نہیں رہتا، مگر اس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔ ان میں ایسے کام بھی ہوتے ہیں جو جانے والے کی یاد دلاتے ہیں۔ مرحوم کے علمی کارنامے ایسے ہی ہیں، ان کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھی جاتی اور ان کے کام کی یاد دلاتی ہیں، یہی وہ چیزیں ہیں جو دنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہیں۔

"کتابیں جو چھپ نہ سکیں"

جناب عبدالمجید قریشی

زمانہ گذرتے دیر نہیں لگتی دس سال ہونے کو آئے لیکن یہ جیسے کل ہی کی بات ہے فاران کراچی کے اپریل ۱۹۵۵ء کے اس شمارے کے متعلق جو اس وقت میری نظروں کے سامنے میری میز پر پڑا ہوا ہے، مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں نے اسے کس قدر بجز باقی انداز میں مقامی بک سٹال سے خرید اتھا اور اس کا سبب وہ مضمون تھا جو اس میں "مشاہیر کے خطوط سید سلیمان ندوی کے نام" کے زیر عنوان شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں متحدہ ہندوستان کے متعدد عمائدین کے خطوط جو انھوں نے کبھی مولانا سید سلیمان ندوی کے نام تحریر فرمائے تھے شائع ہوئے تھے مکاتیب نگار حضرات میں علامہ اقبال، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر راجندر پرشاد، نواب اسمٰعیل خاں، سر شفاعت احمد خاں، نواب صدر یار جنگ، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید محمود، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا عبیداللہ سندھی شامل ہیں۔ مشاہیر ہند نے یہ تمام خطوط اردو زبان میں تحریر فرمائے ہیں حتیٰ کہ گاندھی جی کا خط بھی اردو میں ہے۔ ایک نادر و نایاب خط البتہ مشہور مستشرق پروفیسر ایڈورڈ براؤن کے قلم سے فارسی میں ہے۔ ان خطوط کے پیش لفظ میں "فاران" کے مدیر حضرت ماہر القادری نے یہ مسرت افزا خبر سنائی تھی کہ یہ اور ایسے ہی دوسرے خطوط عنقریب ایک مجموعے کی صورت میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ لیکن افسوس صد افسوس اسی سال نومبر کے مہینے میں سید صاحب وفات پا گئے اور مکاتیب کا یہ بیش بہا اور بے مثال ذخیرہ دس سال گذر جانے کے بعد بھی ابھی تک شائع نہ ہو سکا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کے صاحبزادے سید سلمان آج کل حیدرآباد (سندھ) یونیورسٹی میں ایک عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں اور اُن کی معمولی سی توجہ ان غیر معمولی خطوط کو گوشۂ گمنامی سے باہر لانے میں یقیناً ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے دنیائے علم و ادب پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔ "سیرت النبیؐ" "سیرت عائشہؓ" "ارض القرآن" "نقوشِ سلیمانی" "عمر خیام" اور "یادِ رفتگاں" کے مصنف سے دل دادگانِ علم و ادب میں بھلا کون واقف نہیں۔ وفات سے کچھ عرصے پیشتر انھوں نے کراچی میں ایک ادارۂ نشر و اشاعت "مکتبۃ الشرق" کے نام سے قائم فرمایا تھا جس کے زیر اہتمام اُن کی ایک نہایت ہی بلند پایہ اور دل پذیر کتاب "بریدِ فرنگ" شائع ہوئی تھی۔ "بریدِ فرنگ" سید صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے تحریکِ خلافت کے زمانے میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور چند دیگر احباب کو تحریر فرمائے تھے جب مولانا محمد علی اور ڈاکٹر سید حسین کے ہمراہ یورپ تشریف لے گئے تھے۔ سید صاحب نے ان خطوط کو کچھ ایسی ندرت اور جدت سے ترتیب دیا تھا کہ اُن کا حسن نکھر آیا اور اُن میں دیارِ غرب کے ایک علمی ادبی اور سیاسی سفر نامہ کا لطف محسوس ہونے لگا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات کا رنجدہ سانحہ اگر پیش نہ آتا تو امید تھی کہ "مشاہیر کے خطوط" بھی "بریدِ فرنگ" کی سی آب و تاب کے ساتھ اُنھی دنوں شائع ہو جاتے۔ "فاران" کراچی کا یہ شمارہ جس کا ذکر اوپر ہوا کم و بیش دس سال سے میرے پاس محفوظ ہے کل جب یکایک مجھے نظر پڑا تو جیسے کوئی بھولی بسری کہانی یاد آگئی۔ مجھے اپنی یادداشت پر کمال افسوس ہوا حالانکہ سید سلیمان صاحب کا تذکرہ اس عرصے میں متعدد بار علمی اور ادبی محفلوں میں آیا۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کی یاد میں جو خاص شمارہ "ریاض" کراچی نے شائع کیا تھا اسے میں نے خرید لیا تھا۔ پھر "معارف" اعظم گڑھ کا "سید سلیمان نمبر" بھی میں نے منگایا لیکن "فاران" میں چھپنے والے یہ خطوط کچھ ایسے نظر سے بلکہ دل و دماغ سے اوجھل ہوئے کہ دس سال کے بعد اُن کی اہمیت اور افادیت کا احساس آج پھر تازہ ہوا ہے۔ میرے مطالعہ کی عمر بیس پچیس سال کے قریب ہے۔ اس عرصے میں جہاں میں نے مطبوعہ صورت میں اپنی پسندیدہ کتابوں کو فراموش نہ ہونے دیا وہاں میرا ذہن اپنے گوشوں میں کچھ ایسی کتابوں کی یادوں کو بھی محفوظ کرتا رہا جو میرے معیار اور مذاق کی تھیں اور اُس وقت زیرِ تجویز، زیرِ ترتیب، زیرِ تکمیل اور زیرِ طبع کی منزلوں میں تھیں۔ اُن کے انتظار میں زمانہ گذرنے لگا۔ دنوں کے مہینے، مہینوں کے سال بننے لگے۔ لیکن نہ یہ منزلیں طے ہونے میں آئیں اور نہ یہ کتابیں چھپیں۔ وقت کے ساتھ

ساتھ ان کتابوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی اور آہستہ آہستہ یہ تعداد پچاس ساٹھ تک جا پہنچی۔ ان میں سے بعض کتابوں کا انتظار کرتے ہوئے مجھے دس دس، پندرہ پندرہ اور بیس بیس سال کا طویل عرصہ گذر چکا ہے مگر میں ابھی تک ان کی اشاعت کے متعلق پُرامید ہوں اور گاہے گاہے ان کتابوں کے مصنفین سے خط و کتابت کرتا رہتا ہوں۔ دُنیا بہ امید قائم ہے جب تک دم میں دم ہے مجھے اُن کا انتظار باقی رہے گا۔ اب سید سلیمان ندوی مرحوم کے یہ خطوط یاد آئے تو دل چاہا کہ ان تمام کتابوں کی یادوں کو اپنے ذہن کے گوشوں سے نکال کر سینۂ قرطاس پر ثبت کر دوں اور اب یہی خواہش اس مضمون کی تخلیق کا محرک بن رہی ہے۔ اپنی محبوب کتابوں کا یہ تذکرہ میرے لئے تو دلچسپی کا باعث ہوگا ہی لیکن وہ لوگ بھی جنھیں کتابوں اور کتابوں کے ذکر سے دلبستگی ہے امید ہے اسے پُرکشش ہی پائیں گے اور عجب نہیں کہ ان سطور کا مطالعہ بشرطیکہ یہ سطور ان کی نظر سے گذریں ہمارے مصنفین اور ناشرین حضرات کو بھی زیرِ تبصرہ کتابوں میں سے کچھ نہ کچھ کتابوں کی اشاعت کی جانب مائل کر دے اس تذکرہ میں میں نے کچھ ایسے اہم اور قابلِ ذکر مضامین کی شمولیت بھی ناگزیر سمجھی ہے جو کافی پُرانے ہونے کے باوجود ابھی تک مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے پڑے ہیں اور جن کی دوبارہ اشاعت کا التزام ہمارے ادب میں بہت سی گرانمایہ تصانیف کے عالمِ وجود میں لانے کا سبب بن سکتا ہے۔ ان مضامین کے ذکر کے ساتھ ساتھ ہمارے بہت ہی قریبی دور کی "کتابیں" بھی اس مضمون میں شامل کر دی گئی ہیں۔

اب میں اس سلسلہ میں سب سے پہلے "اعمال نامہ" کو لیتا ہوں۔

سر سید رضا علی کی یہ باغ و بہار کتاب ان سطروں پر ختم ہوتی ہے:

"اُس خاتون (لیڈی رضا علی) کا تذکرہ کرنے کے بعد جو صحیح معنی میں میری رفیقۂ حیات اور محبوبہ تھی کوئی اور ذکر کتاب کے اس حصہ میں کرنا میرے جذبۂ محبت کے منافی ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میری زندگی کی کہانی اور محبت کی داستان ناتمام رہی۔ آخر اعمال نامہ ہے کہاں تک اختصار سے کام لیا جائے میرا شمار اُن لوگوں میں تھا جو بغیر پئے جھومتے ہیں جو کچھ لکھ چکا ہوں اُس کا سرور شاید کتاب کا دُوسرا حصہ تیار کرنے تک رہے۔ دوسرے حصہ کے کافی اجزا کا مسودہ تیار ہے۔ بندگانِ خدا سے سرِدست باتیں ہو چکیں اب یادِ خدا کا وقت ہے۔"

پانی وضو کو لاؤ رُخِ شمع زرد ہے
مینا اُٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا "

"اعمال نامہ" کے یہ الفاظ جب کبھی پڑھنے کا اتفاق ہوا مجھے ہمیشہ دُکھ ہوا کاش "اعمال نامہ" کا یہ دوسرا حصہ جس کا ذکر سید صاحب نے یہاں فرمایا ہے اُن کی زندگی میں ہی شائع ہو چکا ہوتا۔ "اعمال نامہ" کی جلد اول کو شائع ہوئے بیس سال گذر چکے اور سید صاحب کی وفات کو پندرہ برس ہونے کو آئے خدا جانے "اعمال نامہ" کی جلد دوم کا یہ مسودہ اب کن صاحب کے قبضے میں ہے اور وہ اسے کیوں نہیں شائع کر رہے ہیں۔ سوچتا ہوں کہیں یہ مسودہ ضائع تو نہیں ہو گیا لیکن اس سوچ سے فائدہ! سر رضا علی "اعمال نامہ" کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد پانچ سال زندہ رہے تعجب ہے وہ بھی جلد دوم کی اشاعت کا اس عرصہ میں کوئی اہتمام نہ کر سکے!

نواب صاحب چھتاری ۱۹۴۷ء میں اپنی آپ بیتی "یادِ ایام" قلم بند فرما رہے تھے کہ انہی دنوں اُن کو ریاست حیدرآباد دکن کی طرف سے وزارتِ عظمیٰ کی پیشکش ہوئی۔ نواب صاحب وہاں تشریف لے گئے تو مصروفیات میں کچھ ایسے گم ہوئے کہ "یادِ ایام" کی یاد ہی بھول بیٹھے اور وہ نا تمام رہ گئی۔ نواب صاحب "یادِ ایام" میں ۱۹۳۰ء تک کے واقعات لکھ پائے تھے اس سے زیادہ نہ لکھ سکے اور کتاب ادھوری ہی شائع ہو گئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر نواب صاحب اپنی زندگی کی اس دلکش داستان کو مکمل فرما دیتے۔

مولانا عبد الماجد دریابادی بہت ساری کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی تین کتابیں "محمد علی: ذاتی ڈائری" "سفرِ حجاز" اور "مقالاتِ ماجد" تو میری پسندیدہ کتابوں میں سرِ فہرست ہیں۔ لیکن اُن کی سب سے زیادہ دلکش اور دلآویز کتاب اُن کی آپ بیتی "حیاتِ ماجدی" ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے دو باب چار پانچ سال ہوئے رسالہ "چراغِ راہ" کراچی میں نکل چکے ہیں۔ "حیاتِ ماجدی" کے مسودہ کو مکمل ہوئے سات آٹھ برس گذر چکے ہیں لیکن کتاب چھپنے میں نہیں آسکی ہے کیونکہ مولانا دریابادی نے اس کی اشاعت پر بہت ہی عجیب سی پابندی عائد کر رکھی ہے وہ یہ کہ "حیاتِ ماجدی" ان کی زندگی میں کبھی شائع نہ ہو گی۔

میں نے اپنی محبوب کتابوں کی اشاعت کے لئے کئی مرتبہ دعائیں بھی مانگی ہیں لیکن "حیاتِ ماجدی" کے لئے تو میں دعا بھی نہیں مانگ سکتا۔ خدائے پاک مولانا عبدالماجد دریابادی کو خوش و خرم رکھے۔[لہ]

علی گڑھ کے ایک مشہور ادیب اور مصنف مولوی محمد مقتدی خاں شیروانی نے عرصے کی بات ہے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں اور نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے سوانح حیات علیحدہ علیحدہ تحریر فرما رہے ہیں۔ بلکہ ثانی الذکر کتاب کی تسوید و تہذیب میں تو مولانا ابوالکلام آزاد کی قلمی امداد بھی شامل تھی کیونکہ ان کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک اور کتاب یو پی کے اپنے زمانے کے مشہور سیاسی رہنما جناب تصدق احمد خاں شیروانی کے متعلق ڈاکٹر سید محمود صاحب سے بھی لکھوا رہے تھے۔ یہ کتابیں اگر چھپ جاتیں تو ہمارے سوانحی ادب میں گراں قدر اضافہ ہوتیں لیکن افسوس کہ کسی خاص وجہ سے ان میں سے کوئی کتاب بھی اب تک شائع نہ ہو سکی۔

خاں بہادر ڈپٹی حبیب اللہ خاں بہت پرانے علیگ تھے وہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے ابتدائی طلباء میں سے تھے۔ کوئی دو سال ہوئے بچانوے برس کی عمر میں علی گڑھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے لیکن مسلم یونیورسٹی سے گہری محبت کی بنا پر وطن چھوڑ کر علی گڑھ آبسے تھے اور یہیں ولایت منزل کے نام سے اپنی کوٹھی تعمیر کی تھی۔ خاں بہادر صاحب مسلم یونیورسٹی اور اس کے معاملات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے "حیاتِ آفتاب" کے نام سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سوانح حیات بھی مرتب فرمائے تھے۔ وہ بہت دنوں سے اپنی آپ بیتی "میرا علی گڑھ" لکھ رہے تھے۔ جس کا ایک باب "علی گڑھ کا کرکٹ" ۱۹۴۷ء میں الگ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ کرکٹ کے کھیل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں لیکن کتاب "علی گڑھ کا کرکٹ" واقعات کے لحاظ سے

لہ میں نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو اس سلسلے میں لکھا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:-

"حیاتِ ماجدی" نام سے کوئی کتاب میرے علم میں نہیں۔ ایک آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری ضرور میں نے لکھ ڈالی ہے لیکن ابھی مسودہ کی صورت میں ہے اور اپنی زندگی میں اسے شائع کرنے سے طبیعت ہچکچا رہی ہے۔ "چراغِ راہ" کو ایک اداریہ سبق آموز باب (اپنے دورِ الحاد کے متعلق) شاید اس کے طلب کرنے پر میں نے بھیج دیا تھا۔ اس کو دیکھا یا نہیں۔"

ایک پر لطف کوشش ہے۔ میرا علی گڑھ کے موضوع پر خان بہادر صاحب سے میری کئی سال تک مراسلت رہی۔ خرابیٔ صحت کی وجہ سے میرے خطوط کا جواب ہمیشہ دیر سے دیتے تھے لیکن جواب سے نوازتے ضرور تھے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میرے ایک خط کا جواب انھوں نے پورے چھ مہینے کے بعد عنایت فرمایا تھا۔ خان بہادر صاحب وفات پا گئے میرا اجمال ہے "میرا علی گڑھ" مکمل نہیں ہوئی اور اگر مکمل ہو بھی گئی ہو تو کون جانے کب شائع ہوگی۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار غالباً لطیفے سے کم نہیں کہ خان بہادر صاحب نے "علی گڑھ کا کرکٹ" میں ایک مقام پر "حیاتِ آفتاب" کا ذکر فرمایا اور اُس کے آگے خطوط وحدانی میں یہ الفاظ تحریر فرمائے "زیر طبع ہے" آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا اور شاید ہنسی بھی آئے کہ یہ "زیر طبع" کتاب (حیاتِ آفتاب) کم وبیش پندرہ سال کے بعد ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔

انہی خان بہادر ڈپٹی حبیب اللہ خاں صاحب کے ایک نہایت ہی عزیز دوست میر ولایت حسین صاحب تھے۔ اُن کا شمار محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے مشہور اور قدیم اساتذہ میں ہوتا ہے۔ میر صاحب نے بھی اپنی زندگی کے حالات خود قلم بند فرمائے تھے جن کے کچھ اجزا "علی گڑھ میگزین" کے "علی گڑھ نمبر" (۱۹۵۵ء) میں "ذاتی ڈائری کے چند ورق" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ شروع میں سید محمد ٹونکی صاحب کا ایک نوٹ بھی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "میر صاحب نے اپنی سوانح لکھ کر جو احسان علی گڑھ پر کیا ہے۔ اس کا اندازہ اسی وقت ہوگا جب وہ پوری چھپ کر منظر عام پر آئے گی اور لوگ دیکھیں گے کہ وہ ان کی نہیں علیگڑھ کی بڑی سچی تاریخ ہے۔" میں نے اس سلسلے میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڑھ سے کئی سال تک خط وکتابت کی۔ ستمبر ۱۹۵۷ء میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے نقیب پندرہ روزہ "علی گڑھ" میں اسی موضوع پر میرا ایک خط بھی شائع ہوا تھا جس کے جواب میں ایڈیٹر صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ کتاب بہت جلد پریس میں جانے والی ہے لیکن بعد ازاں اس کتاب کو کچھ ایسی مجبوریوں سے سابقہ پڑا کہ اُس کی اشاعت کی اب تک نوبت نہ آئی۔[1]

---

[1] سید محمد ٹونکی صاحب اس کتاب کی اشاعت کی فکر میں برابر لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے ۱۱؍جون ۶۳ء کو شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کو ایک خط لکھا ہے۔ (اعظمی)

ملّا واحدی صاحب ہلکا پھلکا اور شگفتہ لکھنے میں اپنی مثال آپ ہیں اور مجھے اُن کا طرزِ نگارش بہت پسند ہے۔ "حیات سرورِ کائنات" "میرے زمانے کی دلی" اور "حیات خواجہ حسن نظامی" اُن کی بہترین تصانیف ہیں۔ لیکن سب کی سب نامکمل ہیں "حیات سرورِ کائنات" کو وہ چھ جلدوں میں مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن ابھی صرف تین جلدوں کی تکمیل ہوئی ہے "میرے زمانہ کی دلی" کی جلدوں کا مواد اُن کے پاس موجود ہے لیکن اُس کی صرف ایک جلد ہی شائع ہوئی "حیات خواجہ حسن نظامی" کو بھی انھوں نے ۱۹۲۷ء تک کے واقعات پر ختم کر دیا حالانکہ خواجہ صاحب کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا یوں انھوں نے اس سلسلہ کو بھی ادھورا چھوڑ دیا پھر شاہ ولی اللہ کے متعلق لکھنے لگے نو سو صفحات لکھ کر بس کر دیے "تاثراتِ واحدی" شروع کی تو وہ بھی نامکمل ہی رہی سو واحدی صاحب اپنی ایک پرانی کتاب "مضامینِ واحدی" کا نیا ایڈیشن شائع کرنا چاہتے تھے لیکن بس اعلان کر کے رہ گئے۔ اور یہ معاملہ دس بارہ سال سے یوں ہی پڑا ہوا ہے۔ واحدی صاحب میرے بزرگ ہیں اُن سے کسی قسم کا گلہ شکوہ سراسر بے ادبی ہے بہرحال ان کی کتابوں کا انتظار شب و روز کرتا ہوں۔

[illegible] کی بات ہے لاہور کے رسالہ "نئی تحریریں" میں منشی نجم الدین کی غیر معمولی شخصیت پر ایک دلچسپ مضمون ڈاکٹر مختار احمد آرزو (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے قلم سے میری نظر سے گزرا تھا۔ آرزو صاحب اردو کے سلجھے ہوئے ادیب ہیں اور غالبیات پر دقیق نظر رکھتے ہیں۔ منشی نجم الدین صاحب سرسید کے منشی تھے اور اُن کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ انھوں [illegible] علی گڑھ کے ساتھ ایک طویل زمانہ گذارا تھا اور انھیں بہت ہی قریب سے دیکھا تھا۔ منشی نجم الدین کے پاس خطوط، اسناد اور دوسری نایاب تحریروں کے علاوہ علی گڑھ تحریک سے تعلق رکھنے والے اصحاب کی تصویروں کا بڑا نادر مجموعہ تھا جس میں سرسید، سید محمود، اُن کے خاندان کے بعض اعزہ، اُن کے معاصرین اور احباب، کالج کے قدیم اساتذہ اور ممتاز اہلِ قلم کی بہت اچھی عکسی تصویریں تھیں۔ آرزو صاحب منشی نجم الدین سے متعدد مرتبہ ملے۔ اس مضمون میں اُنھوں نے یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ وہ سرسید کی زندگی پر ایک کتاب تحریر فرمائیں گے جس میں مطبوعہ ماخذوں سے قطع نظر کر کے اُن صاحب سے جیسے کہ منشی نجم الدین ہیں سرسید کے ذاتی حالات اور اُن کی تحریک کے متعلق ایسی معلومات فراہم کریں گے جو صرف اُنھی بزرگوں کے سینوں میں پوشیدہ ہیں۔ یہ کام آرزو صاحب ہی کے کرنے کا

مگر ابھی تک نہ ہو سکا۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کی بعض دوسری مصروفیات اس راہ میں حائل ہو گئی ہوں خدا کرے میرے یہ الفاظ آرزو صاحب تک پہنچ جائیں اور وہ اب اس کا بیڑا اُٹھا لیں۔

دلی کے ایک بہت معمر بزرگ منشی عبدالقدیر صاحب ہیں۔ اسّی پچاسی برس کی عمر ہے تحریکِ آزادی سے دیرینہ تعلق رہا ہے اور اُس کی پاداش میں عمر کا ایک حصہ قیدِ فرنگ میں بھی گذرا۔ اُس زمانہ کی یادوں کو اُنھوں نے "جیل میں سال" کے عنوان سے لکھا اور دلی کے ایک ناشر کے حوالہ کیا۔ اُنھوں نے ایک دوسری کتاب "دلی میں پچپن برس" اور لکھی اور وہ بھی اُنھی ناشر صاحب کو دے دی۔ یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے جسے اب اٹھارہ سال ہونے کو ہیں۔ کتابیں جب ناشر کے واضح اعلان کے باوجود کئی سال تک نہ چھپیں تو میں نے منشی عبدالقدیر صاحب سے اس کا سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ناشر صاحب پریس کے مقروض تھے۔ پریس کے مالک نے "جیل میں سال" کی تیار شدہ پلیٹوں کو دبا کر رکھ لیا کہ قرضہ ادا کیجئے اور پلیٹیں لیجائیے۔ نہ اُن کے پاس پیسے ہوئے اور نہ کتاب واپس ملی اور نہ چھپی اور اس طرح یہ کتاب غالباً اس نزاع میں ضائع ہو گئی۔ "دلی میں پچپن برس" کے متعلق اُنھوں نے اب دیا کہ یہ کتاب "دلی میں باسٹھ برس" کی صورت میں چھپے گی اور اب تو شاید "دلی میں پچھتر برس" کی نوبت آ گئی۔ لطف یہ ہے کہ منشی صاحب کے صاحبزادے علاؤالدین خالد صاحب پاکستان میں کتابوں کا بہت بڑا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں اور بلاشبہ سینکڑوں کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ اُن سے بھی کئی مرتبہ اس کتاب کا ذکر کیا۔ مگر خاموشی کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں ملا۔

۱۹۵۹ء میں میں نے مولانا غلام رسول مہر سے اُن کی زیرِ ترتیب کتاب "سرودِ رفتہ" کے متعلق استفسار کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ "سرودِ رفتہ" اُن کی آپ بیتی ہے۔ مولانا مہر نے میرے استفسار کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ "سرودِ رفتہ" اُن کی سرگذشت نہیں بلکہ علامہ اقبال کا وہ کلام ہے جو اُنھوں نے اس لئے قلم زد فرما دیا تھا کہ وہ اُن کے معیارِ بلند کے مطابق نہ تھا۔ اُنھوں نے مزید فرمایا تھا کہ اُن کی سرگذشت تو نہیں مگر اُن کے دور کی سرگذشت انشاء اللہ بہت جلد مکمل ہو جائے گی۔ اُس کی دو جلدیں ہونگی اور سنہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء تک اور دوسری جلد ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک کے حالات پر مشتمل ہوگی۔ آخری دور کے حالات پہلے لکھنے کا سبب اُنھوں نے یہ لکھا تھا کہ ۱۹۲۱ء سے وہ خود سیاسیات میں آ گئے تھے اور یہ تمام واقعات اُن کے سامنے گذرے ہیں۔ مہر صاحب کے مکتوب گرامی کو آئے چار سال ہو چکے اور پانچواں سال شروع

ہے۔ جن کتابوں کی اشاعت کے لئے اُنھوں نے بہت جلد کے الفاظ استعمال فرمائے تھے اُن کے لئے چار پانچ سال کی مدت کچھ کم تو نہیں۔

چودھری محمد علی صاحب سابق وزیر اعظم پاکستان ایک عرصہ سے انگریزی میں اپنی زندگی کی داستان لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس کتاب کا ایک بڑا حصہ اُنھوں نے متحدہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے دو اہم سالوں (۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء) کے لئے وقف کیا ہے۔ کتاب امریکہ میں چھپے گی۔ ویسے پروگرام کے مطابق اسے گذشتہ سال چھپ جانا چاہئے تھا دیکھئے اِس سال بھی آتی ہے یا نہیں۔

میاں بشیر احمد صاحب مدیر "ہمایوں" لاہور کا ایک اعلان ۱۹۵۵ء میں مجھے اخبار "امروز" لاہور میں پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا کہ وہ اپنے والدِ گرامی جسٹس شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم کے سوانح حیات قلم بند کرنا چاہتے ہیں لیکن بعد میں یہ نہ معلوم نہ ہو سکا کہ اُنھوں نے اس سلسلے میں اب تک کیا کچھ کیا۔

کراچی کے ایک ادارہ مکتبہ خدامِ ملت نے بھی انھی دنوں ایک نادر و نایاب کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ کتاب جسٹس سید امیر علی مرحوم کی خود نوشت داستانِ زندگی تھی جو اُنھوں نے کبھی انگریزی میں لکھی تھی اور ابھی تک غیر مطبوعہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ ناشر کے پے در پے اعلانات سے اُس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کتاب بہت جلد شائع ہو رہی ہے لیکن بعد میں یہ بدقسمت کتاب کچھ ایسی مشکلات سے دوچار ہوئی کہ پانچ سال گذرنے کے بعد بھی اب تک شائع نہ ہو سکی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے مختصر سے سفرنامہ "شرقِ اوسط میں کیا دیکھا" جو جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا کے پیش لفظ میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ اُن کے اس سفرنامہ کے اجمال کی تفصیل اُن کی اُس ڈائری میں ملے گی جو کئی سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور جو مصر، سوڈان، شام، شرقِ اُردن اور فلسطین کا مکمل سفرنامہ اور روزنامچہ نیز وہاں کی زندگی، معاشرت، سیاست اور تعلیم کا اُبھرا ہوا خاکہ ہے۔ مولانا علی میاں کے اِس دلعزیز سفرنامہ کا انتظار کرتے کرتے مجھے دس سال ہو گئے لیکن ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ ہے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی وفات سے کوئی ہفتہ بھر پیشتر اپنے ایک بیان میں حکیم اسرار احمد کریوی ناظم مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان کی خصوصی توجہ حضرت صدق جائسی کی کتاب "دربارِ دُربار" کی جانب مبذول کرائی تھی کہ وہ اس کتاب کو جلد از جلد انجمن کی طرف سے شائع کرنے کا اہتمام کریں۔

بابائے اُردو کی وفات کو دو برس ہونے کو آئے لیکن کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی "دربار بلدہ" یوں تو فانی بدایونی مرحوم کی حرماں نصیبی کی داستان ہے لیکن بر سبیل تذکرہ اس کتاب میں متعدد دلچسپ اور پرلطف واقعات ایسے بھی شامل ہو گئے ہیں جن کا تعلق میر محبوب علی خاں نظامِ دکن، میر عثمان علی خاں نظامِ دکن، پرنس اعظم جاہ، نواب امیر مینائی، جلیل مینائی، جوش ملیح آبادی، ساہر القادری، نجم آفندی اور کتاب کے مصنف صدق جائسی سے ہے۔ "دربارِ دُربار" سے مصنف کی مراد شہزادہ معظم جاہ جو نیز پرنس ریاست حیدرآباد دکن کا دربار ہے جہاں مصنف کا ایک اعزازی مصاحب کی حیثیت سے آنا جانا تھا۔

بابائے اُردو کی سیرت جس کے متعلق سُنا تھا کہ حکیم اسرار احمد صاحب ترتیب دے رہے ہیں ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے۔

جماعت اسلامی کے رہنما اور "سیارہ" لاہور کے فاضل مدیر جناب نعیم صدیقی کو قادیانی تحریک کے سلسلے میں ۱۹۵۳ء کے ابتدائی ایام میں کچھ عرصہ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے رہنا پڑا تھا۔ جب وہ رہا ہوئے تو انہوں نے "چراغِ راہ" کراچی میں ایامِ اسیری کے متعلق اپنے کچھ تاثرات پیش کیے تھے۔ اس زمانہ میں لاہور کے ایک ناشر نے اعلان کیا تھا کہ وہ جلد ہی نعیم صدیقی صاحب کی جیل کی ڈائری کو ایک مستقل کتاب کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ لیکن بعد ازاں ایسا نہ ہوا اور اب تو امتدادِ زمانہ نے اس امید کو ناامیدی میں بدل دیا ہے۔ اس ضمن میں مشہور افسانہ نگار اور شاعر جناب احمد ندیم قاسمی کے اُن مضامین کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو "زندان و سلاسل" کے زیر عنوان کئی قسطوں میں "نقوش" لاہور میں اُس زمانہ میں شائع ہوئے تھے جب وہ "راولپنڈی سازش کیس" میں مبتلا ہونے کے بعد رہا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے "مہر بلب" کے نام سے اپنے زمانۂ اسیری کی یادوں کو ترتیب دیا تھا اور اس فکر میں تھے کہ یہ کتاب جلد شائع ہو جائے لیکن پھر نہ جانے کیا حالات پیش آئے کہ کتاب مذکور چھپتے چھپتے رہ گئی۔ آغا شورش کاشمیری کا مشہور و معروف سلسلۂ مضامین "پسِ دیوارِ زنداں" بھی آج تک کتاب کی شکل میں ظاہر نہ ہو سکا گو اُس کے زیر طبع ہونے کا اشتہار پچھلے دس بارہ برسوں میں "چٹان" میں متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔

تین چار سال ہوئے یہ خبر بھی سُننے میں آئی تھی کہ مولانا ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی چودھری غلام حیدر صاحب اپنے برادرِ معظم کی سیرت مکمل کرنے میں مصروف ہیں۔ چودھری صاحب صاحبِ قلم ہیں اس لئے امید تھی

کہ اُن کے قلم سے مولانا ظفر علی خاں کے متعلق ایک جامع اور مبسوط کتاب مرتب ہو جائیگی لیکن ابھی تک یہ امید پوری نہیں ہوئی ساؤتھ کراچی کی حسرت میموریل سوسائٹی بھی مولانا حسرت موہانی کی سیرت پر ایک بلند پایہ کتاب شائع کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ اس کتاب کا تانا بانا ابھی تیار نہیں ہوا۔

شاہد احمد دہلوی صاحب مدیر "ساقی" سے بھی اُن کی دو کتابوں "طاقِ نسیاں" اور "اُجڑا دیار" کے بارے میں کئی سال تک مراسلت رہی "طاقِ نسیاں" "گنجینۂ گوہر" کے نام سے پچھلے برس چھپ چکی ہے البتہ "اُجڑا دیار" کا انتظار باقی ہے۔ "اُجڑا دیار" کو دہلی مرحوم کا مرثیہ کہنا چاہیے جسے شاہد احمد دہلوی نے نظم کے بجائے نثر میں لکھا ہے۔ کتاب میں اُن کا [illegible] دل کا بیتا ہوا شامل ہے۔ "اُجڑا دیار" کے سلسلے کے مضامین آجکل "ساقی" میں نکل رہے ہیں توقع ہے کہ یہ کتاب سالِ رواں میں [illegible] جائے گی۔

مکتبۂ جدید لاہور کی فہرستوں میں ایک مدت تک مولوی محمد امین زبیری کی کتابوں "تذکرۂ محسن" اور "تذکرۂ وقار" جو بالترتیب نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے متعلق ہیں "زیرِ طبع" کے ضمن میں ذکر آتا رہا۔ "مکتبۂ داستان گو" قدرت اللہ شہاب کی "ڈپٹی کمشنر کی ڈائری" کے بارے میں لگاتار اشتہار دیتا رہا اور مکتبہ مہر نیمروز کراچی اپنے تین سفرناموں "سفرنامۂ انگلستان" "سفرنامہ امریکہ" اور "نئے چمن نئی بہاریں" کا یقین دلاتا رہا لیکن مجھ ایسے مشتاقانِ جمال کے خرمنِ صبر و قرار میں آگ لگا کر میری یہ محبوب کتابیں نہ جانے کہاں بیٹھ رہیں یہی شکوہ مجھے ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور سے ہے جو رئیس احمد جعفری کی "داماں باغباں" (شخصیات پر مضامین) کو دس گیارہ سال کا عرصہ گذر جانے پر بھی شائع نہیں کر رہے ہیں۔

دیارِ حجاز کی منزل ہو۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سا مسافر ہو اور مولوی محمد عاصم حداد اور مولوی خلیل حامدی جیسے اہلِ قلم رفیقانِ سفر ہوں تو پھر اس مقدس سفر کی روداد دلچسپ سے دلچسپ تر کیوں نہ ہو لیکن اِن سفرناموں کی یہی دلچسپی میرے لئے وبالِ جان بن کر رہ گئی۔ "ترجمان القرآن" اور "ایشیا" میں اِن سفرناموں کی چند قسطیں نکلی تھیں لیکن اپنے ذوقِ مطالعہ پر تو یہ قسطیں گراں ہی گذریں کیونکہ اپنی محبوب کتابوں کو اس طرح قسطوں میں پڑھنا اپنے لئے تو قیامت سے کم نہیں اس لئے ان سفرناموں کو کتابی صورت میں دیکھنے کا آرزومند ہوں۔ ناشر کی طرف سے کئی سال ہوئے "زیرِ طبع" ہونے کی خوشخبری مل چکی ہے۔ دعائیں مانگ مانگ کر تھک چکا ہوں لیکن ناشر کا وعدۂ فردا وفا ہونے میں نہیں آتا۔ میں حالات حضرتِ ناشر سے

اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

بُرا کیا تیرے وعدے پر اعتبار کیا

اللہ تعالیٰ اُن کی اور ہماری مشکلیں آسان فرمائے آمین!

حیدرآباد دکن کی ڈاکٹر بیگم قطب النساء ہاشمی نے کئی سال ہوئے بابائے اُردو کے نام سے بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ایک کتاب تصنیف کی یہ کتاب اُن سے کراچی کے ایک ناشر نے حاصل کرلی لیکن دو تین سال تک اپنی فہرستِ کتب میں اس کتاب کا اشتہار دینے کے باوجود اسے شائع نہ کیا۔ اِن باتوں کو چار پانچ سال گذر گئے لیکن کوشش کے باوجود مجھے اس کتاب کی [illegible] پس منظر معلوم نہ ہوا سوائے اس کے کہ مصنفہ کو نا [illegible]

سردار عبدالرب نشتر مرحوم کی خود نوشت سوانح [illegible] اقتباسات گذشتہ دنوں اُن کی ساتویں برسی کے موقع پر اخبار جنگ کراچی میں شائع [illegible] ہے۔ مجھے یاد ہے سردار صاحب نے ۱۹۵۵ء میں وزارتِ صنعت سے سبکدوش ہونے کے بعد یہ ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ وہ اب اپنی آپ بیتی لکھیں گے جس میں وہ قیامِ پاکستان کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالیں گے۔ سردار [illegible] اس آپ بیتی مسودہ اُن کے صاحبزادے عبدالجمیل نشتر صاحب [illegible] بہتر ہوگا کہ جمیل صاحب اپنے والدِ گرامی کی اس آپ بیتی کو خواہ یہ مکمل ہو یا نامکمل جلد از جلد [illegible]

حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ مرحوم کی مفصل اور شایانِ شان سوانح عمری پر ہندوستان میں کام مکمل ہو چکا ہے اور اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے ایک ٹرسٹ کی تشکیل بھی عمل میں لائی جا چکی [illegible] دیکھئے مولانا مرحوم پر یہ قابلِ دید کتاب کب تک جلوہ نما ہوتی ہے۔

حکیم شجاع احمد صاحب نے آج سے کوئی بیس سال پیشتر خوں بہا میں بڑے پیارے اور خوبصو

۱؎ اس کتاب کے متعلق خود بابائے اردو نے مجھے لکھا تھا کہ مصنفہ اور ناشر کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے کتاب شائع نہ ہو سکی۔ مصنفہ سے بھی میری خط و کتابت ہوئی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کوئی ان کا مسودہ ان کو واپس دلا دے اور چھپوانے کا انتظام کریں گی۔ (اعظمی)

انداز میں اپنی زندگی کے مشاہدات اور تاثرات پیش کئے تھے۔ اُن کی اس پُر لطف کہانی میں ضمناً کچھ ایسے واقعات اور شخصیات کا تذکرہ بھی آگیا ہے جو ہماری قومی، مجلسی اور سیاسی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ حکیم صاحب بنیادی طور پر ادیب ہیں اس لئے اس روداد کا اسلوب نگارش اور اندازِ بیاں بہت ہی پرکیف اور دلکش ہے۔ "خوں بہا" کی زیرِ نظر کتاب پر جلد اوّل لکھا ہوا ہے اور واقعات کے لحاظ سے یہ ۱۹۱۵ء پر ختم ہو جاتی ہے جس کو اب پچاس برس ہونے کو آئے۔ حکیم صاحب صرف صاحبِ طرز ادیب ہی نہیں بلکہ مجلس قانون ساز صوبہ پنجاب کے ڈپٹی سکرٹری اور سکرٹری مجلس قانون ساز صوبہ مغربی پاکستان کے سکرٹری ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل زمانہ ہماری سیاسی گہما گہمی میں بھی گزارا ہے۔ حکیم صاحب ۱۹۱۵ء کے بعد کی داستان اگر اسی انداز میں مرتب فرمادیں تو اُن کا یہ دل نشیں تذکرہ [illegible] سیاست کا ایک حسین امتزاج ہوگا بلکہ اُس کی اشاعت سے درونِ پردہ کے کچھ ایسے حالات اور واقعات بھی ہمارے سامنے آئیں گے جن سے حکیم صاحب کے سوا کوئی اور واقف نہیں۔

آغا محمد باقر صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور کی [illegible] اور "لاہور سے لندن تک" دو ماہی "صحیفہ" لاہور میں بالاقساط شائع ہوتی رہی ہے خوب سے خوب تر تھی اور اس امر کی پوری طرح متقاضی تھی کہ یہ شگفتہ داستان ایک کتاب کی صورت میں دوبارہ شائع ہو کر سہل ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا سبب بنے۔ اس مرحلہ پر مجھے ادیب الملک خواجہ محمد شفیع دہلوی کی "بلاکشان" کی وہ قسطیں بھی یاد آگئیں جو کبھی "تذکرہ" کراچی میں نکلتی رہی تھیں۔ "بلاکشاں" یاد آئی تو ساتھ ہی مشہورِ انقلابی پروفیسر محمد اقبال شیدائی کی "داستانِ بلاکشاں" بھی یاد آگئی۔ تحریکِ مجاہدین کی یہ ناقابلِ فراموش کہانی آج کل "تہذیب الاخلاق" لاہور میں مسلسل شائع ہو رہی ہے۔ خدا کرے کہ یہ مضامین جلد سے جلد ایک کتاب کی شکل اختیار کریں۔ ایسے حضرتِ م ۔ ش بھی بروقت یاد آئے۔ بہت عرصے کی بات ہے ہفت روزہ "آفاق" لاہور میں "میری جیل یاترا" کے عنوان سے کوئی ایک درجن قسطوں میں اُن کے قلم سے ایک دل چسپ سلسلۂ مضامین نکلا تھا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں صوبہ مغربی پنجاب کی بعض اہم سیاسی شخصیتوں کے خاکے بھی "آفاق" میں پیش کئے تھے۔ یہ سب چیزیں ادبی لحاظ سے بہت بلند اور وقیع

محمد علوی کی بھی اُن کی خصوصیت باقی ہے۔ حضرت م ش توجہ فرمائیں تو اُن کی ایک بہت ہی عمدہ اور قابل مطالعہ کتاب منظر شہود پر آسکتی ہے اور پھر اُن کی مشہود معروف لاہور کی ڈائری کا ایک انتخاب چھپ جائے تو کیا کہنے! مجھے جناب عبداللہ ملک کے وہ مضامین بھی کبھی نہ بھول سکیں گے جو تین سال قبل 'لیل و نہار' لاہور میں 'یادوں کے مزار' بن کر شائع ہوتے رہے۔ 'لیل و نہار' میں شیخ عبدالرحیم (علیگ) کے پُرلطف مضامین نواب محسن الملک مسعود شامی مرحوم اور سر شیخ عبدالقادر وغیرہ بھی بھولنے والی چیزیں نہیں۔ میری شدید خواہش ہے کہ وہ دلفریب مضامین جو یوں بکھرے ہوئے پڑے ہیں جلد از جلد خوبصورت اور خوشنما کتابوں کی صورت میں یکجا ہو جائیں۔

ہاں تین کتابیں اور بھی میرے انتظار کے مراحل میں ہیں۔ پہلی کتاب 'زندگی کی گذرگاہوں میں' ہے یہ ہمارے ملک کے نہایت ہی محترم اور نامور صحافی اور ادیب مولانا نصراللہ خاں عزیز مدیر 'ایشیا' لاہور کی زندگی کی کہانی ہے جو گاہ گاہ 'ایشیا' لاہور میں شائع ہوتی رہی ہے۔ باقی دو کتابیں حضرت جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی بارات' اور حضرت حفیظ جالندھری کی 'جنگ و آہنگ' ہیں۔ دونوں کی دونوں کتابیں ان حضرات کی آپ بیتیاں ہیں۔ ایک اور قابل ذکر کتاب ان دنوں نظر سے گذر رہی ہے۔ یہ کتاب جناب ذوالفقار علی بخاری سابق ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کی یادداشتوں پر مشتمل ہے جو آج کل ہر دوسرے تیسرے روز کراچی کے اخبار 'حریت' میں نکل رہی ہے۔ یہ بہت ہی دلچسپ قابل مطالعہ ہے۔

ایک بہت ہی عجیب و غریب اور نہایت ہی دلچسپ کتاب کا ذکر ابھی باقی ہے جس کی ترتیب و تدوین میں میرے اشتیاق، میرے اصرار اور میرے جذبات کا دخل ہے۔ یہ ضخیم کتاب میرے محترم مشفق مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب مالک دواخانہ سلیمانی جہانیاں (ملتان) کی ساٹھ سالہ زندگی کے متعدد واقعات، گوناگوں حادثات اور دلچسپ مشاہدات سے عبارت ہے۔ اس کتاب کا مسودہ کوئی چار پانچ سال سے غیر مطبوعہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔ حالانکہ حکیم صاحب سے میری قریب قریب روزانہ ہی ملاقات ہوتی ہے اور میں بسا اوقات اُس کی اشاعت کے لئے اصرار بھی کرتا ہوں لیکن پھر بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ میں بعض دفعہ اپنے آپ سے یہ سوال کیا کرتا ہوں کہ تم جو اپنی قریب ترین کتاب کو چھپوانے میں اتنے لمبے عرصے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے تو کیا حق حاصل ہے کہ تم ایسے لوگوں کی شکایت کرتے پھرو جو تم سے سینکڑوں میل دور بیٹھے ہوئے ہیں اور جن کے حالات کا تمہیں کوئی علم نہیں تو مجھے کوئی جواب نہیں سوجھتا۔

چھوٹے بچوں کی تربیت

یہ صدی "بچوں کا زمانہ" کہلاتی ہے مہذب دنیا نے بچے کی شخصیت کا احترام سکھایا ہے اور انسانی حقوق کے ساتھ ہم آج "بچوں کے حقوق" کا بھی اعلان کرتے ہیں۔ لیکن بچے کی تربیت کے معاملے میں عموماً ہمارا زور اس کے "مطالعے" کی طرف رہتا ہے۔ ہم [illegible] اعداد و شمار اکٹھا کرتے ہیں۔ مثلاً بچہ کتنا لمبا پیدا ہوتا ہے۔ پیدائش کے وقت ایک عام بچے کا وزن کیا ہوتا ہے۔ بچے کا [illegible] آٹھ ماہ سے قبل ہی نکل آتا ہے۔ ڈیڑھ سال کا بچہ پانچ لفظ بول لیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور اس طرح کی معلومات کے ذریعے ہم نے تمام بچوں کا حساب جوڑنا شروع کر دیا ہے۔ عام حیثیت کا بچہ کون کہلائے گا؟ بڑھیا کون ہے اور گھٹیا کون؟ اس قسم کی واقفیت حاصل کرنے سے بچے کو سمجھنے میں آسانی یقیناً ہوئی ہے اور مسلسل [illegible] کا رابطہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس طرح یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بچے کی نشوونما میں [illegible] موڑ کب آتے ہیں اور بچہ اپنی زندگی کی مختلف منزلیں کس شان سے طے کرتا ہے، ہر ایک دور میں اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور ہمیں اس سے کیا توقعات ہونی چاہئیں۔ اس لئے اگر دو تین سال کا بچہ "انکار کی منزل" میں پہنچ جاتا ہے۔ خواہ اس سے کیسی ہی پیار کی بات کیوں نہ کریں، وہ منع ہی کرتا ہے تو ہمیں ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا کیونکہ ہماری معلومات نے ہمیں باخبر کر رکھا ہے کہ بچے کی یہ بات اس کی عمر کا تقاضا ہے۔ اس خاص زمانے میں اسے ایسا ہی کرنا چاہیے کیونکہ عموماً سب بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن ان باتوں کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ہمارا یقین ہو گیا ہے کہ بچے کی ترقی، قطعی طور پر بندھی ٹکی ہوتی ہے۔ اس کی نشوونما میں قدرت کے قانون اپنا عمل دخل چلاتے رہتے ہیں۔ ہم ان اصولوں کو دیکھیں اور سمجھیں اور انہیں سرکاری قانون کی طرح مان لیں اور بس! اس معاملے میں گویا تعلیم و تربیت صرف سہولت پیدا کرتی ہے اور کچھ نہیں

ایسی صورت میں ہمارے اوپر لازم آتا ہے کہ بچے کی دلچسپیوں پر توجہ دیتے رہیں۔ اس کے حرکات و سکنات کا مطالعہ کرتے رہیں اور اپنے مطالعے کی روشنی میں ہر ایک بچے کو پہچانیں۔

لیکن بچے کو اس طرح سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کو اب زیادہ سراہا نہیں جا رہا ہے روز بروز اس کے اس بے تعلق جائزے کے بے جان پن کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ بچے سے محبت رکھنے والوں اور واقفیت پیدا کرنے والوں میں سے ایک جماعت کا خیال ہے کہ بچے کے بارے میں ہمارا مطالعہ اور اس کا دیدہ یا شنیدہ 'بیان' بذاتِ خود بچے کی طبیعت کی رنگینی، پیچیدگی اور انفرادیت کو پورے طور پر ظاہر نہیں کرتا۔ یہ واقفیت ہمیں صرف 'کیا ہے' تک پہنچاتی ہے 'کیوں ہے' کے جواب سے ہم پھر بھی محروم [illegible] ہیں۔ مثلاً ہم کہہ چکے ہیں کہ دو تین سال کا بچہ منع بہت کرتا ہے۔ وہ 'نہیں نہیں' کی رٹ لگا[illegible] ہے۔ لیکن کیا یہ ایک ضروری عمل ہے۔ کیا یہ بچے کی فطرت کا مطالبہ ہے یا پھر اس کے ماحول کا تقاضا بھی ہے۔ بچے کی طبیعت کی خصوصیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ والدین اور دوسرے متعلقین کا رویہ اس کے ساتھ کیا ہے۔ دراصل اس کے مزاج کی چاشنی، داخلی اور خارجی دونوں حالات سے تیار ہو رہی ہے۔ بچوں کے عمل کا بیان، 'صرف بیان' کافی نہیں ہے بلکہ اس کی معقولیت اور نامعقولیت کے بارے میں بھی ہمیں سوچنا ہوگا۔ بچے کا ایک مخصوص عمل، مناسب معقول یا نامعقول کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں۔ جیسے ہم نے کہا کہ بچے کا 'منع کرنا' مناسب اور معقول ہے کیونکہ دو تین سال کے سب بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ بچہ 'انکار' کرتا ہے اور بچی کم۔ ایسی صورت میں کیا ہم اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچی کے مقابلے میں بچہ زیادہ معقول ہے؟ اب اگر یہ مان بھی لیں تو ایک انکشاف اور ہوتا ہے۔ کچھ محققین کا ارشاد ہے کہ اونچے گھرانوں کا بچہ زیادہ 'انکار' کرتا ہے اور معمولی گھروں کی بچی۔ اب بتایئے کہ کس کا عمل زیادہ مناسب اور معقول ٹھہرائیں، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کی یہ 'نہیں نہیں' اپنے حالات کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ہر ایک سماج کے اپنے طور طریقے ہوا کرتے ہیں مزاج اور مذاق کا فرق بڑا نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے بچے کا عمل 'وقت' اور 'جگہ' کے تعلق کے

بچہ مناسب موزوں یا عام نہیں کہلایا جا سکتا ہے ہمیں بچے کو پہچاننے اور جاننے کے لئے اس کے 'ماحول' کو بھی دیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے شوق میں بچے کو صرف بدیسی لباس ہی نہیں پہناتے ہیں بلکہ اسے بدیسی بچوں کے عادات و اطوار کے پیمانوں سے ناپنے بھی لگتے ہیں۔ ہم نے غیر ملکی بچے کے حالات پڑھ کر جو ذہنی تصویر بنائی ہے، اسے اپنے نورِ نظر پر چسپاں بھی کرنا چاہتے ہیں اور اپنی نادانی میں اسی کا [illegible] اپنے جیتے جاگتے بچے کو دیکھنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں [illegible] لئے پہلی بات [illegible] ہے کہ ہم اپنے پیمانے خود بنائیں اور دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہم [illegible] ربط کے ساتھ ان پیمانوں کو برتیں۔ یہ پیمانے 'وقت' اور 'مقام' دونوں کے لحاظ [illegible] بچہ دہلی میں پلتا بڑھتا ہے اور دوسرا کسی معمولی قصبے یا گاؤں میں [illegible] دونوں بچوں کی بول چال اور رنگ ڈھنگ میں فرق لازمی ہے۔ اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ میرے بچپن [illegible] اسکول جانے والے بچے کے بچپن میں تیس سال کا زمانہ حائل ہے۔ اس لئے تیس سال پہلے [illegible] اندازہ آج کا عام [illegible] اور مناسب و معتدل رویے کا حساب لگا [illegible] بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ اس بنا پر بچوں کے [illegible] ہے [illegible] ہم اسے کسی ماحول سے مطابقت دے کر سمجھیں۔ ایک مغربی دیس کے بچے میں اور ہمارے بچے میں جو فرق ہے، وہ دراصل اس سماج کا ہے جس کے [illegible] بچے ہیں۔ اس لئے اس سماج اور تہذیب پر توجہ دینی ہوگی جو شروع سے ہی بچہ پاتا ہے۔ اگرچہ اس نظریئے میں بچے کی ترقی کے اصولوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا لیکن یہ نظریہ ان تعلقات پر زور دیتا ہے جن سے بچے کی زندگی وابستہ ہے۔ ہم اسی قدر اس معاملے میں دلچسپی رکھیں کہ دوسرے لوگ بچے کے ساتھ اور بچے کے لئے کیا کرتے ہیں، جس قدر ہمیں اس بات میں دلچسپی ہے کہ بچہ خود کیا کرتا ہے۔

نشو و نما کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ ایک متعینہ شکل میں بچہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہے بلکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو اپنے سماجی اور طبعی حالات کے تحت رونما ہوتا ہے۔ ایک بچہ کیا ہے اور وہ کیا کرتا ہے۔ اس کا انحصار حالات پر ہے لیکن کیا یہ نظریہ بچے کو ایک کھلونا

نہیں بنا دیتا ہے حالات بناتے، بگاڑتے ہیں؟ کیا اس کا سارا عمل محض حالات کی دین ہے؟ ہمارا جواب ہے "نہیں" ہمیں بچے اور اس کے ماحول، دونوں کو دیکھنا چاہیے۔ بچہ ایک ذی روح کی حیثیت سے کچھ صلاحیتیں اور استعداد رکھتا ہے۔ یہ بچہ کسی مخصوص سماج میں جنم پاتا ہے، اس کی ترقی، دونوں کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ اسے کچھ کرنے کا موقع ملے گا اور کچھ کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ وہ کچھ کرتا ہے، شاید تنہا چھوڑ دیا جاتا تو نہ کرتا۔ اس طرح وہ اپنے سماج کے طور طریقوں کو سیکھتا ہے اور آخر اپنے سماج کا ایک ذمہ دار رکن بن جاتا ہے۔ اس عمل میں بچہ، سیکھنے والا ہے اور اس کے والدین، اساتذہ اور ماحول کے دوسرے عناصر سیکھنے کا ذریعہ۔ لیکن اصل دشواری انتخاب کی پیش آتی ہے۔ بچے کے سامنے بہت سی چیزیں آتی ہیں۔ لیکن اسے اچھے، برے کی تمیز نہیں ہوتی اس لئے بچے کو اچھا ماحول اور مناسب محرکات دینے کی ذمہ داری سماج پر آتی ہے۔ ایک نرسری اسکول اسی ذمہ داری کو نبھانے کا ایک ذریعہ ہے

ہمارے دیس میں صدیوں سے "کنہیا کا بال پن" گایا جاتا ہے لیکن ہمارا بالک آج بھی گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم اپنے بڑوں کے لئے تو ایک اچھی سی کتاب چھاپ لیں، لیکن بچے کے لئے ایک اچھی کتاب کو فضول خرچی ہی سمجھتے ہیں۔ ہم نے دھرتی کے لال کو ہی مانا ہے اور اس کی ضرورتوں کو اس کی خاطر شاید ہی کبھی پورا کرنے کا خیال آتا ہو جب یہ لاڈ آ جاتا ہے تو اسے ضدی، اکل کھرا، تانا شاہ یا مرزا پھویا ہی بنا کر چھوڑتے ہیں ورنہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ وہ بیچارے جھگڑالو، اور رُدیّاں بنتے رہتے ہیں اور گھٹتے رہتے ہیں۔ ان کی تربیت کا کیا سوال۔ انہیں ہم اپنا تن پیٹ کاٹ کر کھلاتے تو ہیں، اور کیا چاہیے! لیکن یہ بات باعث اطمینان ہے کہ اب ہم چونک رہے ہیں اور ابتدائی مدرسے سے پہلے کی تعلیم پر توجہ دی جانے لگی ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں صرف اٹھائیس ہزار کے قریب یہ چھوٹے بچے تربیت پا رہے تھے لیکن پانچ سال بعد یہ تعداد پچھتر ہزار ہوگئی اور اب تین لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں پانچ ہزار 'بال واڑیاں' قائم ہیں جن میں سے تقریباً نصف مرکزی اور ریاستی سرکار سے امداد پاتی ہیں۔ اس تیسرے پنجسالہ قومی منصوبے میں بال سیوکاؤں

کی تربیت کے لیے چھ مرکزوں کا قیام طے پایا ہے۔ بچوں کی دیکھ ریکھ کے کاموں کے لیے مرکزی
حکومت نے تین کروڑ روپیہ منظور کیا ہے اور ایک کروڑ روپیہ ریاستوں کے پاس ہے۔ اس
کے علاوہ سماجی ترقی (کمیونٹی ڈولپمنٹ) اور سماج سیوا پروگرام (سوشل ویلفیر پروگرام) کے
اداروں کے وسائل بھی اس کام کے لئے موجود ہیں۔ ایسی صورت میں اب امداد کی کمی کا سوال
بہت اہم نہیں ہے۔ پہلے تو یہ کام صرف رضاکا[illegible] ہی انجام پاتا تھا۔ اب تو قومی حکومت
بہرحال دست گیری کر رہی ہے۔ اس وقت در[illegible] زیادہ ضرورت چھوٹے بچوں کی نگہداشت
کرنے والی بال سیوکاؤں کی تعلیم [illegible] کے جدید نقطۂ نظر کے پیش نظر
اس کے ماحول کی مطابقت اور اس کی ضرورت کے مطابق اس کے [illegible] فراہم کرنے کا
مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یوں تو ہم سب بچے کی زندگی میں کھیل کی اہمیت سے واقف ہیں لیکن اس
کی حیثیت اور نوعیت کا سوال کچھ کم ہی ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ ہم اول تو کھیل کی چیز کو بس
کھیل سمجھتے ہیں یعنی ناقابلِ توجہ اور اگر کسی قدر کرتے بھی ہیں [illegible]ر سے۔ سچ تو یہ
ہے کہ عموماً ہم بچے کو اپنی پسند کے مطابق کھیل کھلاتے ہیں اسے کھلونا دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ
ہماری خواہش کے مطابق اسے استعمال کرے۔ آپ نے غالباً ایسے بھی محتاط والدین دیکھے ہوں گے
جو بچوں کے کھلونوں کو بہ حفاظتِ تمام سجا کر رکھتے ہیں اور بچوں کو ان سے کھیلنے نہیں دیتے انہیں
کھلونے کے ٹوٹنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور بچے کے دل کو ٹھیس پہنچانے وقت ذرا تامل نہیں کرتے
وہ اس بات پر خفا ہوتے ہیں کہ بچے نے ایک قیمتی کھلونا توڑ ڈالا۔ گویا ان کے نزدیک بچے نے
کوئی نہایت ہی نامعقول کام کیا ہے۔ غالباً بچے کے لئے لازم تھا کہ اس کھلونے کو محفوظ رکھتا اور
پچیس تیس سال بعد ایک بڑے منافع کے ساتھ اسے فروخت کرتا۔ غرضیکہ ہم بچے کے کھیل اور کھلونے
کے بارے میں تجاہل اور تغافل دونوں ہی کا شکار ہیں۔ ہمارے نرسری اسکول اس طرف توجہ تو ضرور
کرتے ہیں لیکن عموماً ان کے پاس انمل بے جوڑ بدیسی سامان زیادہ نظر آتا ہے۔ اس بنا پر اس سامان
کی حیثیت بہت کچھ نمائشی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے اس معاملے میں خاص توجہ کی ضرورت ہے
چھوٹے بچوں کی ضروریات اور ان کے مطابق کھیل کا سامان فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش ہونی

چاہیے۔ جامعہ نرسری اسکول میں برابر کوشش ہوتی رہی ہے کہ بچوں کا تربیتی سامان مقامی طور پر تیار رہے۔ اس طرح ایک طرف لاگت بھی کم آتی ہے اور دوسری طرف سامان اپنی ضرورت کے مطابق تیار ہوتا ہے۔ اس معاملے میں اگرچہ ہم نے دوسرے ممالک کی چیزوں کو پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنایا ہے لیکن ان کے رنگ روپ میں آپ کو خانہ سازی کی سادگی کے ساتھ ساتھ افادیت کا پہلو بھی نظر آئے گا۔

ہماری خواہش ہے کہ آپ سب اس معاملے میں ہمیشہ مشورہ دیں۔ ہمارا خیال ہے کہ چھوٹے بچوں کے لئے تربیتی سامان کے مقامی مرکز کھلنے چاہئیں اور ان کی رہنمائی کے لئے ہمارے ماہران تعلیم قدم اٹھانا چاہیے۔ نرسری اسکول کے اندر ہم تربیتی سامان کو نہ صرف ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اسی کو کافی بھی خیال کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا یقین رہا ہے کہ بچے کو اس منزل پر باقاعدہ پڑھانے لکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کھیل کود اور ذہنی بیداری کے لئے مناسب سامان ذمہ داری کے ساتھ دیا گیا تو بچے کی ذہنی ترقی بخوبی ہو سکے گی اور وہ اپنی عمر کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو یقیناً بیدار کر سکے گا۔ لیکن ہمارا یہ احساس ان احباب کو گراں گزرتا ہے جو بچے کی انگلی پکڑ کر اسے ناک کی سیدھ لے جانا چاہتے ہیں تاکہ زندگی کی مسافت کم سے کم طے کرنی پڑے۔ ان کے نزدیک نرسری اسکول کا زمانہ تضیعِ اوقات کی حیثیت رکھتا ہے۔ کھیل کود اور دوسرے مشغولوں میں بلا وجہ بچے کا قیمتی وقت خراب کیا جاتا ہے۔ اسے جلد سے جلد کتاب خواں، اور حساب داں بنانا چاہیے۔ سیدھی سی بات ہے جس قدر جلد بچہ نقلِ مکتب بنے گا، اسی قدر پہلے فارغ التحصیل ہوگا۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ بات نہ حقیقت اندیشی ہے اور نہ دور اندیشی۔ نرسری اسکول میں بچے کی بے ضابطہ تربیت، اس کی صلاحیتوں کے ابھارنے میں زیادہ مددگار ہوگی اور ابتدائی مدرسے کی تعلیم کے لئے وہ زیادہ موزوں طور پر تیار ہو سکے گا۔ ہمارے اس مدرسے میں ایک ہی بستی کے بچے آتے ہیں اور قریب قریب سب کا تہذیبی سرمایہ یکساں ہے۔ ہم نے ان کی ضرورتوں کے مطابق ہی اس مدرسے کو بنانے کی کوشش کی ہے۔ غالباً ہماری یہ روش، بچے کی تربیت میں ماحول کی مطابقت پر زور دینے والوں کو پسند آئے گی۔

(یہ مضمون جامعہ نرسری اسکول کے سمینار میں پڑھا گیا)

تنقید و تبصرہ

فرانسیسی ادب

مولفہ : ڈاکٹر یوسف حسین خاں

تبصرہ نگار: [redacted] اسلوب احمد انصاری

اس کتاب میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے فرانسیسی ادب کا تاریخی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب [redacted] ابواب پر [redacted] ہے۔ خاص خاص نشاناتِ راہ یہ ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں فرانسیسی ادب کی ابتدا، کلاسیکی ادب کی ابتداء اور انتہا، اٹھارھویں صدی کا ادب، انیسویں صدی میں [redacted] کے مختلف فارم خصوصاً ناول اور تنقید کا ظہور یا ارتقا اور [redacted] دبستانِ شاعری، بیسویں صدی میں شاعری، ڈراما اور ناول کا ارتقاء، اور [illegible] کی وجودیت۔ ادبی تاریخ کے موجودہ رجحان کے مطابق اس کتاب میں زور تاریخی سلسلہ داری پر نہیں، بلکہ ذہنی ارتقاء کے دھاروں پر ہے۔ فرانسیسی ادب، زبان اور ادب کی ابتداء کے بارے میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہ خیال ہوتا ہے، کہ کم و بیش تمام ممالک میں ادب کا آغاز ایک ہی طرح کے عوامل کی پیداوار ہوتا ہے۔ قدیم ترین انگریزی ادب جسے اینگلو سیکسن ادب کہتے ہیں، اور بعد میں درمیانی دور کے انگریزی ادب پر بھی عرصہ تک غیر ملکی ثقافتی اور لسانی موثرات کا غلبہ رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اندرونی اور قومی رجحانات اور تقاضوں نے قوت پکڑی، اور چاسر کے عہد میں جدید انگریزی زبان اور ادب کے خط و خال ایک طور سے متعین ہو گئے۔

صفحہ ۳ پر مصنف کا یہ خوشگوار انکشاف قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے، کہ اسلامی فتوحات کے زیر اثر، جو قرونِ وسطیٰ میں فرانس کی سرحد تک پہنچ چکی تھیں، پروونسال کی غنائی شاعری جسے گیارہویں اور بارہویں صدی میں فروغ حاصل ہوا، عربوں کے شعری مزاج کا اثر واضح ہے یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ قرونِ وسطیٰ میں انگریزی غنائی شاعری براہِ راست فرانسیسی شاعری کی مرہونِ منت ہے۔ اور یہ اثر شعری روایات اور اسالیب دونوں میں یکساں نظر آتا ہے۔

اس تفصیلی تاریخی جائزہ کے سلسلہ میں فرانسیسی تہذیب اور ادبی روایات کے بعض دلچسپ پہلو سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک ان دیوان خانوں کا وجود ہے، جہاں علم و ادب کی صحبتیں منعقد کی جاتی تھیں۔ ان میں مصنف کے بیان کے مطابق میدموزیل دے سابلے، میدموزیل دے اسکو دری، میدموزیل سکاارن اور میدموزیل دے مینتونتیوں کے دیوان خانے خاص طور پر مشہور ہوئے۔ ان دیوان خانوں میں جو اعلیٰ خاندانوں کی خواتین کی ملکیت تھے، اکابر جمع ہوتے، علم و فضل کا چرچا ہوتا، اور علمی و ادبی مذاکروں سے فکری اور تخیلی صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا [illegible] دوسری اہم چیز فرانسیسی اکیڈمی کا قیام ہے، جس کے ذریعہ نہ صرف اہل علم و ادب کے کمالات کا اعتراف کیا جاتا تھا، بلکہ خود علمی و ادبی رجحانات اور فیصلوں کو بھی ایک مشترکہ بنیاد [illegible] عام حاصل ہو [illegible]

اس کتاب میں مصنف کا طریق عمل یہ ہے کہ [illegible] نے ادبی ادوار کو پوری ذہنی اور سماجی زندگی کے آئینہ میں رکھ کر دیکھا ہے، اور انھیں محض کتابوں یا مصنفوں کی رائے شماری تک محدود نہیں کیا ہے۔ پھر ہر دور کے خاص خاص لکھنے والوں کی اہم تصانیف پر کسی قدر تفصیل اور نسبتاً کم اہم پر اختصار کے ساتھ، اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے فکری اور تخیلی میلانات پر عمومی تبصرہ کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے، کہ تاریخی جائزہ میں ایک ایک تصنیف یا کسی ایک مصنف پر سیر حاصل بحث کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی۔ اس کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی بعض مباحث کے سلسلہ میں کسی قدر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً قرون وسطیٰ میں فرانسیسی ادب کی جو روایات تھیں، اور جو بڑی حد تک فرانسیسی اور انگریزی ادب میں مشترک ہیں، ان کا مصنف نے ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح اس عہد میں ان رومانی کارناموں کا جنھیں (ROMANCES) کہا جاتا ہے اور جو اس ادب کا ایک قابلِ ذکر حصہ ہیں، مصنف نے کوئی خاص ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح موپاساں کا ذکر بہت سرسری طور سے کیا گیا ہے حالانکہ مختصر کہانی کے فن کے معماروں میں اس کا نام سرفہرست ہے۔ اسی طرح رمزیت (SYMBOLISM) کی تحریک، جو ایک معنی میں رومانیت کی توسیع ہے، اور جس کا اثر جدید انگریزی شاعری پر گہرا اثر پڑا ہے، کسی قدر تفصیلی تعارف کا مطالبہ کرتی تھی۔ جدید فرانسیسی ادب کے سلسلہ میں عام طور پر اور جدید ڈرامہ پر خاص طور سے،

اگر مصنف پڑھنے والوں کو اور زیادہ اطلاع بہم پہنچاتے، تو ایک بڑی ادبی خدمت ہوتی۔

ایسے پڑھنے والوں کے لئے جو فرانسیسی سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ہی انگریزی اور اردو ادب سے بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ مماثلت دلچسپی سے خالی نہیں جو ان تینوں زبانوں کے بعض مصنفین کے درمیان پائی جاتی ہے، اور جس کا اس کتاب کو پڑھنے کے دوران میں اکثر خیال آتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۷۹ پر مصنف نے اردن فوکر کا یہ قول نقل کیا ہے۔ "اگر ہم اپنے جذبات پر قابو پالیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے جذبات کمز [illegible] یہ کہ ہم میں ایسا کرنے کی قوت تھی"۔ مصنف نے توارد ذہنی کو ثابت کرنے کے لئے عرفی کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی شاعر ولیم بلیک کا یہ قول بھی سامنے رکھئے [illegible]

THOSE W[illegible] RESTRAIN DESI[illegible]
DO SO BEC[illegible]UGH TO BE RESTRAINED

اسی طرح الفرد دے دنی کے بارے میں صفحہ ۲۰ [illegible] ہے "وہ اپنے جذبے کو تصور کی شکل میں اور تصور کو رمز کی شکل میں تحلیل کر دیتا تھا۔ اس کے یہاں فنی تخلیق ریاضت چاہتی تھی"۔ اس بیان کو پڑھ کر ذہن فوراً سترھویں صدی کے ان انگریزی شاعروں کی طرف منتقل ہوتا ہے، جو عام طور پر مابعدالطبیعیاتی شاعر کہلاتے ہیں اور جن کا [illegible] تھا، کہ وہ مختلف النوع جذبات کیفیات اور تصورات کو ایک ہم آہنگ وجود میں سمو سکتے تھے، اور رمز بیج (   ) سے کام لیتے تھے۔ اسی طرح استاں دھال کے بارے میں مصنف نے صفحہ ۳۴۰ پر لکھا ہے: "استاں دھال کے سامنے نپولین کی غیر معمولی توانائی اور قوت عمل کا نمونہ تھا۔ جو اس کے تخیل کے روبرو نصب العین کے طور پر تھا، جس کو عمل میں سب سے زیادہ مسرت ملتی تھی۔ استاں دھال توانائی اور قوت کے مظاہر کو سراہتا تھا..... استاں دھال کے کرداروں کے سمجھنے کے لئے قوت و توانائی کے اصول کو سمجھنا ضروری ہے"۔ ان جملوں کو پڑھ کر معاً اقبال کا خیال آتا ہے، کیونکہ وہ بھی قوت اور توانائی کے اصول کے پرستار تھے، اور مسولینی کے لئے اپنے دل میں جذبۂ ستائش رکھتے تھے۔ اس طرح صفحہ ۳۹۵ پر مالرو کے بارے میں یہ جملے ملتے ہیں: "مالرو کا خیال ہے کہ اعلیٰ درجہ کی فنی تخلیق بغاوت کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ اس بغاوت کے بطن سے خیال اور عمل کی ندرت جنم لیتی ہے، اگر یہ نہ ہو،

ز تخلیقی آزادی طلب ہو جائے، جو فنونِ لطیفہ اور ادب کی جان ہے۔" ان جملوں کو پڑھ کر ذہن اقبال کی ضربِ کلیم کی ان نظموں کی طرف منتقل ہوتا ہے، جو "فنونِ لطیفہ" کے عنوان کے تحت درج کی گئی ہیں۔

اس کتاب میں جامعیت، نظر کی گہرائی، اور مطالعہ کی وسعت کا ثبوت جگہ جگہ ملتا ہے۔ مصنف نے جتنے بڑے رقبہ کو اس کتاب میں سمیٹا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ بات حیرت انگیز ہے کہ نہ کہیں تکرار اور اعادہ ہے اور نہ کہیں استدلال میں کمزوری پیدا ہوئی ہے۔ تاریخی مواد اور حقائق کو معروضی نقطۂ نظر سے پرکھا گیا ہے، اور انھیں کہیں بھی گھٹا بڑھا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کے باوجود اندازِ بیان کی شگفتگی اور دل نشینی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ مصنف نے مختلف لکھنے والوں کے بارے میں جو رائیں قائم کی ہیں، وہ مدلل اور محتاط ہونے کے ساتھ ہی وسعتِ نظر اور شادابیٔ ذہن [redacted] فراہم کرتی ہیں۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی [redacted] کے بارے میں صفحہ ۱۵۲ [redacted] پر لکھتے ہیں:

"وہ یونانی تاریخ اور دیومالا سے جب اپنی شخصیتیں منتخب [redacted] در اصل وہ اپنے جذبے اور تخیل کو ایک وسیع تر بصیرت کا جز بنانا چاہتا ہے۔ اور شعر و نغمہ کے ذریعہ ان پیکروں میں جان ڈال دیتا ہے۔ اس کی نفسیاتی حقیقت پسندی اس کی شاعرانہ بصیرت میں ضم ہو جاتی ہے۔ تب کہیں جا کر اس کے المیہ کی تخلیق ہوتی ہے۔"

وکٹر ہیوگو کے متعلق صفحہ ۲۹ پر یہ جملے ملتے ہیں:

"وہ لفظوں کی تلاش خراش اور انتخاب پر بڑی محنت کرتا تھا۔ اتنی محنت شاید [redacted]سی دوسرے رومانی مصنف نے نہ کی ہوگی۔ لیکن وہ بیچارہ کیا کرے۔ اس کے اشارۂ ابرو پر لفظوں کے قافلے کے قافلے کبھی صف بندی کے ساتھ اور کبھی خود ہی بے ترتیب حالت میں اس کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے تھے، اور اپنی اپنی خدمات پوری عقیدت اور خلوص کے ساتھ پیش کرتے تھے۔"

میوسے کے بارے میں صفحہ ۲۰۶ پر لکھتے ہیں:

"اس کی شاعری ایک مکالمہ معلوم ہوتی ہے، جس میں اس کی روح کا اہتزاز صاف

سنائی دیتا ہے۔ اس مکالمہ میں ذاتی جذبات اور احساسات، خارجی تاثرات سے مل کر اپنا رنگ نکھارتے ہیں، اور اس کی خود رفتگی اور ربودگی کے لئے سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ وہ اپنی روح کی گہرائی میں خارجی حقیقت کی قلب ماہیت کر کے جو تخیلی پیکر تخلیق کرتا ہے، ان کی تازگی میں حقیقت کی خوشبوئیں بسی ہوئی ہوتی ہیں۔"

ایک دلچسپ سوال جو فرانسیسی ادب کا مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، یہ ہے کہ ہم فرانسیسی ذہن کو کلاسیکی کہیں گے یا رومانی؟ غالباً اس سوال کا کوئی قطعی جواب ممکن نہیں۔ فرانسیسی نثر کا جب ہم بحیثیت مجموعی جائزہ لیتے ہیں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ یہ نثر کی بنیادی خوبیوں، جیسے نظم و ضبط، تقلیل الفاظ اور منطقی ترتیب اور خیال اور بیان کے درمیان گہری مطابقت سے پوری طرح آراستہ [redacted] یا آرائش کی بجائے محاکمہ اور تنقید کی زبان [redacted] اعتراف کرنا بھی [redacted] کہ قرون وسطیٰ سے لے کر آج تک جن جن تحریکوں [redacted] رہی ہے، ان سب کا سرچشمہ بھی فرانس ہی کی سرزمین رہی ہے۔ اس [redacted] اصلاح مذہب کی تحریک کو بھی یہاں کافی فروغ نصیب ہوا، اور انقلاب فرانس [redacted] وہ سیاسی اور سماجی اداروں کے خلاف سب سے زیادہ بلند بانگ احتجاج تھا، یورپ کے ممالک میں آزادی کا صور پھونک دیا۔ ان سب تحریکوں [redacted] اصل رومانیت ہی سے ملتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا، کہ ذہنی احتجاج کی لہر اور تجربہ کی بے چین خواہش، جیسی فرانس کے اہل علم و عمل میں تیز رہی ہے، اتنی شاید انگلستان اور جرمنی میں بھی نہ رہی ہو۔ معمولاً بھی فرانسیسی قوم انگریزوں کے مقابلہ میں زیادہ حریت پسند اور تلون آشنا رہی ہے۔ اس لئے ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے، کہ فرانسیسی مزاج در اصل رومانیت کے عناصر ترکیبی سے نسبتاً زیادہ ہم آہنگ ہے۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے، ادبی تاریخ، تنقیدی مطالعہ کا بدل نہیں ہے۔ اور اس لئے ادبی تاریخ نگار موضوع کی گہرائیوں میں نہیں جا سکتا۔ ادبی تاریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ

اور قاری ذہنی اور تخیلی تسلسل کا احساس دلاتے۔ ظاہر ہے کہ یہ تسلسل خلا میں پرورش نہیں پاتا، بلکہ ٹھوس اور معروضی حالات کے چوکھٹے میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ انفرادی ادبی کارنامے تاریخ بناتے بھی ہیں، اور پچھلے کارناموں کے بعض عناصر کو غیر شعوری طور پر اپنے اندر جذب بھی کرتے ہیں۔ اس لئے تاریخی جائزہ محض الگ الگ کارناموں کا جائزہ نہیں، بلکہ عوامل روایات اور فکری اور فنی اسالیب اور اقدار کا جائزہ بھی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے جو تاریخ داں اور ادیب، دونوں حیثیتوں سے معروف ہیں، ادبی واقعات اور حقائق کو تاریخی پس منظر میں رکھ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو زبان میں غیر زبانوں کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، ان میں اس کتاب کے علاوہ صرف پروفیسر محمد مجیب کی کتاب روسی ادب جو دو حصوں میں انجمن نے شائع کی تھی [illegible] ہے۔ فرانسیسی ادب کی یہ تاریخ اردو ادب کے محدود سرمایہ میں ایک بہت ہی گراں [illegible]۔ انگریزی زبان کی وساطت سے فرانسیسی ادبی تحریکات کا [illegible] پر بھی بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ ایک بڑی اور گراں مایہ زبان کے شاہ کاروں سے واقفیت حاصل کرنے اور اپنے طور پر انگریزی اور اردو زبانوں کے ادب اور شاعری پر ان کے تخلیقی اثرات [illegible] نکالنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

کتاب ٹائپ میں شائع ہوئی ہے، ۵۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور انجمن ترقی اردو (ہند) [illegible] گاہ سے تیرہ روپے میں مل سکتی [illegible]

سیاسی نظریے ——— افلاطون اور ارسطو

سائز: [illegible] حجم ۲۰۴، کتابت وطباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش۔
قیمت چار روپے۔ تاریخ طباعت: جون ۶۲ ۔ ناشر: قومی کتاب گھر، دیوبند
ضلع سہارنپور (یو۔ پی)

پیش نظر کتاب میں افلاطون اور ارسطو کے سیاسی خیالات اور نظریے کو اس طرح پیش

کیا گیا ہے کہ اس زمانے کی تہذیب و تمدن پر بھی ایک سرسری نظر پڑ جاتی ہے۔ مؤلف اس نہج پر دو کتابیں اور لکھ رہے ہیں، پہلی میں عہد اوسطہ کے ممتاز مفکرین کے اور دوسری میں عہد جدید کے سیاسی مفکرین کے افکار اور نظریات سے بحث کی جائے گی۔

مؤلف اردو کے اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں، ان کا طرز بیان دلکش اور زبان صاف ستھری ہوتی ہے، اس لئے یہ کتاب جہاں عام پڑھنے والوں کے لئے کارآمد ہے، وہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علموں کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوگی، اس لئے نصاب تعلیم میں شامل کیا جاسکتا ہے اور پبلک لائبریریوں کے لئے منظور کیا جاسکتا ہے۔

نگار (رام پور) اڈیٹر: اکبر علی خاں

اردو صحافت میں نگار (لکھنؤ) کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور اس کامیابی میں تمام تر جناب نیاز فتحپوری کی ہمہ گیر شخصیت کا دخل ہے۔ پچھلے سال کچھ نامعلوم اسباب کی بنا پر نیاز صاحب پاکستان چلے گئے، اس وقت سے ان کا نگار بھی کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ جنوری ۶۳ء سے جناب اکبر علی خاں صاحب نے رام پور سے نگار نکالا ہے اور اعلان کیا ہے کہ "نگار لکھنؤ سے رام پور آگیا ہے" چنانچہ جلدوں کا شمار نیاز کے نگار ہی سے کیا گیا ہے۔ مگر ظاہر ہے نگار کی جو خصوصیات نیاز صاحب کی جودت طبع کی رہین منت تھیں وہ محض جلدوں کے تسلسل سے پیدا نہیں ہوسکتیں لیکن اب تک جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں ان کی بنا پر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ رام پور کا نگار بھی اردو ادب میں ایک مخصوص جگہ بنالے گا۔

پہلے شمارہ کے ملاحظات میں لکھا گیا ہے کہ "نگار نے بڑے معرکے کے سالنامے نکالے ہیں۔ ابھی اس نے ایک پروگرام بنایا ہے جس کے تحت بڑی اہم شخصیتوں اور موضوعات پر خاص نمبر ترتیب دئے جائیں گے" چنانچہ اب ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر کا اعلان کردیا گیا ہے۔ نگار کی گذشتہ روایات سے قطع نظر ہم اس تجویز اور فیصلہ کا مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ رام پور کا نگار اپنا ایک الگ معیار قائم کرے گا۔

(ع ل ا)

کوائف جامعہ

نئے امیر جامعہ — جناب ڈاکٹر ذاکر حسین

جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک سیاسی پر آشوب زمانے میں قائم ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے بانیوں کے ارادے نیک تھے، ان کی نیتیں مخلصانہ تھیں، ان کے عزائم بلند تھے اور وہ جامعہ کو مسلمانوں کی ایک شاندار اور عظیم الشان یونیورسٹی کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ان کے چند ساتھی جامعہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں نہ لیتے تو جامعہ کا آج شاید وجود ہی نہ ہوتا۔ نیز ذاکر صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسے سیاست کی تنگ ڈگر سے ہٹا کر تعلیم کی وسیع شاہراہ پر لگایا، اور اسے نئی تعلیم کی تجربہ گاہ اور قومی تعلیم کا مرکز بنایا۔ [redacted]

جامعہ سے یوں تو ذاکر صاحب کا تعلق اول دن سے ہے، مگر جرمنی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۲۶ء میں واپس آئے تو کم از کم بیس سال تک (یا تا حیات ان میں سے جو زیادہ ہو) جامعہ کی خدمت کا عہد کیا اور شیخ الجامعہ کی حیثیت سے اس کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھالی اور پورے استقلال اور عزم کے ساتھ کوئی ربع صدی تک انتہائی نامساعد حالات میں اس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں بعض بزرگان قوم کے مشورہ اور اپنے ساتھیوں کی اجازت سے انتہائی نازک زمانے میں مسلم یونیورسٹی کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس وقت سے، اگرچہ دلی تعلق باقی رہا اور ان کے جانشین پروفیسر محمد مجیب صاحب کو ان کا تعاون حاصل رہا، مگر ظاہری تعلق منقطع ہو گیا تھا۔

اب جبکہ جامعہ کا قدیم خواب پورا ہوا، اسے یونیورسٹی کی حیثیت حاصل ہوئی اور خدمت کے مواقع پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہو گئے تو ہمیں خوشی ہے کہ ان کا براہِ راست تعلق پھر قائم ہو گیا ہے۔

[redacted]

کیا گیا ہے کہ اس زمانے کی تہذیب ...
اور لکھ رہے ہیں، پہلی میں عہد اوسط کے ممتاز مفکر ...
افکار اور نظریات سے بحث کی جائے گی۔
مؤلف اردو کے اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں، ان کا طرز ...
ہوتی ہے، اس لئے یہ کتاب جہاں عام پڑھنے والوں کے لئے کارآمد ہے
کے طالب علموں کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوگی۔ اس لئے نصاب تعلیم میں
اور پبلک لائبریریوں کے لئے منظور کیا جاسکتا ہے۔

نگار (رام پور)　　　　اڈیٹر: اکبر علی خاں

اردو صحافت میں نگار (لکھنؤ) کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور اس کامیابی میں تمام تر نیاز فتحپوری کی ہمہ گیر شخصیت کا دخل ہے۔ پچھلے سال کچھ نامعلوم اسباب کی بنا پر نیاز صاحب پاکستان چلے گئے، اس وقت سے ان کا نگار بھی کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ جنوری ۶۳ء سے جناب اکبر علی خاں نے رام پور سے نگار نکالا ہے اور اعلان کیا ہے کہ "نگار (لکھنؤ) سے رام پور آگیا ہے" ... کے نگار ہی سے کیا گیا ہے۔ مگر ظاہر ہے نگار کی جو خصوصیات نیاز صاحب کی جودت طبع کی ... وہ محض جلدوں کے تسلسل سے پیدا نہیں ہوسکتیں لیکن اب تک جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں ان کی بنا پر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ رام پور کا نگار بھی اردو ادب میں ایک مخصوص جگہ بنالے گا۔

پہلے شمارہ کے ملاحظات میں لکھا گیا ہے کہ "نگار نے بڑے معرکے کے سالنامے نکالے ہیں۔ اب اس نے ایک پروگرام بنایا ہے جس کے تحت بڑی اہم شخصیتوں اور موضوعات پر خاص نمبر ترتیب دئے جائیں گے۔" چنانچہ اب ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر کا اعلان کردیا گیا ہے۔ نگار کی گذشتہ روایات سے قطع نظر ہم اس تجویز اور فیصلہ کا مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ رام پور کا نگار اپنا ایک الگ معیار قائم کرے گا۔

(ع ل ا)

[illegible] ذاکر [illegible]

[illegible] اسلامیہ [illegible] تو ب زمانہ [illegible] قائم ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ [illegible] نیتیں مخلصانہ تھیں، ان کے عزائم بلند تھے اور وہ [illegible] یونیورسٹی کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی [illegible] اور ان کے چند ساتھی جامعہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں نہ لیتے تو جامعہ کا آج شاید وجود ہی نہ ہوتا، نیز ذاکر صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے [illegible] سیاست کی تنگ [illegible] سے ہٹا کر تعلیم کی وسیع شاہراہ پر لگایا، اور اسے نئی تعلیم کی تحریک [illegible] قومی تعلیم کا مرکز بنایا۔

[illegible] کا تعلق اول دن سے ہے، مگر جرمنی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے [illegible] کم بیس سال تک (یا تاحیات ان میں سے جو زیادہ ہو) جامعہ [illegible] شیخ الجامعہ کی حیثیت سے اس کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھالی اور پورے [illegible] ربع صدی تک انتہائی نامساعد حالات میں اس کی خدمت انجام دی ہے۔ [illegible] بزرگان قوم کے مشورہ اور اپنے ساتھیوں کی اجازت سے انتہائی نازک وقت میں مسلم یونیورسٹی کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس وقت سے، اگرچہ دلی تعلق باقی رہا اور ان کے جانشین [illegible] پروفیسر محمد مجیب صاحب کو ان کا تعاون حاصل رہا، مگر ظاہری تعلق منقطع ہو گیا تھا۔ اب [illegible] جامعہ کا قدیم خواب پورا ہوا، اسے یونیورسٹی کی حیثیت حاصل ہوئی اور خدمت کے مواقع [illegible] وسیع ہو گئے تو ہمیں خوشی ہے کہ ان کا براہ راست تعلق پھر قائم ہو گیا۔

جامعہ کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو یہ سن کر یقیناً بڑی خوشی ہوگی کہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ابھی حال میں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو امیر جامعہ (چانسلر) منتخب کیا ہے اور موصوف نے جامعہ سے غایت محبت کی بنا پر اسے قبول فرمالیا ہے۔ یہ جامعہ کی انتہائی خوش قسمتی اور اس کے لئے فال نیک ہے کہ اسے ذاکر صاحب جیسے مخلص اور ماہر تعلیم کی خدمات حاصل ہوئیں۔

نئے خازن جامعہ —— جناب بشیر حسین زیدی

دوسری خوش کن خبر یہ ہے کہ جناب کرنل بشیر حسین زیدی جامعہ کے خازن مقرر ہوئے ہیں زیدی صاحب کا جامعہ سے ایک طویل عرصے سے گہرا تعلق رہا ہے اور موصوف نے بعض نہایت نازک مواقع پر جامعہ کی بڑی گراں قدر مدد فرمائی ہے۔ موصوف کافی عرصے تک ریاست رامپور کے وزیر اعظم اور کوئی سات سال تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں قومی کاموں سے ہمیشہ تعلق رہا ہے اس لئے امید ہے کہ موصوف کے انتخاب سے موجودہ نئے حالات میں جامعہ کو بیش از بیش فائدہ پہنچے گا۔

ماہنامہ تعلیم و ترقی کا خاص نمبر

مرحوم شفیق الرحمن صاحب قدوائی نے تعلیم بالغان کی ترویج و اشاعت کے لئے ادارۂ تعلیم و ترقی کی بنیاد رکھی تو کچھ عرصے کے بعد ادارہ کے نام پر اس کے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا۔ شروع میں صرف اردو میں نکلتا تھا، مگر ملک کی ضرورت کے پیش نظر اب ہندی میں بھی شائع ہوتا ہے۔ آج کل اس کے ایڈیٹر جناب برکت علی فراق اور جناب رفیق محمد شاستری ہیں۔ مارچ ۶۳ء میں اس کا سالنامہ شائع ہوا ہے جس میں اختصار کے ساتھ جامعہ ملیہ کی تاریخ اور ارتقا پر اور تفصیل کے ساتھ ادارۂ تعلیم و ترقی کے مقاصد اور اس کے نشو و نما پر روشنی ڈالی گئی ہے جو لوگ بالغوں کی تعلیم کے متعلق جامعہ کے تجربات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اس خاص نمبر کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ اس پرچے کی قیمت دو روپے اور سالانہ چندہ چار روپے ہے۔ ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے خرید اجا سکتا ہے۔

(ع ل ا)

جوش نمبر

جیسی یادگار، بے مثال اور عدیم النظیر پیش کش کے بعد

افکار

ابوالاثر حفیظ جالندھری کی گراں مایہ خدمات کے اعتراف میں

حفیظ نمبر

اگست سنہ ۱۹۶۳ء میں

پیش کرنے کا اعلان کرتا ہے

جوش نمبر کی طرح حفیظ نمبر بھی گذشتہ نصف صدی کی ایک مستند ادبی دستاویز ہوگا

سالانہ ممبر - ۱۴ اگست تک بارہ روپے زر سالانہ بھیج کر یہ عظیم و منفرد پیشکش **نصف قیمت** میں حاصل کر سکتے ہیں

حفیظ نمبر کے بعد "افکار نمبر"، "فیض نمبر" اور "کرشن چندر نمبر" پیش کر رہا ہے۔

ایجنٹ حضرات "حفیظ نمبر" کے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں

مکتبۂ افکار - رابسن روڈ، کراچی

بھارت کے خریدار حضرات ذیل کے پتہ پر زر سالانہ بھیج کر رسید منی آرڈر ہمیں روانہ کر دیں۔

سلمیٰ صدیقی - گورو نواس - پندرھویں روڈ - کھار بمبئی ۵۲

طابع و ناشر عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ یونین پریس دہلی — ٹائٹل: دیال پریس دہلی



جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۹	بابت ماہ اگست ۱۹۶۳ء	شمارہ ۲

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب — ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ — ضیاء الحسن فاروقی

عبداللطیف اعظمی (مرتب)

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

لطف اللہ کی آٹوبیوگرافی

جناب ضیاء الحسن فاروقی

لطف اللہ (۱۸۰۲ -) نے اپنے سوانح حیات قلم بند کیے جسے ۱۸۵۷ء میں پہلی بار لندن کے پبلشرز اسمتھ ایلڈر اینڈ کمپنی نے "آٹوبیوگرافی آف لطف اللہ، اے محمڈن جنٹلمین" کے عنوان سے شائع کیا، اس کتاب کو ایڈورڈ بی، ایسٹ وِک، ایف، آر، ایس۔ ایف، ایس، اے نے ایڈٹ کیا اور ایک مختصر سا دیباچہ بھی لکھا، کتاب کا سائز چھوٹا ہے اور صفحات کی تعداد ۴۳۵ ہے اور اس میں ۱۸۴۴ء تک کے حالات درج ہیں۔

دیباچہ میں ایسٹ وِک نے مصنف کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ متعصب نہیں ہے لیکن اپنے ہم مذہب اور مذہبی اصولوں کو بہتر تصور کرتا ہے، جن چیزوں کو اہل یوروپ ترقی سے تعبیر کرتے ہیں انھیں ہندوستانی عام طور پر پسند نہیں کرتے، لطف اللہ کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے، ہاں، بیشتر لوگوں کی طرح وہ ان کا اتنا شدید مخالف نہیں ہے، دیباچہ لکھنے والے نے اس کی صحیح انگریزی کی تعریف بھی کی ہے اور کہا ہے کہ اگر مصنف کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے مصنف کی تعریف ضرور کریں گے کہ اس نے ایک بدیسی زبان میں اتنی ضخیم کتاب لکھی۔

لطف اللہ نے انگریزی اپنے شوق اور محنت سے خود سیکھی، وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں اور افسروں کو ہندوستانی، فارسی اور مرہٹی سکھلاتے تھے اور بہت کامیاب استاد سمجھے جاتے تھے۔ ان کے انگریز شاگردوں کی تعداد سو سے اوپر تھی، اور اکثر یہی معلمی ان کی گزراوقات کا ذریعہ ہوتا تھا، اس لئے کچھ تو اپنے شاگردوں کی زبان سے واقف ہونے کی ضرورت اور کچھ اپنے شوق سے انھوں نے اس مشکل زبان کو اپنے ذاتی مطالعے سے کوئی آٹھ سال کی مدت میں سیکھ لیا۔

اس سلسلہ میں انھیں ڈاکٹر گلکرسٹ کی قواعد کی کتابوں سے بہت مدد ملی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ آٹھ آٹھ سال کی مدت میں کوئی رات ایسی نہیں گزری کہ سونے سے قبل میں نے انگریزی کے دس لفظ نہ یاد کئے ہوں اور شہرۂ عالم ڈاکٹر گلکرسٹ کی قواعد کی کتابوں کے چند صفحے توجہ سے اپنے آپ نہ پڑھے ہوں۔

لطف اللہ ۱۸۰۲ء میں مالوہ کے قدیم شہر دھارا نگر میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام شیخ محمد اکرم تھا اور خاندانی سلسلہ شاہ کمال الدینؒ سے ملتا تھا جو اپنے وقت کے ممتاز اولیاء میں تھے، مالوہ کے وہ حقیقی تاجدار تھے اس لئے کہ سلطان محمود خلجی عرصہ تک ان کے آستانے سے وابستہ رہا اور ہدایت حاصل کرتا رہا، شاہ کمال الدین کا جب انتقال ہوا تو سلطان نے ان کے مزار پر ایک عظیم الشان مقبرہ بنوایا اور اس کے سامنے ہی ایک [illegible]مت بنوائی کہ مرنے کے بعد یہاں اس کی آخری آرام گاہ ہو [illegible] مرشد سے قریب [illegible]س نے ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کرائی اور تین سو ایکڑ زمین جو ان عمارتوں کے گرد و پیش تھی وقف کر دی تاکہ اس کی آمدنی سے ان عمارتوں کی دیکھ بھال اور مرمت ہوتی [illegible]س کے مرشد کی اولاد اس سے فائدہ اٹھاتی رہے، لطف اللہ کا کہنا ہے کہ یہ سلسلہ ۱۷۰۶ء تک جاری رہا لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب مالوہ پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا تو انھوں نے سب کچھ ضبط کر لیا، صرف دو ایکڑ زمین چھوڑ دی کہ میرے والد کے دادا شیخ عبدالقادر کی بس گذر بسر ہو جائے، اس طرح وہ خاندان جو صدیوں سے خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی گذار رہا تھا، مفلس اور محتاج ہو کر رہ گیا، یعنی بقول لطف اللہ "اس خاندان پر دن کی روشنی ختم ہو گئی اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔"

شیخ محمد اکرم نے اپنی خاندانی روایات کو قائم رکھا تھا، انھوں نے اپنے جدِ بزرگوار کا آستانہ نہیں چھوڑا اور روحانی ہدایت کا کام کرتے رہے، ان کے مریدوں کی تعداد کافی تھی جن میں غریب بھی تھے اور امیر بھی، اجین اور بڑودہ جیسے بڑے شہروں میں ان کا حلقہ وسیع

تھا لیکن لطف اللہ کو ان سے کسب فیض کا موقع نہیں ملا، ابھی وہ اپنی عمر کے چوتھے سال ہی میں تھے کہ ان کے والد یعنی شیخ محمد اکرم کا انتقال ہوگیا، خاندان کے دوسرے افراد چونکہ خانقاہ اور اس کی آمدنی پر نظر رکھتے تھے اس لئے ان کا ننھا سا وجود بھی اُن پر ایک بار تھا یہاں تک کہ حالات اتنے ناساز گار ہوگئے کہ ان کی والدہ انھیں لے کر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگیں۔ یہ زمانہ ان کی والدہ پر بہت سخت گذرا، اسی زمانہ میں وہ اپنے بھائی کے ساتھ بڑودہ اور اجین گئیں جہاں ان کے شوہر کے مریدوں نے ان کا خیر مقدم کیا، اجین میں انھوں نے اپنے بھائی کے مشورہ سے دوسری شادی کرلی اور کسی قدر اطمینان سے گذرنے لگی۔

لطف اللہ کو اپنی تعلیم و تلاش معاش کے سلسلہ میں کافی جہاں نوردی کرنا پڑی، شمال میں وہ دہلی تک آئے، مغرب میں پونا، ستارا، سورت اور گجرات کے دوسرے شہروں اور آخر میں سندھ تک پہنچے، کئی بار وہ کمپنی بہادر کی ملازمت میں رہے اور کئی بار ایسا ہوا کہ محض ٹیوشن پر گذر اوقات [illegible]

کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ لطف اللہ نے مروجہ علوم میں کہاں تک دستگاہ حاصل کی، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے استادوں میں کوئی نامور شخصیت تھی یا نہیں، خیال ہے کہ حالات نے انھیں کسی مشہور عالم کے درس میں شریک ہو کر باقاعدہ تحصیل علم کا موقع نہیں دیا، ایک لحاظ سے یہ بات ان کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ وہ خود اعتمادی کے ساتھ اپنے آپ علم اور تجربہ میں اضافہ کرتے رہے جس سے ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور مروجہ طرز تعلیم سے عام طور پر جو جامد ذہن بنتا تھا اس سے وہ محفوظ رہے، ان کے یہاں ایک طرح کا لبرل ازم ملتا ہے جو اگرچہ محدود ہے لیکن اس عہد کو دیکھتے ہوئے قابل تحسین ہے، اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ غور و فکر کی دولت بھی انھیں ملی تھی، اگرچہ اس کی مثالیں کتاب میں بہت کم ہیں۔

بچپن میں ایک برہمن نے ان کی جان بچائی تھی، وہ تالاب میں ڈوب رہے تھے کہ

مندر کے پجاری نے ان کو نکالا اور جب انھیں ہوش آیا تو اس نے اظہار تشکر کے لئے ان سے کہا کو مہا دیوجی کے بت کے سامنے سر جھکائیں، انھوں نے اس کی تعمیل کی، بعد میں اپنے تاثر کو انھوں نے یوں بیان کیا۔

"میں نے مہا دیوجی کی مورتی کے سامنے سر جھکایا اور اتنا جھکا کہ میرا سر زمین سے لگ گیا لیکن اس حالت میں بھی میرا دھیان خدائے واحد کی طرف تھا جو جمادات اور تمام مخلوقات کا خالق ہے، میں مسلمان تھا، پیرزادہ تھا، ابتداء ہی سے مجھے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ ہندو کی یہ بڑی بھول ہے کہ وہ خدا [illegible] تراشے ہوئے پتھر کے بتوں اور دوسری موجودات کو پوجے [illegible]

"بہرحال اس حادثے نے میرے بچپن کے ذہن میں کچھ شبہات پیدا کئے، میں نے سوچا کہ بت پرستی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، اگر ہندوؤں کے مندر میں پتھر کی پوجا ہوتی ہے تو ہمارے یہاں خاک اور ہڈیوں کی پرستش کی جاتی ہے، کس بات کو مانا جائے اور کس بات کو نہ مانا جائے یا دونوں میں سے کسی کا اعتبار نہ کیا جائے، یہ بڑا پیچیدہ سوال ہے۔

... بعد میں جب میں نے عیسائیت کے بارے میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ عیسائی بھی حضرت مسیح سے متعلق مختلف غلط باتوں میں الجھے ہوئے ہیں...

"اگرچہ بعد میں میں نے ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے زندگی گذاری لیکن اس طرح کے الجھے ہوئے خیالات سے پورے طور پر اپنا دامن اس وقت تک نہیں چھڑا سکا جب تک کہ میری عمر تیس سال کی نہیں ہوگئی اور میں نے اچھی مستند کتابوں کا گہرا مطالعہ نہیں کر لیا، پھر معلوم ہو گیا کہ مجھے اپنے خالق کی عبادت کس طرح کرنی چاہیئے... میرا آغاز کیا ہے اور انتہا کہاں ہوگی اور اس دنیا میں جانے کے بعد جہاں سے کوئی مسافر واپس نہیں آتا، میرا حشر کیا ہوگا ــــ ان امور سے متعلق مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ان کے بارے میں جب میں اپنے دوستوں سے گفتگو کرتا ہوں تو ان کے نزدیک یہ باتیں کفر و الحاد

کی باتیں شہرتی ہیں"۔

لطف اللہ نے ہندو دھرم کی تعریف کی ہے لیکن وہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرتے کہ مذاہب جو اپنی ابتدا میں سادہ اور منزہ ہوتے ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ ان پر توہمات کا پردہ پڑجاتا ہے اور حقیقت چھپ جاتی ہے، ہندو دھرم جیسا کہ ویدوں اور قدیم مذہبی کتابوں میں ملتا ہے، خرافات سے پاک ہے، اعلیٰ، برتر اور لطیف معتقدات کا حامل ہے، ہندو لاء میں جرائم کی روک تھام کی سخت تاکید کی گئی ہے، خودکشی، طفل کشی اور انسانی جان کی قربانی سب ممنوع ہے، لیکن توہمات اور خودغرض پروہتوں کی بداعمالیوں کے سبب بعد میں بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئیں آج کے ہندو قدیم مذہبی عالموں اور وید پرستوں کے نزدیک کافر سے کم نہیں ہیں۔ لطف اللہ نے اپنے ان خیالات کا اظہار ستی کی رسم کے سلسلہ میں کیا ہے، ایک جوان عورت کو انھوں نے ستی ہوتے ہوئے دیکھا، اُسے انھوں نے اور ان کے ایک انگریز ساتھی نے روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور اس کا اثر ان کے ذہن پر مدتوں رہا۔

اسی طرح وہ مسلمانوں میں ختنہ کی رسم پر تنقید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دہلی کے شاہی خاندان کے علاوہ عام مسلمانوں میں اس قدیم یہودی رسم کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔ نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے معاملے میں کوتاہی ہو تو مسلم سماج اسے انگیز کرلیتا ہے لیکن اس رسم کی پابندی ہر قیمت پر چاہتا ہے حالانکہ قرآن شریف میں اس کا کوئی ذکر نہیں، "میں چاہتا ہوں کہ میری قوم کے لوگ عقل سلیم سے کام لیں، اور ابن آدم کو جسم کے کسی ایسے حصے سے محروم نہ کریں جسے فطرت نے اُسے بخشا ہے"۔

لطف اللہ پردہ کے حامی تھے، حیدرآباد (سندھ) میں ان کی ملاقات ایک شخص عبدالرحمٰن خاں دُرّانی سے ہوئی۔ ان کی حسین بیوی پردہ نہیں کرتی تھیں، اس سلسلہ میں وہ کہتے ہیں کہ انگریزی تہذیب کی یہ بڑی خرابی ہے کہ عورتوں کی آزادی

حق نمک ادا کیا، جو لکرا اور انگریزوں کی جو مشہور لڑائی ہوئی اس میں نواب عبدالغفور خاں نے عین وقت پر غداری کی لیکن توپ خانہ کے انچارج روشن بیگ نے آخر دم تک اس کی کوشش کی کہ انگریزوں کی شکست ہو۔ غداری کا یہ جرم نواب عبدالغفور خاں کے ضمیر پر ایک مستقل بار بن کر رہ گیا اور اس نے غریبوں کے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کر کے اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہا لیکن وہ اور اس کا بیٹا غازی محمد خاں اہل ہند کے نزدیک ملعون و مقہور ٹھہرے، انگریزوں نے اس غداری کے [illegible] اس خاندان کو بخش دیا۔

سندھ کے امیروں کی اخلاقی حالت کا انھوں نے جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ لوگ "نیم مہذب" ہیں، ان امیروں سے انگریزوں کی جو صلح ہوئی وہ ان کی موجودگی میں ہوئی، یہ امیر انگریزوں کا اعتبار نہیں کرتے تھے لیکن انگریزی طاقت کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے تھے، ان میں آپس میں رقابتیں بھی تھیں اور اس سبب سے عیاری اور منافقت ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی، ان اخلاقی کمزوریوں پر اگر سیاسی طاقت اور دبدبۂ حکمرانی کا جھول نہ ہو تو باد مخالف کے ایک جھونکے میں سارا تانا بانا بکھر جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب انگریزوں نے اپنی فوجی [illegible] سندھ کو اپنے حلقہ اثر میں لینا چاہا تو بہت آسانی سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

لطف اللہ نے جمّا نامی ٹھگ سے اپنی ملاقات کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اپنے عنفوان شباب میں جب وہ تلاش معاش میں سرگرداں تھے اور اجین سے گوالیار جا رہے تھے تو جمّا ٹھگ ان کے پیچھے لگ گیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے تو انھیں اپنے گروہ میں شامل کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ وہ کون ہے اور کس طرح وہ اور اس کے قبیلے کے لوگ مسافروں کا گلا گھونٹ کر ان کی پونجی لوٹ لیتے ہیں، کتاب کا یہ حصہ ٹھگوں اور ٹھگی کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے اور مصنف کے دلکش انداز بیان سے اس بے رحم اور وحشی گروہ کے ظالمانہ طریقۂ کار اور اس وقت کے سیاسی ضبط و نظم

کی کرسی اور اندھیر گردی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

۱۸۴۴ء کے شروع میں لطف اللہ نے انگلستان کا سفر کیا، وہ سورت کے نواب کی طرف سے دو آدمیوں کے ساتھ گئے تھے اس لئے کہ لارڈ ڈلہوزی نے نواب کی پنشن اور دوسری مراعات ضبط کرلی تھیں، اس کے خلاف اپیل کرنے یہ پارٹی انگلینڈ گئی جہاں کوئی کامیابی نہیں ہوئی، ہاں اس بہانے لطف اللہ کو چند مہینے لندن میں رہنے اور سمندری سفر کا موقع ملا۔ اس سفر کی تفصیلات اگرچہ مختصر ہیں لیکن دلچسپی سے خالی نہیں، ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عدن اس وقت ایک معمولی بستی تھی اور انگریزوں کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہو تو ہو، تجارتی نقطۂ نظر سے وہاں نہ تو کوئی بھاہمی تھی اور نہ کسی طرح کی خوش حالی کے آثار دکھائی دیتے تھے، عدن سے جب ان کا جہاز شمال کی طرف چلا اور یہ لوگ کچھ آگے گئے تو ان کے سادہ لوح ساتھیوں کو ان کی اس بات پر یقین نہیں آیا کہ کعبہ پچھم کی سمت میں نہیں ہے، اس مسئلہ پر کافی ردوکد رہی، پھر بھی ان کے دل میں یہ بات نہیں اتری، روایت پرستی اور صحیح علم میں کتنا بعد ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ قاہرہ میں وہ محمد علی پاشا سے بھی ملے، محمد علی کی انھوں نے تعریف کی ہے، جہاز پر انگریز مسافر بھی تھے اور ان سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، اس سلسلہ میں ان کا یہ ریمارک دلچسپ ہے: "جیسے جیسے آپ انگلستان کی طرف بڑھتے جایئے، آپ کو انگریزوں کے اخلاق میں نمایاں تغیر نظر آئے گا اور آپ انھیں زیادہ با اخلاق پائیں گے"، جبرالٹر کے محل وقوع سے وہ بہت متاثر ہوئے اور اس کا قلعہ دیکھ کر اس پر انگریزوں کے قبضہ کی وجہ ان کی سمجھ میں آگئی۔

انگلستان پہنچ کر انھیں جو تجربات ہوئے وہ اس سے مختلف تھے جو مرزا ابوطالب کو ہوئے تھے اور جنھیں انھوں نے تفصیل کے ساتھ اپنے فارسی سفرنامہ میں بیان کیا ہے

مرزا ابو طالب کی شخصیت مختلف تھی اور ان کا حلقہ الگ تھا، لطف اللہ اس لحاظ سے ایک معمولی درجہ کے آدمی تھے، اور وہ اس حلقہ تک نہیں پہنچ سکے جس کے ہاتھ میں اقتدار اور اثر تھا اور جو اُس وقت کی انگریزی تہذیب و معاشرت کا نمائندہ تھا، اس لئے انگلستان کے متعلق انھوں نے اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ سرسری اور سطحی ہے، البتہ اس بات کا ذکر انھوں نے کئی بار کیا ہے اور بڑے تاثر کے ساتھ کیا ہے کہ انگلستان میں چند لوگ ہیں جو ہندوستانی قوم کی قسمت کے مالک ہیں، ایسٹ انڈیا ہاؤس کی عمارت کو دیکھ کر ان کا جذبۂ حب الوطنی بیدار ہو گیا اور انھوں نے سوچا کہ اسی عمارت میں ہماری تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے، جن چند صفحات میں انھوں نے اپنے قیام لندن کے تاثرات و واقعات کو بیان کیا ہے ان میں وطن کی گہری یاد اور حمیت اور قومیت کے احساس کی شدت پورے طور پر نمایاں ہے، ایک شخص کرنل مالکم تھا، جب وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے ہندوستان میں مقیم تھا تو لطف اللہ سے اس کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہاں ان کی حیثیت رعیت کی تھی اور مالکم کا تعلق حکمراں طبقہ سے تھا، لندن میں جب اُس سے وہ ملے تو وہ اسی انداز سے ملا جیسے کہ حاکم محکوم سے ملتا ہے، یہ بات ان کو کھلی اور انھوں نے اپنے دل میں سوچا کہ "مالکم شاید اب بھی اس آزاد ملک میں نہیں ہے جہاں تمام انسان بحیثیت انسان کے برابر ہیں۔"

لندن میں انھوں نے عورتوں کی آزادی اور بے باک زندگی کو بھی بغور دیکھا اور ایسی جگہوں پر بھی گئے جہاں عورتیں نیم عریاں لباس میں رقص کرتی تھیں، رقص کے عالم میں ان کا جسم اور نمایاں ہو جاتا تھا، ایسے موقعوں پر انھیں اپنی شریعت یاد آتی تھی جس نے حدود متعین کئے ہیں، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ لندن سے اپنے ایمان کو بچا کر لے آئے ؎

قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد

——— لندن میں وہ ترکی کے سفیر سے بھی ملے، تحفے تحائف بھی دیے اور یقین دلایا کہ اسلامی حکومت کے لئے ان کی خدمات ہر وقت حاضر ہیں، انگریزوں کے کیریکٹر سے وہ بہر حال مجموعی طور پر بہت متاثر ہوئے، ان کی حب الوطنی، قانون کی فرمانبرداری اور محنت اور لگن سے کام کرنے کی عادت، یہ سب باتیں ان کے نزدیک ایسی تھیں جو ہندوستانیوں میں عام طور پر مفقود تھیں، ان کا خیال تھا کہ دنیا کی تمام قوموں کے مقابلہ میں انگریزوں میں یہ صفات زیادہ تھیں، اور اسی لئے وہ دنیا پر چھائے ہوئے تھے، لیکن عورتوں کی آزادی رہ رہ کر ان کی نظر میں کھٹکتی تھی، انگریز مرد اپنی عورتوں پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہیں، عورتوں کے محکوم ہیں اور عورتوں کے معاملات میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں، عورتوں کی آزادی کی وجہ سے معاشرہ میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ انتہائی حد تک قابل افسوس ہیں۔ ———

یہ باتیں لطف اللہ نے کئی طریقہ سے کہی ہیں، یہ درحقیقت بُعد تھا دو تہذیبوں کا، فرق تھا قدیم اور جدید اور مشرق اور مغرب کا، لیکن لطف اللہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو اپنی تہذیب کی خرابیوں کی طرف سے چشم پوشی کر لیں اور دوسری تہذیب کی خوبیوں کا ذکر نہ کریں، مغرب میں بھی حساس دل و دماغ رکھنے والے اپنی تہذیب کی مشکلات کا احساس رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری معاشرتی زندگی کے بعض گوشے ایسے ہیں جہاں ہم انسانیت و شرافت کی حدود کو چھوڑ بیٹھے ہیں اور اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

ایک ہندو صوفی ـــ سوامی وویکانند

جنابِ حمید احمد مسعود

(دہلی - دکن اور اودھ کی قسمتیں جب سو گئیں تو بنگال کے نصیب جاگے۔ انگریزی حکومت یہیں سے شروع ہوئی۔ جملہ مذہبی، تمدنی، سیاسی اور روحانی اصلاحوں نے اسی جگہ جنم لیا۔ برہمنیت کے خلاف بت پرستی۔ معتقدات و رسومات کی اصلاح کے لئے سب سے پہلے راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج قائم کی۔ اسکی کامیابی پر انھیں سی آئی ای کا خطاب ملا[1]۔ ان کے بعد برہمو سماج کی سرپرستی کے حقدار راجہ دیویندر ناتھ ٹیگور ٹھہرے اور انھوں نے اپنی حیات ہیں اسکی قیادت کیشب چندر سین کے سپرد کر دی۔ یہ نوعمر صاحبزادے قابلیت، فراست، جدت اور فن تقریر میں کمال رکھتے تھے۔ ان کے کارناموں اور مختلف سوسائٹیوں کے قائم کرنے کی وجہ سے شہرت و مقبولیت نے ان کے قدم چومے۔ ان کی ہر تحریک میں روحانیت شامل تھی اور روحانیت میں انھیں دستگاہ بھی حاصل تھی برہمو سماج کو محدود دائرہ سے نکال کر عالمگیر بنانے کے لئے مونگیر کے جلسہ میں عقد بیوگان کی تجویز پیش کی اور شادی بیاہ کو ذات پات کی بندش سے آزاد کر کے بین الاقوامی بنانے کی کوشش کی۔ دیویندر ناتھ ٹیگور نے ان تجاویز کی مخالفت کی، لہٰذا برہمو سماج دو حصوں میں منقسم ہو گئی کیشب چندر سین انگریزی تہذیب سے آراستہ تھے۔ ان کی انگریزی تقریروں میں جادو کا اثر تھا۔

1۔ سی آئی ای کا خطاب سب سے پہلے راجہ رام موہن رائے اور شیخ شرف الدین شیخ پوری کو ملا تھا۔ یہ مسئلہ نزاعی ہے کہ دونوں میں اولیت کا فخر کسے حاصل ہے۔ فتح گڑھ کا گزیٹیئر شیخ شرف الدین کے حق میں فیصلہ کرتا ہے۔

انہوں نے مذاہب میں اتحاد کی صورت پیدا کر کے اپنی روحانی تعلیم کی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مغربی ممالک میں بھی تبلیغ کی۔ اس تبلیغ میں تعلیم و تقریر کے علاوہ موسیقی بھی جزو اعظم تھی اور نتیجہ یہ تھا کہ اکثر لوگ بے دام ہو جاتے تھے۔

۱۸۷۵ء میں راما شنکر اور کیشب چندر کی ملاقات کلکتہ میں ہوئی تھی۔ راما شنکر خاموش طبیعت رکھتے تھے۔ تنہائی پسند تھے اور ان کی روحانی تعلیم ایک خاص حلقہ میں محدود تھی مگر ان کی محویت و کیفیت ہزار تقریروں کا جواب تھی۔ دونوں صوفی ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے اور محبت و خلوص کا رشتہ قائم ہو گیا۔ کیشب کی جدت پسندی آزادی کی طرف مائل تھی اور راما اپنے پرانے اصولوں کے پابند تھے۔ چونکہ کالی دیوی کے مندر میں استفادہ کیا تھا اسلئے ذات مطلق کو رحمت و شفقت کی بنا پر ماتا اور مائی کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ زنانہ بھیس میں بھی رہتے تھے چنانچہ ایک ملاقات میں کیشب چندر سین کی روحانیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم میرے شیام ہو اور میں تمہاری رادھا ہوں۔

جس طرح دیویندر ناتھ ٹیگور کو کیشب جیسی عظیم ہستی میسر ہو گئی تھی اسی طرح راما کو ویویکانند جیسا باکمال مرید مل گیا تھا۔ سوامی ویویکانند کی بیعت و خلافت کی داستان سے راما کرشنا کے اصولوں کے جملہ مراحل و مدارج کی تفصیل معلوم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اسی کا اظہار مقصود ہے۔ مسلمان صوفی اگر اس پر توجہ فرمائیں گے تو بہترین سبق ملے گا اور تصدیق ہو گی کہ ہر قوم راست را ہے، دینے و قبلہ گاہے ؛)

سوامی ویویکانند کا اصل نام نریندر ناتھ تھا۔ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ انگریزی مدرسوں میں تعلیم پائی۔ مغربی فلسفہ میں رنگ گئے۔ بعد میں مشکل یہ آ پڑی کہ فلسفہ و مذہب کے اختلاف کو کیسے دور کریں اپنی اس پریشانی کو حل کرنے کے لئے سب سے پہلے دیویندر ناتھ ٹیگور سے استفسار کیا کہ آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ نفی میں جواب سن کر مایوسی ہوئی اور خلش اور بڑھ گئی۔ اسی الجھن میں تھے کہ اتفاقیہ کلکتہ میں سوامی راما کرشن

سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس وقت وہ سترہ سال کے تھے اور راماکرشن جی چالیس برس کے تھے سوامی کی سادگی محبت، اخلاق اور روحانیت سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ سوامی جی نے ان سے کہا کہ ہم سے دکشینشور آکر ملا کرو۔ یہ مقام کلکتہ کے شمال میں چار میل پر ہے۔ یہیں راماکرشن رہا کرتے تھے۔ یہیں کالی دیوی کا مندر ہے۔

آگے چل کر علمی تحقیقات، قلبی کیفیات اور زندگی کے حالات میں جب توازن کی کوئی صورت نہ نکالی جا سکی تو اختلافات نے دل و دماغ کو منتشر کر دیا۔ مقدمے کے امتحان کی کامیابی کے بعد ان کی شادی کی بات چیت چلی تو شادی کرنے سے قطعی انکار کر دیا، اس بات سے والدین کو سخت صدمہ ہوا۔ صاحبزادے کے عجیب و غریب رجحانات دیکھ کر ایک عزیز اصلاح کی خاطر انھیں دکشینشور لے گئے۔ راماکرشن نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اس ملاقات کا حال دویکانند نے خود لکھا ہے کہ کمرے سے اٹھا کر مجھے باہر برآمدے میں لے گئے۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے، آواز رک رک جاتی تھی۔ پہلی بات یہ کہی کہ تم نے آنے میں بہت دیر کی۔ میں تمھارے انتظار میں گھل گیا۔" پھر نہایت ادب سے ہاتھ جوڑ کر فرمایا "میرے آقا نارائن۔ تم نارا کے روپ میں دنیا کی مصیبت دور کرنے کے لئے میرے پاس آئے ہو" اسکے بعد بڑے اصرار کے ساتھ مجھ سے وعدہ کر لیا کہ جلد جلد حاضر ہوا کروں اب کمرے میں آکر لوگوں سے جو گفتگو کی اس میں کسی قسم کی دیوانگی نہیں تھی بلکہ وعظ و نصیحت کے موتیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہر بات دل سے نکل رہی تھی اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں حیران تھا کہ انھیں دیوانہ سمجھوں یا صاحب عقل۔ آخر میں نہایت وثوق کے ساتھ اظہار کیا کہ خدا کا مشاہدہ ممکن ہے۔ اور اس سے اسی طرح بات چیت کی جا سکتی ہے جس طرح میں تم سے کر رہا ہوں۔ پہلے میں کچھ نہ سمجھ سکا اور موقع پاتے ہی اجازت لے کر رخصت ہو آیا بعد میں غور کیا کہ شاید خدا سے ہمکلامی کی بات ٹھیک ہو۔ مگر دیوندر ناتھ ٹیگور نے مشاہدہ الٰہی سے ہی انکار کیا تھا۔

دوبارہ مہینہ بھر کے بعد حاضری کا موقع ملا۔ پلنگ پر تنہا بیٹھے تھے۔ خیال گذرا کہ تنہائی میں بہ بے سروپا باتیں کریں گے۔ مگر نہایت محبت سے اپنے برابر پلنگ پر بٹھا لیا۔ خاموشی کے بعد آپ نے

آپ کچھ دیر تک گم سم بیٹھے رہے اور اپنی ایک ٹانگ میری گود میں رکھ دی۔ خلاف توقع حرکت پر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ پوری فضا رقص کر رہی ہے اور خدا جانے کس طرح اور کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح میں بھی کالعدم ہونے لگا۔ سمجھا کہ موت آگئی۔ چیخ کر وحشت کے ساتھ میں نے کہا "آپ کیا کر رہے ہیں۔ میرے والدین کس پر رہیں گے۔" جب ہوش آیا تو میرے سینہ پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور مسکرا کر کہتے جاتے تھے "ہر بات کا وقت مقرر ہے۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔" میں نے دیکھا کہ ماحول کی ہر شے بجنسہٖ اپنی جگہ پر تھی۔ حیرت کے ساتھ میں نے اپنے دل میں کہا "یہ حرکت مسمریزم کی نہیں ہو سکتی۔ مسمریزم ضعیف دماغ کو ملوّث کر سکتا ہے۔ میرا دماغ تو بہت قوی ہے۔ یہ حالت روحانی اثرات کا ہی نتیجہ ہو سکتی ہے لیکن روحانیت سے میں واقف نہیں۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ روحانی قوت کا راز معلوم کر کے رہوں گا۔ ممکن ہے کہ خدا کے بھی درشن ہو جائیں۔

اگلی مرتبہ جب خدمت اقدس میں پہنچا تو یہ طے کر کے گیا تھا کہ کسی اثر کو قبول نہیں کروں گا۔ مجھے لیجا کر مندر کے چمن میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اور میری طرف غور سے دیکھتے دیکھتے اُن پر محویت طاری ہو گئی۔ اس بیہوشی میں جب ان کا جسم میرے جسم سے لگ گیا تو یکبارگی میں بھی اسی نامعلوم کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک یہ حالت رہی۔ جب حواس درست ہوئے تو سمجھا کہ میرا سینہ ٹھونک ٹھونک کر ہوش میں لائے ہیں۔ گویا اپنی روحانیت کے ذریعہ بیہوش کیا تھا اور روحانیت سے ہی ہوشیار کر دیا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی آدمی اس طرح اثر ڈال کر دوسرے کو متاثر کر سکتا ہے۔ لیکن جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو عقل نے کہا کہ روحانیت حاصل کرنے کے لئے "گرو" کی ضرورت ہے اور گرو ہی محدود کو لامحدود تک پہنچا سکتا ہے۔ لیکن میرا یہ خیال شک و شبہ سے خالی نہ تھا۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ خوب آزما کے اور تجربہ کرنے کے بعد صحیح رائے قائم ہو سکے گی۔

مغربی تعلیم برہمو سماج کی تقلید اور ان روحانی تجربات نے وویکانند کو مذبذب بنا دیا۔ سکون جاتا رہا۔ عقل و منطق نے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ رائے قائم کرنا مشکل ہو گیا۔ روحانی تجربات کو شعبدہ بازی سے منسوب کیا جا سکتا تھا مگر ذاتی مشاہدات مانع تھے اور ان مشاہدات کی تشریح بھی ممکن نہ تھی۔ زبان صحیح

مفہوم ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اس پریشانی اور بے راہ روی کو دور کرنے کے لئے راما کرشنا نے "ادویتا" کی طرف سے توجہ مبذول کرنا چاہی۔ تاکید کی کہ متعلقہ کتابوں سے حقیقت سمجھیں اور اپنی صحبت میں اس کی وضاحت بھی کی۔ لیکن ویکانند نے اس اصول کو مذاق ہی سمجھا۔ کیوں کہ یہ علم و فہم کے خلاف تھا اور اس لئے علانیہ کہا کہ کفر ہے "کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ میں خدا ہوں تم خدا ہو اور ساری مخلوق خدا ہے۔ استغفر اللہ" راما کرشنا اکی اس حماقت پر مسکرا دیا کرتے تھے۔ ایک دن خودی انسانی اور خودی خداوندی کا بیان کرتے کرتے راما کرشن پر بیخودی کا دورہ پڑ گیا۔ اور اسی کیفیت میں انھوں نے اپنا [redacted] پر رکھ دیا۔ ہاتھ کا لگنا تھا کہ وہ بھی حال سے بے حال ہو گئے۔ لمس نے قلبی کیفیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اس عالم بیخودی میں کہاں کی سیر کی اور کس کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہ کون بتائے۔ اس عجیب [redacted] کا نتیجہ یہ ہوا کہ [redacted] انھوں نے کفر بکنا شروع کر دیا کہ سنسار میں سوائے برہم کے اور کسی کا وجود نہیں۔ سب کچھ وہی ہے" زبان اس قسم کا اعلان کر رہی تھی مگر دل میں خیال تھا کہ شاید یہ کیفیت وقتی اور عارضی ہے اور رفتہ رفتہ جاتی رہے گی۔ مگر یہ تغیر مستقل ثابت ہوا۔ گھر پہنچ کر برابر یہی محسوس کیا کہ میرا کوئی فعل میرا اپنا فعل نہیں ہے۔ اٹھنا بیٹھنا۔ بولنا چالنا اور کھانا پینا۔ غرض یہ سب فعل کسی اور کے ہیں۔ اس طرح سمجھ الٹی ہو گئی اور یہ مجبوری تھی جس پر کوئی اختیار نہ تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فلسفہ ادویتا پر اعتقاد جم گیا۔ دل و دماغ اتنے سرد پڑ گئے کہ چون و چرا کی ہمت نہ پڑی اور تردید و تشکیک جاتی رہی [redacted]

اس انقلاب کے بعد ایک نیا انقلاب آنا تھا اور وہ آیا۔ اپنے فعل کو اپنا فعل نہ سمجھنے کے بعد ذاتی رائے اور مذاتی جدوجہد بیکار ہو گئی ظاہر و باطن میں اختلاف ہو گیا۔ مادیت اور روحانیت میں جنگ چھڑ گئی اور حیات [redacted] کشمکش شامل ہو گیا۔ ۱۸۸۴ء میں والد کے انتقال کے بعد گھر بار کی ساری ذمہ داریاں ویکانند کے سر آ پڑیں۔ فکر معاش میں حصول معاش کی ہر کوشش میں ناکامی سے سابقہ پڑا اور کوئی تگ سیدھی نہیں بیٹھی۔ جو بات بھی کی بے نتیجہ نکلی۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ افلاس و احتیاج نے عزت آبرو اور جان پہ بنادی زندگی کے حقائق قلبی کیفیات کو شکست دینے لگے۔ قدرت کے جبر اور اپنی بے بسی کے احساس نے ایمان پر حملہ کر دیا۔ حد یہ ہوئی کہ ہستی خداوندی اور شان ربوبیت ضغطہ بن گئی جدوجہد کی ناکامیاں

ہر طرف دعاؤں کی نارسائیاں یقیناً منکر بنا دینے کو تیار تھیں مگر ذاتی مشاہدات اور راما کرشنا کی پُرخلوص شفقت کے اثرات نے مایوس نہ ہونے دیا اور کسی کروٹ بھی چین نہیں لینے دیا۔ اس گو مگو میں معیار بدل گئے۔ عزت و دولت کی وقعت جاتی رہی۔ مدح و ذم کو ایک سمجھا جانے لگا۔ دولت و تعیش کو مقصد زندگی سے خارج کر دیا گیا۔ زندگی سے دلچسپی قطعی طور پر جاتی رہی لہذا کوئی وجہ نہیں کہ ترک دنیا کا تصور دل غیر نہ سمجھا جاتا۔ دل ہی دل میں بن باس لینے کی ٹھہرا لی گئی۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ دنیا پہ لات مارنے کی ایک تاریخ بھی مقرر کر لی گئی ہے[1] اور زبان حال کہتی تھی کہ:۔

میں شکرِ عنایات سے غافل نہیں قاتل
ہر تیر پہ ایک آہ نکلتی ہے جگر سے

اس خاص تاریخ پر رخصتی سلام کرنے کے لئے راما کرشنا کی خدمت میں حاضری ضروری و مناسب سمجھی۔ جب گئے تو راما نے اِدھر اُدھر کی بات کر کے منت و سماجت سے رات کے قیام پر مجبور کر لیا۔ اس حیلہ سے جنون و جوش کو دور کر کے ارادہ سے ہٹانا منظور تھا۔ رات کو عالم تنہائی میں اپنے قریب بٹھا کر کچھ بھجن الاپنا شروع کر دیئے۔ اُن کا مفہوم ان کے حسب حال تھا۔ سنتے ہی دل بھر آیا اور گریہ جاری ہو گیا۔ اب راما کرشن نے کہا "میں جانتا ہوں تم دنیا کو ضرور ترک کرو گے لیکن ترک کر کے تمہیں "مائی" کی خدمت کرنا ہے لہذا میری خاطر میری حیات تک اپنے اس ارادہ سے باز رہو"۔ اپنی کمزوری

---

[1] اہل سلوک جانتے ہیں کہ یہی کڑی منزل ہے۔ روحانیت پہلے پہل آدمی کو موہ لیا کرتی ہے۔ پھر خودی کو جگاتی ہے۔ جب خودی طاقت ور بنجاتی ہے تو مادیت کے مقابل میں پیش کر دی جاتی ہے۔ اس جنگ میں گرو اور روحانیت اُدلے لے بے نیازی سے کام لیتے ہیں مگر نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوا کرتی۔ کوئی دعا قبول نہیں کی جاتی۔ ذلت و رسوائی سے سابقہ پڑتا ہے۔ پر یکے کسی دن بھی میں رخ بدل دیا جاتا ہے۔ یہی روحانیت کی کامیابی ہے اور یہ کامیابی استقامت سے حاصل ہوتی ہے سوامی جی کو اسی منزل سے گذارا جا رہا تھا۔

دیے بس پردہ لیا تھا کہ آنکھ آنسو بہانا شروع کر دیتی۔ اور صبح کو روانہ ہو کر خیریت سے گھر پہنچ گئے۔

آخر کار جب پانی سر سے گذر گیا۔ تو خیال آیا کہ مالی مشکلات سے نجات پانے کے لئے ماما سے دعا لینا چاہئے۔ فوراً ہی "ڈکشینشور" پہنچے۔ اور درخواست پیش کی۔ جواب ملا "یہ میرے بس کی بات نہیں۔ یہ کام کالی مائی ہی کر سکتی ہے۔ مندر میں جا کر اُسی سے رجوع کرو"۔ سنتے ہی اوس پڑ گئی بت پرستی کو وہ لغو خیال کرتے تھے۔ مگر مجبوری کا کیا علاج تعمیل کرتے ہی بنی اس طرح عقلیت کو فاش شکست ہوئی۔ ایک مرتبہ نہیں بلکہ برابر تین شب کالی مائی کے چرن لینے کے لئے مندر میں جانا پڑا ہر مرتبہ معلوم ہوا کہ پتھر کے بُت کے بجائے بہ نفس نفیس کالی مائی اپنی اصلی صورت میں پوری زندگی۔ قوت و جبروت کے ساتھ سامنے ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر مرتبہ مائی کے جلووں میں اس درجہ سرشار ہوا کہ عرض مدعا نہ کر سکا اور حاجت کو کہتے ہوئے شرم سی آئی۔ ہر حاضری کی کیفیت سے راما شنکر کو مطلع کیا مگر انھوں نے سکوت سے کام لیا۔ آخری مرتبہ زچ ہو کر کہا کہ آپ میری زبان بند کر دیتے ہیں اور مائی سے کچھ کہنے نہیں دیتے۔ آخر یہ کیا ستم ہے۔ جواب دیا کہ "یہ محض تمہارا وہم ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دنیوی تعیش تمہاری قسمت میں نہیں۔ اور میں قسمت نہیں بدل سکتا"۔ یہ سُن کر غم و غصہ میں انتہائی مایوسی کا گستاخی کے ساتھ اظہار کیا تو فرمایا "ٹھیک ہے۔ جاؤ۔ اب کھانے پینے کی اتنی تکلیف نہیں رہے گی"۔ سلہ

معمولی ملی مگر تن کو نہ لگی۔ اس طرح ملی کہ دل کا خون ہو گیا۔ زندگی سے دلچسپی نہ لدہ۔ مادیت کی شکست سے انفعال پیدا ہوا اور بے کیفی کا تسلط ہو گیا۔ بات بھی کھوئی التجا کر کے۔ امید و بیم میں ہیجانی کیفیت نے زندگی حرام کر دی حقیقت کی تلاش میں سب کچھ تج دیا مگر معرفت ہی نصیب نہیں ہوئی۔ ظاہری د

سلہ جمعیت خاطر کے لئے مرکزی خیال کی ضرورت ہے۔ اس مرکزی نقطہ کو بُت کہا جاتا ہے۔ یہ بُت ظاہری بھی ہوتا ہے اور باطنی بھی۔ اس بُت پر استقامت کے ذریعہ قابو پایا جاتا ہے یہ خیال کہ پرستش کی جاتی ہے بے معنی اور غلط ہے ظاہری بُت تو یہی پتھر وغیرہ کے مجسمے ہوتے ہیں جہالت کی وجہ سے اگر پرستش ان کی کی جائے تو یہ شرک و کفر ہے۔ (باقی فٹ نوٹ اگلے صفحے پر دیکھئے)

باطنی معنوں ظالم سے کالا ہوگئے۔ ملا شنکر جی دستگیری نہ کر سکے۔ ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ نہ اپنے اوپر اختیار رہا اور نہ کوئی غمگسار رہا۔ ضبط و جنون معمہ بنکر رہ گیا۔ ایک دن حسرت و یاس کے عالم میں جو مراقبہ کیا تو خلاف امید محسوس ہوا کہ سر کے پچھلے حصہ میں نورانی روشنی جھلک مارہی ہے[۵]

(فٹ نوٹ صفحہ ۷۶ کا بقیہ یہ ہے) اور باطنی بت ذہنی تصور ہوا کرتا ہے اس میں پرستش کا احتمال نہیں ہوا کرتا روحانیت مرکزیت کو مقصد عین بنا کر کامیابی دکھایا کرتی ہے جو کسی اور صورت سے میسر نہیں آتی۔ تصور اور ذکر باہمی لازم و ملزوم ہیں لیکن جب ذکر ثبت یا تصور پر غالب آجاتا ہے تو مرکز سے تعلقات مستحکم و مستقل ہو جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ سوامی جی نے سنگین بت کی روحانیت دیکھی یا کیا؟ پتھر کی قلیل روحانیت سے زیادہ کوئی اور روحانیت ضعیف نہیں ہوتی۔ پھر پتھر کے مجسمے میں اتنی طاقت کہاں کہ متشکل ہو کر نقل و حرکت کر سکے۔ اب یہ کہنا پڑیگا کہ یہ محض فریب تھا۔ مجسمے نے تصور کا حقیقت میں کام کیا۔ انھوں نے جس روحانیت کے جلوہ کا ملاحظہ کیا وہ خود انکی اپنی روحانیت تھی جو منعکس ہو گئی تھی۔ جب ذاتی روحانیت اتنی قوی ہو جاتی ہے تو ہر جگہ اور ہر شے میں اپنی ہی ذات دکھائی دیتی ہے اور اس کو مختلف ناموں سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ اتنی قوت حاصل کرنے پر قدرت اعلےٰ اس قوی حالی شخصی روحانیت کی مددگار اور دستگیر بن کر اس کا ہاتھ، کان اور زبان بنجاتی ہے جسکی وجہ سے ذاتی روحانیت عالم غیب کی سیر کرنے لگتی ہے اپنی ہی ذات کی وجہ سے ہر شے عزیز و محبوب بنجاتی ہے اور اپنائیت ہی کی وجہ سے اس کی برائی دور کرنے اور اس میں حسن پیدا کرنے کا جذبہ پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس جذبہ کی کامیابی قدرت اعلےٰ سے انعام کی مستحق ٹھیرائی ہے اور یہی انسانی زندگی کا اصل مقصد ہے یہ مقصد ادویتا کی تعلیم سے حاصل ہوتا ہے اور اسی کا نام وحدت الوجود ہے۔ بعض اشخاص کو ہر شے میں "وہ ہی وہ" نظر آتا ہے اور بعض اشخاص "میں ہی میں" دیکھتے ہیں۔ یہ مرتبوں کا اختلاف ہے مگر معنی دونوں کے ایک ہیں۔ ہمہ از دست اور ہمہ اوست کی لاطائل تفریق محض تضیع اوقات ہے اور معنی کو کھو کر الفاظ کی غلامی ہے واللہ اعلم۔

در کنز[۲] و ہدایہ نتواں دید خدا را   آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

۲؎ فقہ کی دو مشہور کتابیں ہیں

اس روشنی نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ حیرت و ملاحظہ نے جملہ اضافتیں اور نسبتیں محو کر دیں۔ ہوش و حواس سے تعلق جاتا رہا۔ مایا کے حجابات اُٹھ گئے۔ اور برہم سے روشناسی ہو گئی۔ نیروی کلپا سمادھی کی یہی معراج ہے۔ تھوڑی دیر میں جب حس پیدا ہوا تو صرف اتنا پتہ چلا کہ سر سلامت ہے اور جسم غائب ہے۔ گھبرا کر پوچھا کہ میرا جسم کیا ہوا؟ سب نے چھو چھو کر بتایا کہ جسم موجود ہے مگر یقین نہیں آیا۔ اس عجیب و غریب دیوانگی کی خبر راما شنکر کو کی گئی۔ انھوں نے فرمایا "مجھے پریشان بھی بہت کیا تھا۔ اب ٹھیک ہے۔ اسی حال میں رہنے دو۔"

یہ واقعہ ۱۶ راپریل ۱۸۸۶ء کا ہے۔ چار ماہ بعد اسی سال اگست میں راما شنکر اس دار فانی سے سدھار گئے۔

انتقال سے کچھ دن پہلے راما شنکر نے ویکانند کو بلایا۔ کچھ ہدایتیں کیں "آشتا منتر" کا گر بتایا اور راما کا لقب دیا۔ ہمہ اوست کی کیفیت طاری ہوئی اور ویکانند جوش و مسرت میں "راما راما" پکارتے ہوئے اِدھر اُدھر چکر لگانے لگے۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس وحشت سے روکے۔ راما شنکر نے فہمائش کی "فکر کی بات نہیں ہے۔ اسی حال میں رہنے دو۔ یہی ٹھیک ہے" کچھ دن کے بعد سہار اور برداشت ہو گئی اور خود بخود مستی جاتی رہی۔

آخری لمحات میں عین انتقال کے وقت راما کرشنا نے اپنے سامنے بٹھا کر آخری نگاہ ڈالی۔ اور خود سمادھی میں محو ہو گئے۔ ویکانند کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ بجلی چمکی اور جسم کے اندر داخل ہو گئی۔ اس میں سوزش نہیں تھی نور ہی نور تھا۔ اس ضیائے روح تاب نے انھیں بھی کسی اور عالم میں پہنچا دیا جب ہوش میں آئے تو راما کرشنا کو روتا ہوا پایا۔ رونے کی وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ "اپنا کل سرمایہ میں نے تمھیں دیدیا اب تم نیکی کا پرچار کرنا۔ تاریکی کو مٹانا اور پھر واپس چلے آنا۔"

سوامی ویکانند کو اس طرح ۲۳ سال کی عمر میں پانچ چھ سال کی تعلیم و تربیت حاصل کرنیکے بعد خلافت عطا ہوئی[1] اب ان کی سمجھ میں آیا کہ پہلی ملاقات میں جو کہا تھا کہ "نارائن نلرا کے روپ میں

(فٹ نوٹ اگلے صفحے پر دیکھیے)

سنساد کی مصیبت دور کرنے میرے پاس آیا ہے نہ بے سروپا بات نہ تھی بلکہ ایک ہونے والی بات تھی جو قبل از وقت بتادی گئی تھی اس کے علاوہ یہ امر بھی باعث تسکین ہوا اگر پریشانی اور تکلیف اٹھانی مگر راز روحانیت پالیا کوشش کامیاب ہوئی اور یہ سب گرو کی عنایت تھی اسی وجہ سے راماکرشنا کو بعض عقیدتمند اوتار بھی مانتے ہیں۔ ہندوستان یورپ اور امریکہ میں ان کی تعلیم کی تبلیغ کرکے اپنے گرو کا نام زندہ کیا اور اپنے آپ کو چھپا پایا مگر ان کی کتابوں میں اس تعلیم کے طریقے محفوظ ہیں۔ سائنس و فلسفہ دونوں جتنی بھی ترقی کریں مگر روحانی تعلیم کے سامنے ہیچ ہیں

امتثال امر کے طور پر مشتے نمونہ از خروارے دویکانند کی روحانیت و کمالیت کا ثبوت پیش کرنے کو دو واقعات کافی ہیں ان کے کسی معتقد اور حاشیہ نشین نے ذکر کیا کہ فلاں شخص بڑی مصیبت میں گرفتار تھا مجھے ترس آیا تو میں نے اسے مصیبت سے نجات دلادی۔ کہنے والے کی اس طرح تصحیح کردی گئی کہ تم نے مصیبت زدہ پر احسان نہیں کیا بلکہ اپنے اوپر احسان کیا اور حالتِ زار دیکھ کر جو تمہیں تکلیف ہوئی تھی اس سے تمہیں نجات مل گئی۔

امریکہ میں تبصرہ کرتے ہوئے ہندوستان کے متعلق یہ خیال علانیہ ظاہر کیا تھا کہ انگریز سے فارغ ہو کر جب ہندوستان اپنی بہبودی و فلاح کی کوشش میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کریگا تو خلاف امید ہمالیہ کی جانب سے چین حملہ کرے گا۔ اتفاق سے اس وقت جب کے لکچر میں یہ مضمون دیکھا گیا تو اعلان کیا گیا۔ چنانچہ ابھی حال میں اسی پیشین گوئی کے صحیح ہونے پر ویویکانند کی عقیدت کے ساتھ فاتحہ کے جلسے بھی کئے گئے ہیں۔

---

[1] خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔ لیکن یہ کسی قسم کی گرفت نہیں ہے بلکہ معافی طلب کرکے نہایت ادب سے ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ اگر سوامی جی شغل آئینہ کے ذریعہ خودبینی کی تعلیم دیتے یا اپنا ذاتی تصور مرحمت فرما دیتے اور پھر اسکو کالی دیوی کے تصور میں منتقل کرنے کے بعد نارائن کی جناب میں رسائی کراتے تو جو مرقابل کو اتنی طوالت اختیار نہیں کرنا پڑتی اور خلافت پانچ چھ برس سے بہت پہلے عطا کی جا سکتی تھی۔ مگر یہ اپنا اپنا طریقہ ہے اور وقت و قسمت کی بات ہے

غزل

جناب علی جواد زیدی

یہ سحر، یہ دشتِ غربت، یہ غبار ہلکے ہلکے
کہیں دور جیسے آنچل کسی ماہ وش کا جھلکے

یہی یادِ یار اے دل، ہے غمِ جہاں کا حاصل
کوئی پھول ہو تو پھر بھی کوئی پھینک دے مسل کے

مرا زہر خندِ جرأت سرِ دار دیکھتا جا
جو یہاں تک آگیا تو مری دشمنی میں چل کے

یہ غرورِ عاشقانہ، یہ حوادثِ زمانہ
غمِ دل جواں ہوا ہے انھیں گودیوں میں پل کے

وہ لہو کے چند قطرے شبِ غم کی کہکشاں ہیں
ترے دامنِ کرم میں جو مری پلک سے ڈھلکے

یہی سرکشی کا صحرا، یہی گمرہی کی دلدل
مرے خوش مذاق ساتھی! یہی راستے ہیں کل کے

سرِ بزم چھیڑتے ہو یہ ذرا خیال رکھنا
کوئی بات میں بھی رَو میں کہیں کہہ نہ جاؤں جل کے

جو ہو خارزار کوئی تو رواں دواں چلے جا
کوئی صحنِ گلستاں ہو تو گزر سنبھل سنبھل کے

جو وہ خود پلائیں زیدیؔ تو یہ شرط ہے عطا کی
نہ ذرا بھی ہاتھ کانپے، نہ ذرا بھی جام چھلکے

انجمن مناظرہ دہلی

مولانا امداد صابری دہلوی

۱۸۵۷ء کے بعد جبکہ ملک میں ہر طرف سے خاموشی اور بے حسی طاری ہو گئی تھی اور علمی دنیا میں ایک مبہم سا تعطل پیدا ہو گیا تھا اس وقت اردو زبان اور علوم مشرقی کو ترقی دینے کے لئے مختلف شہروں میں ادبی علمی سوسائٹیاں قائم ہوئیں تھیں ان میں دہلی سوسائٹی انجمن مناظرہ دہلی انجمن رفاہ عام راجپوتانہ اجمیر، مجلس علمیہ اسلامیہ کلکتہ انجمن اشاعت علوم، انجمن پنجاب، سائنٹفک سوسائٹی انجمن اسلام علیگڑھ، انجمن تہذیب لکھنؤ، انجمن رفاہ خلائق آگرہ، قابل ذکر ہیں۔ ان سوسائٹیوں نے اردو اور علوم مشرقی کو ترقی دینے کے لئے نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں ان کے بانی مرزا غالب ماسٹر پیارے لال آشوب، سر سید مرحوم، مولانا محمد حسین آزاد، منشی شیو نرائن لکھنوی، خان بہادر لطیف خاں کلکتوی، سیٹھ شیری مل اجمیری، سید نادر علی شاہ سیفی وغیرہ تھے۔

ان سوسائٹیوں کا تاریخ اردو میں ذکر نہ آنا نا انصافی ہے اس لئے میں ان سوسائٹیوں کے حالات قلم بند کرنا ضروری سمجھتا ہوں ان سوسائٹیوں میں کونسی پہلے قائم ہوئی اور کس نے افضلیت کا درجہ پایا اس کا ذکر اس وقت کیا جائے گا جب یہ کتاب مرتب ہو گی اور سلسلہ وار ترتیب کا لحاظ بھی اسی وقت رکھا جائے گا، اس وقت جن سوسائٹیوں کی حالات فراہم ہو سکتے ہیں ان کو قلمبند کیا جائے گا دہلی سوسائٹی کا تفصیلی ذکر میں حیات آشوب میں کر چکا ہوں اس لئے اس کا تذکرہ اس وقت ضروری نہیں ہے انجمن مناظرہ دہلی کا ذکر خیر سنئیے۔

انجمن مناظرہ دہلی کا پہلا نام پبلک سائنٹفک تھا اس نام سے جولائی [illegible]ء میں قائم ہوئی تھی ۱۰ مئی [illegible]ء کی میٹنگ میں اس کا نام تبدیل ہوا تھا چنانچہ اس کے قائم کرنے والوں

میں مولانا سیف الحق آدیب، جناب نصیر علی صاحب جناب محمود الحسن صاحب جناب عظمت اللہ بیگ اور نذیر بیگ نے رسالہ انجمن مناظرہ دہلی مئی لغایت جولائی ۱۸۷۱ء کے شمارے میں حسب ذیل اعلان کیا تھا۔

جمیع اصحاب انجمن پر روشن ہو کہ یہ انجمن علمی جس کا نام پہلے پبلک سائنٹفک میٹنگ تھا بغرض نفاذ عام ماہ جولائی ۱۸۷۰ء کو سہرا بہرام خاں گزر فیض بازار میں ہم چند طلبہ نے قائم کی تھی اگرچہ آغاز میں تو اسے کچھ فروغ نہ ہوا اب بفضل ایزد منان و امداد معاونان ماہ مئی ۱۸۷۱ء سے ترقی روز افزوں حاصل ہوئی اس انجمن کے انعقاد کا حسب ذیل تاریخی قطعہ مولوی سیف الحق آدیب نے فرمایا تھا ؎

بزم سوسائٹی عام آدیب ۔۔۔ منبع فیض علوم است و فنون
ممبرانش ہمہ بارائے صواب ۔۔۔ گل تدبیر نما بوقلموں
ہر کس شیفتۂ خوبی آں ۔۔۔ ہمہ اش والہ و شیدا مفتوں
ہمہ در سعیٔ حصول رفعت ۔۔۔ العرض قامت شان مثل نوں
چوں ز من سعیٔ سرانجام نہ شد ۔۔۔ گفتہ ام قطعۂ تاریخ اکنوں

بے دل غور بخواں تاریخش
منبع فیض ہدایت مشحون
۱۸۷۰

انجمن کے بعض ممبران اور خاص طور پر جناب عبدالرحیم صاحب بیدل کا خیال تھا کہ دہلی سوسائٹی کی موجودگی میں تو اس انجمن کی تشکیل نہ ہونی چاہیئے تھی بلکہ اس میں اس کو مدغم ہونا چاہیئے تھا جس کے حسب ذیل فوائد بیان کئے تھے[1]

اس مجلس کو ایک مستقل مجلس قرار دینا شاید بہت سی مصلحتوں کے خلاف ہو، کاش یہ انجمن

---

[1] رسالہ انجمن مناظرہ مئی لغایت جولائی ۱۸۷۱ء۔

دہلی سوسائٹی کا ایک شعبہ قرار دی جاتی تو اس سے بہت سے منافع متصور تھے جو رسالے اور اخبار وہاں آتے تھے ہیں ان کے خریدنے سے یہ انجمن مستغنی ہو جاتی اور جس قدر نئے اخبار یا خریدے جاتے ہیں ان سے دونوں برابر بہرہ مند ہوتیں اور جبکہ اس سوسائٹی میں بعض حکام شہر بھی شریک ہیں لہٰذا اس انجمن کو اور بھی زیادہ استحکام کی امید ہوتی، شاید یہ میری رائے بادی النظر میں اہل مجلس کو ابھی نہ معلوم ہو گر میرے ذہن میں اس رائے کی عمدگی خوب جمی ہوئی ہے"

یہ انجمن جہاں علمی مسائل پر مضامین لکھ کر بحث کرتی تھی وہاں ملک کے سیاسی مسئلوں پر بھی بحث کرتی اور حکومت کے سامنے مطالبے رکھتی تھی بحث کا انداز کس طرح کا ہوتا تھا اس پر بھی جناب عبدالرحیم صاحب تبدیل نے اپنے مذکورہ مضمون میں روشنی ڈالی ہے اور حالات حاضرہ پر زیادہ توجہ دینے پر زور دیا ہے۔

"مذہبی بحث کا نہ ہونا جو اس مجلس کی شرائط میں سے ہیں اس میں کچھ ترمیم کر لی چاہیے یعنی مذہبی بحث سے اگر یہ مراد ہے کہ کسی مذہب پر اعتراض کیا جائے یا کسی مذہب کی حقیقت پر دلیلیں پیش کی جائیں، تو البتہ ایسی بحث اس مجلس کی منافی ہے ہاں اگر اس کے سوا اور قسم کی بحث ہو مثلاً وہ رسمیں ہندو و مسلمانوں کے ہاں ایسی ضروری سمجھی جاتی ہیں جن کو جاہل لوگ داخل مذہب جانتے ہیں ان کے باب میں بحث کرنی یا گفتگو شائستگی اور تربیت کی بابت مذہب سے علاقہ رکھتی ہے اس کا بروئے کار لانا، ایسی باتیں اس بحث میں شمار نہ کی جائیں جن کو انجمن ناجائز رکھتی ہے، رائے کی آزادی جس پر اس قسم کی مجلسوں کی بنیاد ہوتی ہے اس کو ہر ممبر اپنا فرض سمجھے، رائے دینے میں کسی کو روک ٹوک نہ ہو کسی حالت میں مذہبی تعصب یا پاس وطن، یا رعب حکومت اظہار کلمہ حق کا مانع نہ ہو۔ ۔ ۔ ۔ ـــ مضمون ان معاملات پر لکھے جائیں جن میں آج کل بحث کرنے کی ضرورت ہے اور اگلے زمانہ کی باتیں جو اب فرسودہ ہو گئی ہیں ان میں زبان و قلم کو تکلیف دینی لا حاصل ہے"

اس انجمن کو چلانے والی دو کمیٹیاں سرگروہ انجمن اور کونسل کارپرداز تھیں، کونسل کارپرداز

کے عہدہ دار اور ممبران حسب ذیل تھے ۔

جناب مولوی سید امداد العلی صاحب ڈپٹی کلکٹر مظفر پور ضلع ترہٹ پیٹرن، جناب سید امیر علی صاحب ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی پریذیڈنٹ، جناب منشی ذکاء اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر نارمل اسکول دہلی پریزیڈنٹ، جناب پادری تاراچند صاحب وائس پریذیڈنٹ، جناب مولوی سید الفت حسین صاحب مدرس اول فارسی نارمل اسکول دہلی وائس پریزیڈنٹ، جناب سید محمد حامد صاحب آنریری سکرٹری، جناب نذیر علی صاحب سکرٹری، جناب نصیر علی صاحب اسسٹنٹ سکرٹری، محمد محمود الحسن صاحب لائبریرین ۔

معاون ممبروں کی تعداد ۲۷ تھی جن میں قابل ذکر نام یہ ہیں ۔

جناب صاحب عالم مرزا محمد ہدایت افزا عرف مرزا الٰہی بخش صاحب، مرزا محمد سلیمان صاحب آنریری مجسٹریٹ دہلی نواب مرزا محمد سعید الدین احمد خاں رئیس لوہارو، لالہ حکم چند بی اے لالہ کنہیا لال صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ مڈل اسکول دہلی، ماسٹر گوپال سہائے ہیڈ ماسٹر، لالہ لچھمن داس صاحب ماسٹر مشن اسکول دہلی لالہ پرسبھو دیال صاحب ماسٹر نارمل اسکول دہلی منشی حکم چند صاحب مدرس مڈل اسکول، مولوی الطاف حسین حالی، منشی عبدالرزاق بیگ مالک مطبع مجتبائی دہلی۔ سید سجاد مرزا صاحب ماسٹر مشن اسکول دہلی خواجہ قمرالدین صاحب مہتمم اردو اخبار دہلی۔ ماسٹر پیارے لال ماسٹر مڈل اسکول دہلی مولوی سیف الحق صاحب ادیب دہلوی میر منشی انجمن پنڈت بہاراج کشن صاحب ڈرائنگ ماسٹر مڈل اسکول دہلی، محمد ضیاء الدین صاحب نواب محمد فریدالدین صاحب، لالہ جانکی ناتھ صاحب سکنڈ ماسٹر سینٹ سٹیفن کالج دہلی منشی محمد انشاء اللہ خاں صاحب فائق، منشی نولکشور مالک اودھ اخبار ۔“

اس انجمن کے جلسوں میں آزادی کے ساتھ ملکی مسائل پر مضامین لکھے جاتے تھے اور بے باکی کے ساتھ سرکاری محکموں کی بدعنوانیوں پر روشنی ڈالی جاتی تھی چنانچہ یکم جولائی ۱۸۶۵ء کی میٹنگ میں جناب حاجی سید محمد میر شاہ کا ایک مضمون "رفاہ خلائق" کے عنوان کے تحت پڑھا

گی تھا اس میں جہاں دہلی میونسپل کمیٹی اور پنجاب پولس کی غفلت شعاریاں تھا ہر ہوتی ہیں وہاں اس شہر کی دہلی کی سڑک اور وغیرہ کا کچھ پتہ چلتا ہے اس مضمون کے اہم اور ضروری اقتباس یہ ہیں۔

"چنگی کا محصول جو نقد واسطے خرچ صفائی کے ہے وہ عام باشندوں سے برابر لیا جاتا ہے اور بعض بعض محلات شہر ایسے ہیں جن میں میونسپل کمیٹی کا کوئی فائدہ ظاہر نہیں ہوتا اور بعض ایسے ہیں جہاں روشنی اور صفائی کا انتظام معلوم ہوتا ہے یہ نہایت ناانصافی کی بات ہے کہ محصول سب سے برابر مساوی لیا جاوے اور ایک کو اس کا فائدہ پہنچایا جائے اور دوسرے کو محروم رکھا جائے دو سال کا عرصہ ہوا کہ جب ہم چاندنی چوک اور لال کنوئیں کے بازار میں چھڑکاؤ بکثرت دیکھتے تھے اور وہ نتیجہ جو چھڑکاؤ کے ہونے سے چاہیئے معلوم ہوتا تھا، مگر رفتہ رفتہ سقوں نے اس کو کم کرتے کرتے ایسا کر دیا کہ خلاف اس نتیجہ کے ہے کہ جس سے خشکی مراد ہے ایسی تبخیر ہونے لگی کہ سڑک پر بمشکل قدم رکھا جاتا ہے علاوہ بریں ممبران کمیٹی سے بجز اس فائدہ کے کہ محلوں کے بدلے قفلی دار ہوادے یا دو چار محلوں کی بدرو کو چوڑا اچوڑا اجرا دیا وہ بھی پورا نہیں بعض بعض محلے ایسے ہیں جن میں تھوڑی سی بارش سے گھٹنوں تک پانی بھرا رہتا ہے وہاں کے مکان والوں کو اپنے مکانوں کا اور راستہ چلنے والوں کو گر پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے ان اہم اور ضروری باتوں کی طرف جن سے کہ صحت عامہ میں نقصان پہنچتا ہے متوجہ نہیں ہوئے جب سے نہر کا پانی جو بہ سبب اختلاط راستوں کی کثافتوں اور درختوں کے پتوں کے بلغم اور بدرنگ ہو جاتا ہے اور شہر کے کھاری کنوئیں میں اس وجہ سے ڈالا جاتا ہے کہ ان کی شوریت کم ہو جائے اور سقے اس پانی کو ہزار ہا آدمیوں کو پلاتے ہیں جس سے نزلہ اور ضعف معدہ کے امراض میں لوگ گرفتار ہو کے جاتے ہیں اور پھر کثرت نزلہ سے ان کے پھیپھڑے ضعیف ہو کر مرض سل و دق میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں، دوسرے سڑکوں کی بدرووں میں کیچڑ سڑ کر ایسی عفونت پیدا ہوتی ہے کہ ابخرے روح کو مضطر اور دماغ کو پریشان کرتے ہیں، تیسرے بیرون شہر جو اولی قدم شریف جو شہر سے بہت متصل ہے کھات ڈالا جاتا ہے اور چمڑے والے چمڑے سڑاتے ہیں کہ ان کی عفونت ہوا کو خراب کرتی ہے

اور وہی چور شہر میں داخل ہو کر امراض پیدا کرتی ہے ..... پولس کے انتظام کی نسبت جو بالفعل ممالک مغربی و پنجاب میں ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عمدہ نہیں ہے بلکہ وہ انتظام جو قبل اس کے تھا بدرجہا اولی تھا اس انتظام میں وارداتوں کی کثرت ہے ہمیشہ چوریوں کے عمل سننے میں آتے ہیں اور رہزنیاں ہوتی ہیں میں خیال کرتا ہوں کہ پولس میں اکثر کانسٹبل ایسے نوکر ہیں جو در پردہ خود چور ہیں بقول آنکہ "چوٹٹی بلی جلیبیوں کی رکھوالی" اس کی وجہ یہ ہے کہ پولس میں زیادہ تحقیق جیسے کہ چاہیئے نہیں ہوتی پولس جو نگہبانی کا محکمہ ہے اس میں ہمیشہ تحقیق کے ساتھ نوکر رکھنے چاہئیں، دوسری وجہ شہروں میں کثرت وارادات کی یہ ہے کہ ہمیشہ بلکہ ہر روز ایک کانسٹبل کی تبدیلی ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں ہوتی ہے اس وجہ سے وہ کانسٹبل اہل محلہ سے واقف نہیں ہوتا نہ اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ محلہ میں کے مکان ہیں اور ان میں کون کون رہتا ہے اکثر ایسی وارداتیں ہوئی ہیں کہ چور نے لال ٹین ہاتھ میں لے کر جس کی دکان یا مکان کا چاہا قفل کھول لیا اور جو چاہا سو نکال لیا، اگر کانسٹبل نے پوچھا بھی تو کہہ دیا کہ میری دکان ہے"

(رسالہ انجمن مناظرہ دہلی مئی تا جولائی ۱۸۷۱ء)

اس مضمون پر میٹنگ میں حسب ذیل تبادلہ خیال ہوا اس میٹنگ کی صدارت منشی ذکاء اللہ صاحب نے فرمائی، مضمون نگار سے زیادہ صدر صاحب و ممبران نے پولس کی بے ایمانیوں کا پردہ فاش کیا۔

صدر صاحب نے فرمایا کہ آپ نے جو پولس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بہت درست و صحیح ہے اس میں ترمیم ہونی ضروری ہے، سرکار کو توجہ کرنی چاہیئے، علاوہ بریں اب جو تحقیقات کا ڈھنگ اس محلہ نے اختیار کیا ہے وہ نہایت خراب اور چوروں کی ہمت و جرات بڑھانے کا باعث ہے، یہ لوگ برآمد مال اور مجرم میں کوشش نہیں کرتے بلکہ برعکس جس کے ہاں چوری ہو اس کو دق کرتے ہیں مثلاً ان کی تحقیقات کا یہ عام طریقہ ہے کہ جب کسی کے ہاں چوری ہوتی ہے تو اول یہ دریافت کرتے ہیں کہ بی بی تو بدچلن نہیں بیٹا یا کوئی اعزیز

زبردستی نہیں اور اگر کوئی ان کی خوش قسمتی سے بدو ضبع ثابت ہو تو سہل چھٹکارا ہوا، ورنہ دم سادھ گئے، اکثر موقعوں پر دیکھا ہے کہ جس کے گھر چوری ہو اسی کے گھر کی تلاشی اور کھدائی ہو اس سے بجز اس کے اور کیا متصور ہو کہ وہ بے چارہ، تو پشیمان ہو کر یہی لے پولیس میں اطلاع کیوں کی، دوئم اس کی بی بی اور بیٹیا بدنام ہوا، سوئم اصلی مجرم کا سراغ نہ ملا"

"رام پور میں انتظام بہت عمدہ ہے، چوری کا کبھی نام تک سننے میں نہیں آتا، وہاں ایک میلہ میں جو ہر سال ہوتا ہے اور سات آٹھ ہزار آدمی اس میں جمع ہوتے ہیں اور قریب ایک ہفتہ کے وہ مجمع رہتا ہے میں بھی موجود تھا، اتفاقاً کسی کا بیل چوری ہو گیا، نواب صاحب کو خبر ہوئی تھانیدار کو حکم ہوا کہ صبح کو بارہ بجے تک مال و مجرم دونوں حاضر کرو ورنہ اسقدر روپے تمہاری تنخواہ سے کاٹ لیے جائیں گے، دوسرے روز تھانیدار صاحب بارہ بجے سے پہلے معہ مال و مجرم حاضر ہوئے"

"محکمۂ پولیس میں وہ لوگ رکھے جائیں جو معتمد ہوں نہ ان کے مانند کہ گوجر، چوہان جو جبلی چور ہیں، بھلا جب ایسے محافظ ہوں گے تو چوری کیوں نہ ہو گی، مولوی سید الفت حسین صاحب نے کہا کہ میں نے ایک اخبار میں دیکھا ہے کہ ضلع الہ آباد میں معہ تحقیقات کے تین ہزار کانسٹبل چور ثابت ہوئے اور موقوف ہوئے" (۷ جولائی ۱۸۷۱ء)

۹ ار جون کی میٹنگ میں جس کی صدارت پادری تاراچند صاحب نے کی تھی مولوی سید الفت حسین صاحب مدرس اول فارسی نارمل اسکول دہلی نے "حصول اتفاق" پر ایک مضمون پڑھا تھا جس پر حسب ذیل دلچسپ سوال و جواب ہوئے۔

" صدر جلسہ نے اعتراض کیا کہ آپ نے جو لکھا ہے کہ وید کی زبان اور مذہب سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم سے پہلے دنیا میں جنات وغیرہ بستے تھے، یہ بات ثابت نہیں البتہ صرف بید کی قدامت پائی جاتی ہے اس پر مولوی صاحب نے جواب دیا کہ درست ہے میں نے بھی اس کو یقیناً نہیں لکھا مگر مسلمانوں کی کتابوں سے بھی یہ پایا جاتا ہے کہ آدمیوں سے پہلے جنات دنیا میں

پیدا ہو تے چنانچہ کتاب سراکبر اور مجمع ماہرہ اور تبیین الکلام حتیٰ کہ رسوم ہند میں بھی یہ ذکر ہے ۔
اس پر بابو حکم چند صاحب بی اے نے فرمایا کہ علم جیالوجی سے ثابت نہیں ہوتا کہ آدم سے پہلے کوئی
مخلوق صاحب عقل دنیا میں ہو، ہاں نباتات اور درندے جانور بے شک یہاں تھے، مولوی صاحب
نے یہ بھی کہا کہ تاریخ یمینی میں لکھا ہے کہ جب محمود غزنوی نے متھرا کو فتح کیا تو وہاں سے دو پتھر
ایسے برآمد ہوئے کہ جس کی عبارت کندہ سے دنیا کی آبادی کا وجود کئی لاکھ برس سے ثابت
ہوتا تھا، بابو صاحب نے کہا ان پتھروں کے کندہ کرانے والوں کی غلطی ہے کہ آدم سے پہلے دنیا
کی آبادی ثابت کرنے سے کیا فائدہ اور غرض ہے مولوی صاحب نے کہا اس سے تصحیح تاریخ
اہل ہند اور اہل چین متصور ہے ۔ (مئی ۱۸۸۰ء)

انجمن مناظرہ کی ۲۴ اکتوبر ۱۸۸۰ء کی میٹنگ میں جس کی صدارت لالہ حکم چند صاحب
بی اے، نے فرمائی تھی اس میں شرافت انسانی " پر ایک مضمون میر نصیر علی صاحب نے سنایا
اس کے ایک حصہ پر صدر موصوف نے اعتراض کیا کہ یونانیوں نے ہندیوں سے یا ہندیوں نے کسی اور
سے تربیت پائی صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ زمانہ سابق میں ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک
کی زبان نہ جانتے تھے اور اکثر کو تو شوق بھی نہ ہوتا تھا سوا اپنے اور سب کو گونگا اور وحشی تصور
کرتے تھے پھر بھلا ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک کے آدمیوں سے کیوں کر تربیت پاتے
تھے اور سکندر کا پنڈت کو ساتھ لے جانا لائق یقین نہیں بجز چھوٹی چھوٹی تواریخوں کے ا
کہیں نہیں لکھا ۔ "

" میر صاحب نے کہا آپ فرماتے ہیں کہ غیر ملک کے باشندوں نے سنسکرت کبھی نہیں پڑھی
کوئی اس غرض سے یہاں آیا میں کہتا ہوں کہ پھر برنارڈ سمتھ صاحب نے کیوں لکھا ہے کہ
کا علم ہند سے روم گیا اور وہاں سے اور زبانوں مثل انگریزی وغیرہ میں منتقل ہوا آپ
کیا تاویل کرتے ہیں، میں تو ہرگز یہ خیال نہیں کر سکتا کہ کسی نے سنسکرت کو نہ پڑھا ہو اور تر
ہو میرے نزدیک تو یہ بات مسلم ہے کہ وہاں کے بعض باشندے بے شک [illegible]

اگر یہ بات ٹھیک ہے تو غیر ممالک کے رہنے والے آپس میں خط و کتابت ذیل و پیام عہد و پیماں کیونکر کرتے تھے دیکھو انوار سہیلی اول سنسکرت زبان میں تھی اور بزرجمہر طبیب نے نوشیروان عادل کے وقت میں اس کا ترجمہ پہلوی زبان میں کیا سنسکرت میں اس کا ترجمہ "پنچا تنترہ" تھا پنڈت کا سکندر کے ساتھ جانا آپ کے نزدیک غلط ہے مگر میں کوئی دلیل اس کی تکذیب کی نہیں پاتا ہوں" (اکتوبر ۱۸۶۱ء)

علمی مضامین پر تبادلۂ خیالات کے علاوہ انجمن کا مقصد یہ بھی تھا کہ علوم مشرقی کو ترقی دی جائے اور فارسی عربی سنسکرت کی زبانوں کو فروغ ہونا چاہیئے، چنانچہ جب انگریزی حکومت نے جبر تعلیم نفاذ کرنا شروع کیا تو اس وقت انجمن مناظرہ کی ۲۸ دسمبر ۱۸۷۰ کی میٹنگ میں اس مسئلہ پر غور ہوا جس میں طے پایا۔

"ہر ایک شہر میں ایسے مدارس قائم کئے جائیں کہ جن میں مختلف زبانوں مثل عربی سنسکرت فارسی انگریزی کے اور مختلف علوم مثل علم طبعی، ریاضی، تاریخ جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم ہوا کرے اور پھر یہ قانون مقرر کیا جائے کہ ہر ایک شخص کو ان زبانوں میں سے ایک زبان اور ایک علم حاصل کرنا واجب ہے۔ دسمبر ۱۸۷۱ء)

ایک اور دوسری ۱۲ اپریل ۱۸۷۲ء کی میٹنگ میں منشی میر نصیر علی صاحب نے ایک مضمون "اصلاح حالت ہند" میں اپنے انہی خیالات کا اعادہ کیا ہے لیکن ان میں انگریزی تعلیم کو اختیاری بنانے کی خواہش کا اظہار کیا لکھتے ہیں۔

"میرے نزدیک ہر ایک مدرسہ میں عربی و فارسی یا سنسکرت و فارسی بطور ملکی زبانوں کے پڑھائی جائے عربی و سنسکرت میں مذہبی کتابیں ہوں انگریزی تعلیم بالفعل طالب علم کی خوشی پر چھوڑ دینی چاہئیے" ۱۲ اپریل ۱۸۷۲ء)

یہ انجمن مغربی طریقہ کو پسند نہیں کرتی تھی ۱۸ اپریل ۱۸۸۱ء کی میٹنگ میں جب مضمون نگار نے اپنا مضمون ختم کیا تو حاضرین نے تالیاں بجائیں، صدر جلسہ منشی ذکاء اللہ صاحب نے فرمایا

"یہ دستور ہمارے ملک کے آداب کے خلاف ہے، یہ انگریزی رسم و رواج ہے اس لئے ہم انگلی
کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ انجمن جس قانون کو ہندوستانی عوام کے لئے مضرت رساں سمجھتی تھی ،
اس کے نفاذ کے خلاف آواز اٹھاتی تھی، چنانچہ جب انکم ٹیکس کا نفاذ ہوا تو اس نے اس کی مخالفت
کی اور یہ تجویز پاس کی کہ اول تو انکم ٹیکس نہیں لگانا چاہیئے اور انکم ٹیکس کی رقم بہت زیادہ مقرر
کی گئی ہے چنانچہ منشی نذیر علی سکرٹری انجمن نے ایک مضمون "فوائد انجمن" میں حسب ذیل
فائدہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

"اگر کوئی شخص کسی قانون کو بدلنا چاہے تو غیر ممکن ہے، انکم ٹیکس کے کم ہونے پر تو کسی
خاص شخص کی ہمت پڑتی کہ وہ عرضی دیتا یا کسی طرح حکام کو زبانی اطلاع دیتا اور نہ اس کے
مشورے کو کوئی قبول کرتا مگر جب انجمن نے اتفاق رائے اور مشورت کے بموجب گورنمنٹ
آف انڈیا کو عرضی دی تو گورنمنٹ کو التفات کرنا پڑا اور آخر کار اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ تین روپے
دو آنے فی صدی جو پہلے مقرر تھا اب ایک روپیہ فیصدی رہ گیا ہے (مئی تا جولائی ۱۸۷۱ء)

عیسائی دنیا نے اسلام اور اس کے بانی جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف
جس قدر مکروہ پروپیگنڈہ کیا ہے شاید کسی اور مذہب نے نہیں کیا ہو چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی کے
انگریزی کورس کی کتاب میں بھی اسی قسم کی حرکت کی گئی تھی، منشی نصیر علی صاحب نے ۱۲ اپریل
۱۸۷۲ء کی میٹنگ میں اپنے ایک مضمون میں ان الفاظ کے ساتھ اس کی مذمت کی ہے۔

"سنا ہے کہ کورس انگریزی کے صفحہ ۸۱ اور ۸۲ میں جو کلکتہ یونیورسٹی ۱۸۷۲ء کے امتحان والوں
کے واسطے مقرر ہے لفظ "امپوسٹر" جس کے معنی مکار اور دغاباز ہیں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
کی شان میں ہے اور ہمارے مذہبی روایات کی نسبت لفظ فیبل جس کے معنی افسانہ و کہانی ہیں
لکھا ہوا ہے اور نیز اکثر تاریخ انگریزی میں بھی مورخین نے متعصبانہ .... حضرت عیسیٰ
کی بڑی تعریف کی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت خیال فاسد نکالے ہیں، افسوس
ہے کہ ایسے متعصب نادان، بیہودہ مصنفوں کی کتابیں ہماری تعلیم میں جاری کی جاتی ہیں۔ کلکتہ

یونیورسٹی اور اس کے فیلو پر یہ بڑا بھاری اعتراض ہے اور مؤلفان کو اس کی غفلت قابل خبر گیری ہے۔ (۱۸ اپریل ۱۸۷۱ء)

اس انجمن نے اپنی روئیداد کارروائیاں شائع کرنے کے لئے ایک رسالہ انجمن مناظرہ کے نام سے شائع کیا تھا جس کا پہلا شمارہ مئی تا جولائی ۱۸۷۱ء کا نکلا تھا اس کے بعد ۱۸ اگست ۱۸۷۱ء کی میٹنگ میں جب کہ یہ تجویز رکھی گئی تھی کہ ایک اخبار نکالا جائے تو اس وقت اخبار نہیں بلکہ ماہانہ رسالہ نکالنے کی تجویز منظور ہوئی چنانچہ اگست ۱۸۷۱ء سے باقاعدہ ماہانہ پرچہ نکلنے لگا تھا۔ بیس صفحات پر مشتمل تھا، سکرٹری نذیر علی صاحب اس کے کرتا دھرتا تھے سالانہ چندہ تین روپیہ تھا پہلا پرچہ مئی تا جولائی ۱۸۷۱ء مطبع محمدی دہلی میں طبع ہوا تھا۔ اگست ۱۸۷۱ء سے مطبع مجتبائی دہلی میں چھپنا شروع ہوا۔

اس دور کے حالات کسی شخص یا جماعت یا اخبار و رسالہ کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ انتہائی آزادی کے ساتھ اپنے جذبات کی ترجمانی کر سکتے۔ انگریزی اعلیٰ حکام کی مخالفت کرنا تو بہت مشکل تھی چنانچہ انجمن مناظرہ اور اس کے رسالے کو بھی یہی پالیسی اختیار کرنی پڑی اعلیٰ حکام کی خوشامد کرنے پر مجبور تھے۔ جب جزائر انڈمان میں لارڈ میو سابق وائسرائے اور گورنر جنرل ہند کو قتل کیا گیا تو اس وقت انجمن نے کئی تعزیتی جلسے ۲۶ فروری اور ۵ مارچ ۱۸۷۲ء کو کئے قتل کے واقعات اور قاتل کے حالات زندگی مارچ ۱۸۷۲ء کے شمارے میں شائع کئے ہیں اس مضمون میں قاتل کی سزا پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے اس زمانہ کی خوشامدانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جب قائم مقام شہنشاہ ایک ٹٹو پر سوار ہو کر پہاڑی پر چڑھ گئے اس وقت کل آٹھ بارہ چپراسی ہمرکاب تھے، وہاں کوئی پاؤ گھنٹے قیام فرمایا تھا اور بہار کا حظ اٹھایا مرغان عزیمت پھیری معاودت کے وقت دو قیدیوں نے کچھ عرض کیا، جنرل سٹورٹ جو ان کے ہمراہ تھے فرمایا کہ حسب ضابطہ عرضی دو زبانی نہ بول سکو گے وائسرائے بہادر ساڑھے سات بجے شام کے گھاٹ

پر پہنچے جس کے قریب چالیس قیدی رہتے تھے اس وقت بالکل تاریکی ہو گئی تھی، دور کا آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا، سپرنٹنڈنٹ نے مشعلیں روشن کرا کے دو آدمیوں کے ہاتھ میں دیں ایک ثلث راہ قطع ہوئی تھی دونوں مشعلچی چند قدم آگے بڑھے تھے ..... میجر برن تین چار قدم کے فاصلے پر جانب چپ تھے کہ حضور ممدوح نے باصرار حضرت ملک الموت کشتی پر سوار ہونے کے لئے قدم بڑھائے اور شٹو کو تیز کیا ... اس وقت شیر خاں نامی سنگدل بیرحم، بہائم خصلت وحشی صورت پہاڑی جانور جو معلوم ہوتا ہے ان پر دوڑا اول اس سپاہی کو جو نواب صاحب کے قریب تھا دھکا دیا اور پھر اس مظلوم امیر کبیر کے ایک چھری بازوے راست پر اور دوسری بازوئے چپ پر ماری جام عمر لبریز ہو گیا تھا زخم کاری آئے ... چند سپاہیوں اور ہمراہیوں نے اس خونخوار کو پکڑ لیا اور غصہ میں مارنا چاہا، افسروں نے منع کیا اور زندہ رکھنے کا حکم دیا، کہتے ہیں کہ جناب ممدوح گھائل ہو کر یا خود کود پڑے یا گر پڑے اور باوجود اس قدر صدمہ مہلک کے اپنی ہمت سے پانی میں کھڑے ہو گئے اور اس واپسیں ساعت میں یہ کلمات زبان سے فرمائے'

" اے برن مجھے مارا میرا سر پکڑو' ہمراہیوں نے اسی وقت ایک گاڑی میں جو وہاں موجود تھی لٹا دیا اور کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح جہاز تک زندہ پہنچ جائیں لیکن افسوس خدا کو منظور نہ تھا تھوڑی دیر میں روح قالب خاکی سے آسمان بالا کو پرواز کر گئی ..... اس شیر علی قاتل کا حال اب تک یہ معلوم ہوا اس کی عمر ۳۰ سال کی ہے۔ رنگ اچھا، قوی الجثہ، طاقتور آدمی ہے والد کا نام مالی یا ولی ہے جبرود گاؤں کا جو متصل درخیبر واقع ہے رہنے والا ہے ۱۸۶۳ء میں میجر جیمس نے اسے بندی سے آزاد کیا اور میجر جیفر کی رجمنٹ کے ہمراہ ملک ہند میں بھیج دیا۔ بعد اختتام جنگ میجر صاحب موصوف نے اسے اپنی اردلی میں رکھا چنانچہ وہ کرنیل ٹیلر صاحب کرنل میجر صاحب و کرنل پالک کے عہد میں بھی اسی خدمت میں بحال رہا اور جنگ انبیلا میں بسرداری کرنل ٹیلر خدمات لائقہ کیں، مارچ ۱۸۶۷ء میں اپنے ایک رشتہ دار حیدر کو بسبب تنازعہ خانگی ہلاک کیا، جرم اس پر ثابت ہوا مگر چونکہ اول وار اس کے دوست نے کیا تھا سزائے دوامی اور

حکم عمدہ دیا تھے محمود ہمیا اس نے درخواست کی تھی کہ بجائے عبور جبس کے پھانسی دی جائے اس لئے اسنے جرم کا اقرار کیا اور کہا بہ ہدایتِ خدا میں نے ایسا کیا ہے۔ اس کو حکم پھانسی چیف کورٹ ہو گیا۔ مگر ہمارے نزدیک اس کو سزائے پھانسی کافی نہیں مگر پھانسی بعد عرصہ کے ہونی چاہیئے ان کے واسطے اول کوئی خاص سزا مقرر ہونی چاہیئے مثلاً تشہیر کرنا، پھر پنجرہ میں رکھنا، خوب چابک دیدے سے خبر لینا، کبھی کبھی کوئی زخم لگا دینا، اور بعد معیاد معین کے جو کم از کم پانچ سال ہونی چاہیئے پھانسی دینا، اور بعد پھانسی کے کال ون سے نعش کو لٹکائے رکھنا بہت لوگ بیان کرتے ہیں کہ یہ شخص عبداللہ قاتل چیف جسٹس کا کوئی رشتہ دار تھا جیسا کہ ایک قیدی نے اظہار کیا کہ جب اس کے گھر سے خبر آئی کہ عبداللہ مارا گیا تو اسے بہت رنج ہوا اور چند روز بعد تمام قیدیوں کی دعوت کی اور ظاہر کیا کہ عنقریب ایک بڑا واقعہ ظہور میں آئے گا، وہ چھری جس سے اس نے نواب صاحب کو ہلاک کیا معمولی چاقو ہے جو باورچی خانوں میں ترکاری کے واسطے رکھتے ہیں —

اسی رسالہ فروری و مارچ ۱۸۷۲ء کے صفحہ ۱۷ پر لارڈ میو کے قتل کی پانچ تاریخیں چھپی ہیں ان میں سے دو درج کی جاتی ہیں۔

جناب شیخ محمد الہادی صاحب ہادی ممبر انجمن

شیر علی چون ناگہاں کشت وزیر ہند را — آنکہ بداد چو خویشتن بر ہمہ خلق مہرباں
از پے سالِ قتلِ او ہادی تیز دل چنیں — قتل شدہ آہ بے خطا از رہ ظلم اینچناں
۱۱۷۳ ۱۱۵

منشی حبیب الدین احمد سرزان سہارنپوری محب انجمن

وزیر ہند در بلیر لب آب — چو وقت شام از بالا کے پل شد
بگردد آن چنان خنجر جہاں تاش — کہ پنداست از دہر جا دخل شد
شنیدم کہ اذان وقت از سر درد — بگفتا کہ چراغ عمر گل شد
۶ ۱۸ ۲۲ ۶

۲۶ فروری ۱۸۷۲ء کی انجمن کی میٹنگ میں طے پایا کہ انجمن کی طرف سے لارڈ میو کی

یادگاری میں ایک اخبار میو گزٹ جاری کیا جائے[1]۔ اختر شہنشاہی نے لکھا ہے کہ جنوری ۱۸۷۲ء میں یہ اخبار شائع ہوا جو صحیح نہیں ہے۔ یہ مارچ یا اپریل ۱۸۷۲ء میں جاری ہوا تھا، عشرہ اراٹھ صفحات پر مشتمل تھا، ایڈیٹر و مہتمم سید نصیر علی صاحب تھے۔ سالانہ چندہ چھ روپے آٹھ آنے تھا، مطبع مجتبائی دہلی میں چھپا تھا۔ انجمن پنجاب لاہور نے ۲ ر فروری ۱۸۷۶ء کے شمارے میں اس پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے :-

"میو گزٹ میو کی یاد میں نکلا۔ پہلے جب نکلا تو اس کی بڑی چاہ ہوئی! اس کے حسن ظاہری و باطنی میں اکثر لوگ فریفتہ ہونے لگے اب سرگرمی نہیں سولہ صفحوں پر چھپتا ہے۔ کاغذ، خط اچھا ہے مضامین وغیرہ بھی درج ہوتے ہیں۔ اچھے ہوتے ہیں عبارت دہلی کی ہے جو بہت عمدہ ہے"۔

اس انجمن اور اس کے رسالے اور اخبار نے اردو کی اچھی خاصی خدمت انجام دی ہے۔ اس انجمن کا کام کب بند ہوا، اور یہ رسالہ اور اخبار کب تک جاری رہے۔ اس کا پتہ نہیں لگ سکا۔

---

[1] میو گزٹ" کے بارے میں جناب محمد عتیق صدیقی صاحب کا ایک مضمون ماہنامہ جامعہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (لطیف اعظمی)

سیاسی نظریئے ——— افلاطون اور ارسطو

مؤلف : جناب ضیاء الحسن فاروقی

پچھلے ماہ مذکورہ بالا کتاب پر تبصرہ کیا گیا تھا، مگر غلطی سے جناب مؤلف کا نام درج ہونے سے رہ گیا تھا۔ معذرت کے ساتھ اس کی تصحیح کی جا رہی ہے۔

(ع ل ا)

مثنوی ابر کرم

(امیر مینائی مرحوم)

جناب سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

اردو ادب میں میرؔ اپنی آشفتہ حالی، سوداؔ شوکت بیانی، دردؔ تصوف پسندی اور میر سوزؔ اپنی سادہ بیانی کی وجہ سے معروف شخصیتوں میں ہیں۔ اسی طرح شاہ نصیرؔ اپنی طرز خاص اور ذوقؔ و مومنؔ اپنی انفرادیت کے لحاظ سے مشہور روزگار ہیں۔ لیکن غالبؔ کی شاعری اپنی شگفتہ بیانی اور جادو طرازی کے سبب انتشار لطیف کا درجہ رکھتی ہے، انھوں نے جربات جس انداز سے کہنی چاہی ہے اس میں تکلف تصنع اور آورد کو داخل نہیں ہونے دیا ہے۔ ان کے میزان قدر میں بات کو بھرپور کہنے کا جو جرأت مندانہ حوصلہ ہے، وہ اردو ادب کی آبرو کا ضامن ہے۔ غالبؔ نے تصوف کے مسائل پر، مذہبی امور پر، معاشرتی زندگی، صبح و مسا کی نیرنگی اور حیات و ممات کے واقعات پر ـــ غرض ابن آدم کی زندگی کے جس جس پہلو پر نظر ڈالی ہے، وہاں گل افشانی گفتار کو ملحوظ رکھا ہے اور حقیقت کو کبھی فراموش نہیں ہونے دیا ہے۔ انھوں نے کیف و مستی کے عالم میں بھی "شاہد و مشہود" اور "بادہ و جام" کا ذکر، اس انداز سے کیا ہے، جیسے یہ سب شیشۂ گراں ہیں اور ان کی نزاکت و حرمت کا انھیں پورا احساس ہے۔ حالانکہ غالبؔ کے یہاں شراب پینے کے لئے ساغر جم اور جام سفال کی قید بھی کوئی ضروری نہیں ہے۔ کس جذبۂ خودداری اور پندار سے کہتے ہیں،

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

بات کتنی صاف، سیدھی، کھری اور سچی ہے ـــ لیکن جمشید زندہ ہوتا اور اس کے سامنے یہ بات کہی گئی ہوتی، تو غالبؔ کی جان پر آ بنتی ـــ مگر بات، "دو کوڑی" کی ہوتے ہوئے بھی، عام انداز کی ہے اور سچ ہے۔ ـــ اور غالبؔ کا یہی انداز نگارش، یہی حقیقت آفرینی ـــ ان کا فن ہے، زندگی

کی قدروں کو پہچاننا، اس کا استعمال عام کرنا، اس کی وضاحتوں کی تشریح کرنا اور اپنا راستہ آپ متعین کرنا، بڑے جہاد کا کام ہے معمولی سے مضمون کو، انسان پسند بنا دینا، معمولی کارنامہ نہیں ہے اور ایسے کارنامے غالبؔ کے یہاں بہت ہیں :

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

عام افہام و تفہیم کی بات ہے، کوئی بھی لغت اٹھا کر دیکھئے، عام محاورے میں بھی استعمال ہوتا ہے : خون کے آنسو رونا : یہ آنسو نہیں ہیں قطرات لہو ہیں : دل خون ہو جاتا ہے، تب آنسو نکلتا ہے : آنسو کیا ہے ؟ قطرۂ خون ہے! — لیکن آج تک آنکھوں سے آنسو کے سوا : قطرۂ خون : گراتے یا ٹپکاتے کسی کو نہیں دیکھا گیا ہے ۔ غالبؔ نے اس مائل بہ یقیں محاورے کی جس طرح تکذیب کی ہے، اس کی تشریح ضروری نہیں ۔

ایک شعر اور ہے :

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

اس سے قطع نظر کہ خطاب کس سے ہے ؟ سوال کی نوعیت واضح ہے، جس میں عرض نہیں، گستاخی کا انداز مضمر ہے، مگر یہ عبد اور معبود کے درمیان کی بات ہے، خدا معلوم اسے کونسی ادا پسند آجائے، ہم آپ اس پر حاشیہ آرائی کیوں کریں ؟ فقہی اور دینی مسائل کو چھوڑیئے بعض حقائق مشہور ہیں، جس میں :

آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

کی روایت بھی زبان زد خاص و عام ہے ۔ انہی حضرت موسیٰؑ کے عہد کا واقعہ ہے کہ ایک نافرمان شخص آدھی روٹی کھاتا تھا اور بقیہ پھینک دیتا تھا، اس کے باوجود اسے دوسرے وقت کی روٹی ملتی تھی، حالانکہ ایک عالم دین، آدھی کھاتا اور آدھی

دوسرے وقت کے لئے بچا لیتا تھا، یہ اس کی کفایت شعاری اور قناعت پسندی تھی ــــ لیکن اس کی اس ادا پر حکم خداوندی ہوا کہ ـــ :- اس بندے کو میری ذات پر بھروسہ نہیں ہے ـــ ، یعنی وہ نافرمان خدا کا محبوب اور یہ عالم، خدا پرست، خدا کا ناپسندیدہ شخص قرار پایا :

دراصل خوب و زشت کی تمیز انسانی فہم سے بالاتر ہے، یہ ماورائی شے ہے اور جزا و سزا کے لئے مختص! پھر جزا و سزا بھی تو خوب و ناخوب کی میزان پر منحصر ہے، اور منحصر کل، وہ ذات باری ہی ہے جس کے حضور غالب نے اس طرح کی اور بہت گستاخیاں کی ہیں ـــ ان میں شوخی بھی ہے شرارت بھی، مزاح بھی ہے اور لطف بھی ـــ لیکن ایسا مزاح اور ایسی شوخی جس پر گرفت نہ کی جا سکے اور بات اگر گرفت کی زد میں آتی بھی ہو، تو ہم اس پر سزا تجویز کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ قضا و قدر کا یہی مسئلہ ہے۔ غالب کے مندرجہ بالا شعر کی تشریح امیر مینائی مرحوم نے بھی ستاون شعروں میں کی ہے، جس میں خدا، فرشتے اور ایک گنہگار انسان کے اعضا و جوارح سب ہی سوال و جواب میں مصروف ہیں۔ ایک مکالمہ ملاحظہ ہو :-

زباں سے حکم ہوگا پھر کہ تو بول — جو ہوں اسرار پوشیدہ وہ تو کھول
کہے گی وہ بھی دست دعا کے مانند — کہ یہ غیبت نگالی پر رہا بند
کہے گا تب یہ مجرم جوڑ کر ہاتھ — کہ یارب حکم ہو انصاف کے ساتھ
زباں کی میرے حق میں کیا گواہی — اٹھائی ہے بڑی اس نے تباہی
جو کھانا بدمزہ اس کو کھلایا — تو پانی نیم گرم اس کو پلایا
یہ مجھ سے مانگتی تھی چٹ پٹی چیز — میں دیتا تھا اسے بے مرچ کی چیز
شکر یہ مانگتی تھی خالق پاک — میں کہتا تھا تمہاری منہ میں خاک
دہی دودھ اور دنیا کی بلائیں — یہ کہتی تھی مرے حصے میں آئیں
مجھے منظور اپنے نفس پر جبر — کہ تا اس کو ہو کچھ کچھ عادت صبر

غرض میری زباں دشمن ہے میری — اب آگے تو ہے حاکم رائے تیری

یہ سب تیری طرف ہیں پاکے قابو — الٰہی آج ہو میری طرف تو
مرے اعضا نے بھی منہ مجھ سے پھیرا — نہیں تیرے سوا اب کوئی میرا
جو کچھ منظور ہو وہ حکم پاؤں — کہے جنت، کہے دوزخ کو جاؤں؟

آخر میں حکم خداوندی کیا ہوتا ہے؟ اس منظوم حکایت کو پڑھ کر معلوم کیجئے۔ مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا ہے کہ: مصور کا کمال یہی ہے کہ ہمارے سامنے ایسے خاکے پیش کرے جس کے نقوش اجاگر کرنے میں ہمارا سوئے قلم رواں دواں چلے: ـــــ دراصل ایسے شاہکار کے لئے: نقطہ: عروجی حیثیت رکھتا ہے۔ منطق اور اقلیدس کا اصول بھی یہی ہے، فرض کی اہمیت کا احساس ہی، سارے مسائل کا حل ہے۔ اسی طرح نقطہ کے سامنے ایک سے نو تک کے عدد غیر اہم ہیں۔ اہمیت اور لاتعدی کا تصور اسی نقطہ یا صفر کے اضافہ سے ہوتا ہے، اور غالب کا یہ شعر۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

بھی: نقطہ: ہے اور امیر مینائی مرحوم کی مثنوی: ابرکرم: کی یہ حکایت، وہ مختلف خطوط ہیں جو مختلف سمت کو پھیلے ہوئے ہیں۔

مثنوی ابرکرم کی کتابت خوش نما اور دیدہ زیب ہے۔ طباعت بھی پاک وصاف ہے جو نسخہ میرے پیش نظر ہے اس میں ۴۸ منظوم حکایات، خاتمہ اور مطبع کی وجہ طباعت ملا کر کل ۴۴ صفحات ہیں۔ کاغذ کسی زمانے میں عمدہ رہا ہوگا، اب تو اس کا رنگ میلا اور بوسیدہ ہو چکا ہے لیکن مثنوی اتنی پاک وصاف اور شستہ و رواں زبان میں نظم کی گئی ہے کہ دل بار بار پڑھنے کو چاہتا ہے۔ تصنع اور آورد کا نام تک نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سعدی کی بوستاں پڑھ رہے ہیں۔ اخلاقی اور پند و نصائح سے بھرپور مضامین

اس دل آویز انداز میں نظم کئے گئے ہیں کہ قاری کا ذہن، اس کے مثبت پہلو سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ درد و غم اور حزن و الم کا بیان بھی موثر ہے:

کہا ہر ایک نے اس سے کہ اے مرد — نہیں محسوس کیا اس چوٹ کا درد
کہا اس نے کہ حاضر ہے مرا دوست — میں ہوں منظور ناظر ہے مرا دوست
کروں میں درد کی کس سے شکایت — سناؤں کس کو میں کہہ کر حکایت
گلہ بے فائدہ کرنے سے حاصل — وہ خود ہے واقف اسرار ہر دل
(صفحہ ۵)

اسی مثنوی کے ص ۲۳ پر ابراہیم ادھم سے ایک روایت نظم کی ہے۔ بائیس شعر کے بعد ملاحظہ ہو:

طواف کعبہ کرتا تھا میں ایک روز — کہ آئی ایک آواز جگر سوز
اس آواز حزیں پر پس گیا دل — ہوا مجھ کو طواف کعبہ مشکل
ادھر دیکھا، ادھر دیکھا کہ کیا ہے — یہ کس کی ہے صدا، کیا ماجرا ہے
یکایک ایک جانب جو پڑی آنکھ — اسی عبد مسیحا سے لڑی آنکھ
کہ ہاتھوں میں تو ہے دامان کعبہ — وہ ہے سو جان سے قربان کعبہ
نیاز و عجز سے سر بر زمیں ہے — زباں پر ذکر رب العالمیں ہے
نہ گستاخی، نہ وہ باطل ہیں اقوال — خدا سے کر رہا ہے عرض احوال

حالانکہ اس سے قبل، اسی مرد آزاد عبد المسیح کی کیفیت یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ حج کعبہ کی زیارت کے لئے محض تماشبیں کی حیثیت سے ہم سفر تھا:

کہا اس نے میں ہوں اک مرد آزاد — مزا ہے سیر کا خاطر ہو تا شاد
سنا ہے واں مسلمانوں کا احوال، — کہ سب کرتے ہیں دیوانوں کے افعال
منڈا کر سر بناتے ہیں نیا روپ — کئی دن تک دکھاتے ہیں نیا روپ

اٹھا لیتے ہیں کنکریاں زمیں سے — کہیں پھینک دیتے ہیں ان کو کہیں سے
مرے سر میں بھی یہ سودا سمایا — ہوائے شوق نے مجھکو اڑایا
تماشا دوست میری ہے طبیعت — اسی سے کی گوارا یہ مشقت

لیکن جب عبد سمیع مسلمانوں کو ایک نئے روپ میں دیکھتا ہے، تو اپنا ہوش گم کر لیتا ہے، سادگی، سچائی، بے ریائی کے روح پرور مناظر اور کعبے سے: عشق، کی نئی طرح، اس پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوئی ہے کہ وہ: ہمہ اوست: کا قائل ہو کر کہنے لگتا ہے:

خبر ہے پاؤں کی مجکو نہ سر کی — سراپا لو لگی ہے اب ادھر کی
یہی جی چاہتا ہے اب کہ یہ گھر — کسی صورت سے رکھ لوں دل کے اندر

عشق کی عجب خاصیت ہے، یہ جب مائل بہ انداز فطر ہوتا ہے تو اس کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔ آتش نمرود بھی گلزار ابراہیمؑ ہو جاتی ہے۔ سرزمین کربلا بھی بوترابیؑ ہو جاتی ہے اور بہشتر تن و ذریت رسولؐ خاک و خون کی تمیز بھی نہیں کرتے عشق صادق ہو تو یہ زحمتیں نظر میں نہیں سما سکتی ہیں۔

مثنوی ابر کرم کی اشاعت اول: مطبع نظامی۔ کان پور: سے ۱۲۸۹ سال محمدی میں ہوا تھی۔ طبع ثانی: مطبع قومی پریس لکھنؤ: سے ۱۳۲۴ سال محمدی میں ہوئی۔ دونوں اشاعت کے آخری صفحات میں خاصا فرق ہے۔ طبع ثانی کی آخری حکایت: انس سے اس روایت سنہ ہے: کے خاتمہ پر ہو جاتی ہے، آخر میں یہ عبارت درج ہے[1]

خاتمۃ الطبع

الحمد للہ و المنۃ بفضلہ خالق اکرم دریں ایام مبارک انجام کتاب لاجواب مثنوی ابر کرم

---

[1] طبع ثانی کا نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا اس کا قلمی نسخہ بخط حاجی سید وصی احمد صاحب بلگرامی کلکٹر دربھنگہ صوبہ بہار، حال مقیم کراچی، پیش نظر ہے۔

مصنفہ ملک الشعرا جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی لکھنوی مرحوم[1] بہ حسن صحت تمام
پریس واقع لکھنؤ چوک میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر مقبول خاص و عام ہوئی ۱۳۲۴ء

طبع اول: مطبع نظامی، کان پور: کے صفحہ ۴۳ پر ختم حکایت کے بعد خاتمۃ الطبع کی منظوم عبارت یہ ہے، یہ عبارت حاشیہ سے شروع ہو کر ص ۴۴ کے حاشیہ پر ختم ہوتی ہے:

خاتمۃ الطبع

پس از حمد خدا و نعت سرورؐ　　ثنائے آل و اصحاب پیمبرؐ
صفت واجب ہے اس حاتم کی مجھ پہ　　نہیں جس کا ہے کوئی آج ہم سر
جہاں میں عام ہے اس کی سخاوت　　دیا ہر ایک کو حسب لیاقت
زر گل سے بھرا صحرا کا داماں　　ہوا ہے رام پور اس سے گلستاں
خدیو دہر، وہ رشک گلستاں　　کہ جس کا نام ہے کلب علی خاں
تعالی اللہ زہے سردار والا　　نہیں جس کا جہاں میں کوئی ہمتا
ہیں اس سرکار میں وہ ساز و سامان　　کہ جس کو دیکھ کر حیراں ہو انساں
وہ اہل علم و فن ہیں جمع اس جا　　کہ ان کا مثل عالم میں نہ ہوگا
خصوصاً وہ امیر[2] نکتہ پرور　　کہ نام ان کا ہے احمدؐ سے منور
وہ مینائی زمانے میں ہیں مشہور　　لکھی اک مثنوی نورؐ علیٰ نور
نضارت بخش گلزار ارم ہے　　خدا کے فضل سے ابر کرم ہے

---

[1] طبع ثانی میں مرحوم تحریر ہے۔
[2] طبع اول کے حاشیہ پر لکھا ہے: یعنی منشی امیر احمد صاحب مدظلہٗ
یہ مثنوی امیر مینائی نے ۵۴ سال کی عمر میں نظم کی تھی۔

فصاحت کیوں نہ ہو ان کے سخن میں
وہ سحبان زماں ہیں اپنے فن میں

ہوئی یہ مثنوی جب بدرِ کامل
تو شاکر کا منور ہو گیا دل

تمنا پھر ہوئی یہ میرے دل کو
کہ یہ مطبوع و شائع ہر طرف ہو

جو شاکر کا نظامی ہے یہ مطبع
اسی سرکار میں اس کا ہے مرجع

تو اس مطبع میں، میں نے اس کو چھاپا
الٰہی کر اسے مقبول دلہا

ہوئی تاریخ کی پھر فکر ناگاہ
تو یاد آئی مجھے تاریخ دل خواہ

وہ تاریخ اس طرح زیب رقم ہے
نفیسہ مثنوی ابرِ کرم ہے
۱۲۸۹ھ

قطعۂ تاریخ دیگر

یہ مثنوی جو چھپی مطبع نظامی میں
اوٹھا کے ہاتھ میں میں نے بوقت فکر قلم

کیا جو غور تو فوراً یہ مصرعۂ تاریخ
لکھا، نفیس چھپی مثنویِ ابرِ کرم
۱۲۸۹ھ

تمت

لیکن اسی صفحہ ۴۴ کے حاشیہ پر یہ عبارت درج ہے:
" الحمدللہ والمنتہ کہ یہ مثنوی ابرِ کرم تصنیف لطیف افصح دوراں سحبان زماں دبیر بے نظیر مقبول بارگاہ حمد جناب منشی محمد امیر احمد صاحب مینائی[1] متخلص امیر گیارھویں جمادی الاول ۱۲۸۹ھ کو زیور طبع سے مزین ہوئی۔

---

[1] مختصر حالات:
امیر احمد خلف کرم محمد۔ بسلسلۂ نسب مخدوم شاہ مینا قدس سرہٗ سے ملتا ہے۔ اسی لئے آپ مینائی کے مشہور نام ہوئے۔ امیر کی ولادت دوشنبہ ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ بہ عہد نصیر الدین حیدر، شاہ اودھ، لکھنؤ میں ہوئی۔ سید مظفر علی خاں اسیر لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ (باقی ص ۱۰۲ پر)

اس کے بعد جلی حروف میں لکھا ہے :

(بقیہ ص ۱۰۱ سے) تصانیف یہ ہیں :

ارشاد السلطان و ہدایۃ السلطان	: نذر واجد علی شاہ
غیرت بہارستان	: مجموعہ کلام ابتدائی
سرمۂ بصیرت	: عربی فارسی کے غلط الفاظ کی لغت
بہار ہند	: اردو مصطلحات ومحاورات
نور تجلی و ابر کرم	: مثنویات، حکایات وروایات
صبح ازل، شام ابد وغیرہ	: احوال رسول اکرمؐ
نماز کے اسرار	: احکام شرعیہ وادعیہ
زاد الامیر فی دعوات البشیر والنذیر	: ادعیہ مسنونہ
خیابان آفرینش	: تذکرہ رسول خداؐ
جوہر انتخاب، گوہر انتخاب	: مفردات اردو
دیوان قصائد وغزلیات	: دیوان
محامد خاتم النبیینؐ	: نعتیہ کلام
انتخاب یادگار	: تذکرہ شعرائے رام پور
مراۃ الغیب	: دیوان امیر مینائی
صنم خانۂ عشق	: دیوان عشقیہ کلام
شعلۂ جوالہ	: مجموعہ واسوخت
امیر اللغات	: اول، دوم، سوم (نامکمل)

امیر مینائی کی وفات ۲۰ جمادی الآخرہ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد دکن میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے

وجہ مہر کی خاتمہ پر

واسطے سند اس بات کے کہ یہ مثنوی مطبوعہ مطبع نظامی ہے۔ مہر و دستخط مہتمم ثبت کیے گئے۔ فقط

مہر: محمد عبدالرحمن خاں بن حاجی محمد روشن خاں حنفی ۱۲۱۳ھ

دستخط: العبد

(خط شکستہ) محمد عبدالرحمن خاں بن حاجی روشن خاں حنفی بقلم خود

دونوں اشاعتوں کی تفصیلی وضاحتوں کے بعد۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ طبع اول میں خاتمۃ الطبع: کی جو منظوم عبارت درج تھی، اسے طبع ثانی میں نظرانداز کر دیا گیا اور اس امر کی، کوئی نشان دہی بھی نہیں کی گئی کہ مثنوی ابرکرم اس سے قبل شائع ہو چکی ہے، نہ ہی مطبع کا ذکر کیا گیا ہے۔ دونوں اشاعتوں میں ۳۵ سال کا فرق ہے۔

مثنوی ابرکرم (طبع اول) کی ابتدا حمد سے کی گئی ہے:

کروں لب آشنا حمد خدا سے جو لوں تعلیم پہلے مصطفیٰؐ سے

اس کے بعد نعت: کا شعر ہے، گریز کے دو شعر کے بعد: حاکم حضرت کلب علی خاں: کی تعریف میں تین شعر قلم بند کیے ہیں، آخری شعر یہ ہے:

امیر اس نظم نے پایا جو انجام کہا ہاتف نے رکھ ابرکرم نام

اس شعر کے بعد: روایت[1]: اور پھر: حکایت: شروع ہوتی ہے، دوسری حکایت کے خاتمہ کے بعد مناجات: نظم کی گئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ سے اس حکایت کے خاتمہ کے تحت، اپنے لئے بہتری اور نجات کی دعا کی گئی ہے۔ پہلی مناجات کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

---

[1] سہیل تستری سے ہے روایت نہایت معتبر ہے یہ حکایت

شراب عشق سے ایسا ہوں مدہوش کہ جو دیکھے کہے اللہ رے جوش
میں اس مستی میں پھر دل سم نہ ماروں جو ہوش آئے تو پھر تجھکو پکاروں

(ص ٦)

مناجات کا یہ سلسلہ آخر حکایت تک جاری رہتا ہے۔ آخری مناجات کی ابتدا اس شعر سے ہوئی ہے:

الٰہی چاہتا ہے یہ مرا دل کہ میں بے رنج ہوں جنت میں داخل

اور خاتمہ اس شعر پر ہوا ہے:

کچھ ایسی یہ کڑی منزل نہیں ہے مجھے مشکل، تجھے مشکل نہیں ہے

مثنوی کی ابتدا ص ۲ سے ہوئی اور ص ۴۳ پر ختم ہوگئی ہے۔ اشعار اصل صفحہ اور حاشیہ پر بھی لکھے گئے ہیں۔ مثنوی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتابت وصحت کا خاص خیال رکھا گیا ہے، ممکن ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو، کہ یہ مثنوی امیر مینائی کی زندگی میں شائع ہوئی تھی۔ اس لئے انھوں نے کاپی ریڈنگ وغیرہ کا خاص اہتمام کیا ہوگا۔ مثنوی سلاست صفائی اور کتابت وطباعت کے لحاظ سے معیاری ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اور ضرورت ہے کہ اسے داخل نصاب کیا جائے۔

جذباتی ہم آہنگی

یوں تو ہمارے دیس کو اس وقت بہت سے مسائل درپیش ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ان سب میں قومی اتحاد و اتفاق کا معاملہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ قومی یک جہتی کا سب سے بڑا اور اہم عنصر جذباتی ہم آہنگی اور دلوں کا میل ہے۔ دراصل نفاق و عناد کے محرکات و اثرات کو دور کر کے، اخوت و مروت کی فضا قائم کرنے سے ہی فلاح و بہبود ہوتی ہے اور وطن کی شیرازہ بندی کا استحکام و قیام اسی طرح ممکن ہے۔ مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ مسئلہ اس وقت یکایک پیدا ہو گیا ہے۔ یہ بات اتنی ہی پرانی ہے جتنی ہماری تاریخ۔ اس لئے قومی معاشرے سے تخریبی عناصر کی بیخ کنی کے لئے ان تھک کوشش اور غیر معمولی جدوجہد درکار ہے۔ جب انسان، حیوان بن جائے، اس کے عمل میں صلح و آشتی کے بجائے قتل و غارت گری آ جائے، تو تعلیم و تہذیب کی بات محض زبانی جمع خرچ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس وقت ہمارے مفکرین و ماہرین تعلیم، قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی سے معاملات پر انتہائی سنجیدگی سے غور و خوض کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے سامنے ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن سے معاشرے میں شر پسندوں اور مفسدوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپس کی کشیدگی، کردار کی پستی اور ناگواری کے ماحول میں قومی ترقی کے امکانات کے محدود ہو کر رہ جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے نومبر ۱۹۶۰ء میں وزرائے تعلیم کی کانفرنس میں اس مسئلے پر خاص طور پر زیادہ خیال ہوا اور موقع کی نزاکت کا پوری طرح احساس کرنے کے ساتھ ساتھ، اس سلسلے میں تعلیم کے منصب کو بھی واضح طور پر سمجھا گیا۔ اس کانفرنس نے سفارش کی کہ مرکزی وزارت تعلیم ایک کمیٹی مقرر کرے جو مسئلے پر غور کرنے کے بعد قومی اتحاد کو فروغ دینے کے لئے تعلیم کے میدان میں ضروری اقدامات کرنے کے لئے تجاویز پیش کرے۔ اس سفارش کے مطابق مئی ۱۹۶۱ء میں

ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جسے جذباتی ہم آہنگی کمیٹی کہتے ہیں۔ اس کمیٹی کے صدر ڈاکٹر سمپورنا نند مقرر ہوئے۔ ان کے علاوہ نو اراکین اور تھے جو مختلف نظریات کی نمائندگی کر سکتے تھے۔ اس کمیٹی نے سوال ناموں اور ملاقاتوں کے ذریعے، جذباتی ہم آہنگی کی راہ میں حائل اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی، درسی کتابوں کا خصوصیت کے ساتھ جائزہ لیا اور تعلیمی نظام کے تقریباً سب ہی پہلوؤں پر مختلف طریقوں سے روشنی ڈالی۔ اس کمیٹی کی مکمل رپورٹ اپنی دو سو سے بھی زائد سفارشات کے ساتھ اگست ۱۹۶۲ء میں تیار ہوئی۔

عموماً قومی یک جہتی کے مسائل کو خالص علمی انداز میں دیکھا گیا ہے اور قومی مفاد کی بات اصولی طور پر منطقی دلائل کے ساتھ پیش ہوتی رہی ہے۔ ہم نے جذبات واحساسات کو بڑی حد تک نظر انداز کیا ہے لیکن قومی ذہن اور وطنیت کا جذبہ محض کسی جغرافیائی حدود کے اندر رہ کر پیدا نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ اس علاقے کے بسنے والوں میں قومیت کا احساس شدید اور حب الوطنی کا جذبہ قوی ہو، جمہوریت میں محض رعایا سے کام نہیں چلتا بلکہ افراد کو شہریت کے حقوق وفرائض بھی سمجھنے اور برتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کے ذہن میں ہم آہنگی کا مفہوم ایک غیر فطری مماثلت اور یکسانیت رکھنے والی زندگی کے ساتھ آتا ہے۔ لیکن آپس کے میل ملاپ کا مطلب یہ نہیں ہے۔ یہ تو کوئی بھی نہیں چاہتا کہ سب لوگ ایک ایک مذہب کے پیرو ہو جائیں یا صرف ایک زبان کے شیدائی بنیں۔ بلکہ اصل مقصد تو یہ ہے کہ دیس کے نواسی اپنی رنگا رنگی کے باوجود پریم کے ایک ایسے رشتے میں منسلک ہوں جس سے وطن کا خوبصورت گلدستہ تیار ہو سکے۔ سب کا اپنا اپنا رنگ پھر بھی ہم رنگ! بہت سے پھول مگر گلدستہ ایک۔

"جذباتی ہم آہنگی کمیٹی" نے دیس کے اندر انتشار پیدا کرنے والے عناصر کا جائزہ لیتے ہوئے فرقہ پرستی کی بجا طور پر مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ یوں تو ہر شہری کی قومی اتحاد قائم رکھنے کی ذمہ داری یکساں طور پر عائد ہوتی ہے لیکن اکثریت رکھنے والے فرقے پر اوروں سے زائد ہی فرائض عائد ہوتے ہیں۔ دیس کے سب ہی فرقوں اور جماعتوں کو اپنی اپنی بھلائی کے لئے سوچنے

میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ بری بات تو یہ ہے کہ کسی دوسرے کی بربادی میں اپنی آبادی کا نقشہ جمایا جائے۔ فرقہ پرستی کے علاوہ صوبائی اور علاقائی تنگ نظری بھی ایک لعنت ہے جسے اس کمیٹی نے انگریزوں کی دین کہا ہے۔ کیونکہ انگریزوں نے اپنی انتظامی سہولتوں کے پیش نظر صوبجاتی نظام قائم کیا تھا۔ ان کے عہد میں دیس کے مختلف حصوں میں علم و فنون کی نہ تو یکساں سہولتیں بہم پہنچائی گئیں اور نہ ہر جگہ ترقی کے دور کا ایک ساتھ آغاز ہوا۔ اس وجہ سے کچھ لوگ ملازمتوں میں آگے بڑھ گئے اور کچھ نے صنعتی ترقی میں فائدہ اٹھایا۔ اس اونچ نیچ کی بنا پر آپس میں بغض و حسد پیدا ہونے لگا اور غیریت بڑھنے لگی۔ جنگ آزادی کی جدوجہد نے سب کے دل ملا دیئے تھے لیکن مختلف سیاسی ریشہ دوانیوں نے علاقائی تعصب کی آگ کو بھڑکا دیا ہے۔

ان محدود معتقدات سے قطع نظر معاشی حالات کو بھی جذباتی ہم آہنگی کمیٹی نے بجا طور پر خلفشار کا ایک سبب بتایا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آزادی کے بعد تعلیم کی سہولتیں بہت بڑھی ہیں لیکن ملازمتیں اور کسبِ معاش کے ذریعے اس نسبت سے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ اس صورتِ حال نے تعلیم پانے والے اور فارغ التحصیل دونوں طبقوں میں جو بے دلی اور بددلی پیدا کی ہے، وہ نوجوان ذہنوں کو تخریبی کارروائی کے لئے اکسانے لگتی ہے۔ آخر میں زبان کا معاملہ آتا ہے جو ایک لحاظ سے تمام اسباب کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے۔ زبان کا جذبات سے بہت قریبی تعلق ہے، مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے حصول مقاصد کے لئے زبان کے معاملے میں نہ صرف بڑی بدزبانی کی ہے بلکہ دل بھی پھاڑے ہیں۔ کمیٹی کی رپورٹ میں ان خاص خاص نامساعد حالات کے تذکرے کے بعد معیار و اقدار سے بے نیازی بھی تفرقی کی ایک بڑی وجہ بتائی گئی ہے۔ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جب تک نصب العین نہ ہو، نیک خواہشات اور اعلیٰ صفات کے پروان چڑھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ رپورٹ میں اس بات کی شکایت کی گئی ہے کہ فلسفۂ تعلیم کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے اور اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اساتذہ کے تربیتی اداروں میں خصوصیت کے ساتھ فلسفۂ تعلیم کا صالح تصور پیش کیا جائے کیونکہ کردار کی تشکیل اور صحیح تربیت ہی تعلیم کے اہم مقاصد ہیں اور تعلیم کے ذریعے اقدار کا احساس دلایا جاتا ہے اور ان کی پیروی کرائی جاتی ہے۔ ہر ملک کا فلسفۂ تعلیم ہی اپنے بچوں میں صحیح نظریات پیدا کرنے کا ضامن ہوا کرتا ہے

اس [illegible] کے اس تجربے کی غرض ابھی بھی پیدا کرنا نہیں ہے۔ آج اس مسئلے پر ہماری توجہ ہی اس امر کی شاہد ہے کہ ہمارے معاشرے میں جذباتی ہم آہنگی چاہتے ہیں۔ بد نصیبی سے آج کی فلاحی اور اس فلاحی کی تعمیل کے حصول کی تو کی ذہنیتیں اور قربانیاں ابھی تمام بھی نہیں ہیں اور کسی کے بارے میں بھی یہ بدگمانی مناسب نہ ہوگی کہ وہ اس دور فلاحی کا دوبارہ خواستگار ہو سکتا ہے۔ اس اظہار اطمینان کے بعد نظام تعلیم کو بہتر و موثر بنانے کے لئے بہت سی معمولی اور اہم سفارشات کو ان کی غرض و غایت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک غیر معمولی بات یہ کہی گئی ہے کہ ملک کی تعلیمی پالیسی میں مرکزی سرکار کو ریاستوں کے نظام کی زیادہ دیکھ ریکھ کرنی چاہیے اور اس کی ذمہ داری زیادہ ہونی چاہیئے۔ رفتارِ تعلیم سے باخبر حلقے اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ابھی تک صحیح معنی میں تعلیم کا قومی نظام مستحکم نہیں ہو سکا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرکز کی مجوزہ اسکیمیں پورے طور پر ریاستی سرکار کو قابلِ قبول نہیں ہوتیں یا اس کے مشورے کو بددلی کے ساتھ آدھا ادھورا قبول کیا جاتا ہے ایک دوسری تجویز میں زبان کے بارے میں سہ لسانی فارمولا تجویز کیا گیا ہے جس سے ہندی اور غیر ہندی دونوں علاقوں کے لوگوں کو اس طور مختلف زبانیں سیکھنے کا موقع نکل آتا ہے کہ قومی سالمیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس فارمولے میں ہندی اور انگریزی کو الگ الگ زبانیں بولنے والوں کے درمیان رابطہ قائم کرنے والا کہا گیا ہے۔ اگرچہ یہ فارمولا اپنے اندر بہت کچھ کشادگی رکھتا ہے اور نیک نیتی سے اگر اس پر عمل درآمد کیا جائے تو سب ہی لوگوں کی تسکین ہو سکتی ہے لیکن ابھی تک ہمارے بعض سیاست داں اس معاملے کو محض سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھتے رہے ہیں اور اس کو اس طرح اپنا رہے ہیں کہ فارمولے کا اصل مقصد ہی فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً اتر پردیش نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ اردو زبان کے ساتھ حق تلفی کے مترادف ہو کر رہ جاتا ہے، اس کمیٹی نے چھوٹے بچوں کی تربیت، ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، تعلیم بالغان، طلبہ کی فلاح و بہبود کے کام، اساتذہ کی تربیت، درسی کتب، غرضیکہ تعلیم و تربیت سے متعلق سب ہی شعبوں کے بارے میں مفید مشورے دیئے ہیں۔ مئی ۱۹۶۳ء میں سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن" کا اجلاس پچمڑھی میں ہوا۔ اس اجلاس میں جذباتی ہم آہنگی کمیٹی کی متعدد سفارشات کی تائید کی گئی ہے اور تعلیمی نظام کی تنظیم اور تعلیم کا ایک موثر قومی پالیسی سے متعلق تجاویز کو خصوصیت کے ساتھ سراہا گیا ہے۔

جذباتی ہم آہنگی کا معاملہ ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ قومی زندگی کے سب ہی مسائل سے کسی نہ کسی طرح متعلق ہے لیکن انجام کار ہم یہی دیکھتے ہیں کہ ربط باہمی کا انحصار اس تعلیم پر ہے جو ہمارے بچے مدرسے اور کالج میں حاصل کرتے ہیں، اس لئے ہمارے تعلیمی اداروں پر سائنسی نقطۂ نظر پیدا کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ ایسا نظریہ ہی اتحاد کا سب سے موثر ذریعہ ثابت ہوا کرتا ہے۔ ایسی تعلیم سے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے میں مدد ملتی ہے برٹرینڈ رسل کا قول ہے کہ "تعصب و تشدد کی افراتفری میں اتحاد کے چند رشتوں میں سے ایک سائنسی صداقت بھی ہے جسے مشاہدے اور منطق پر اپنے خیالات و معتقدات پرکھنے کی عادت کہا جا سکتا ہے۔ اور شخصی تاثرات سے اس حد تک پاک ہوتی ہے جس قدر انسانی طور پر ممکن ہے"۔ ہماری تعلیم گاہوں میں ایسا ہی غیر متعصب ذہن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس اعتبار سے تعلیم میں طریقۂ کار کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، جس تعلیم کا ایسا ڈھنگ اپنانے کی ضرورت ہے جو سوچنے اور پرکھنے کی عادت ڈال سکے اور حالات و واقعات کی روشنی میں نتائج اخذ کرنے کا عادی بنائے۔ اس سائنسی نظریئے کے پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اساتذہ کو اس بنیادی اور حقیقی اخوت پر بھی زور دینے کی ضرورت ہے جو تمام بنی نوع انسان کے درمیان اپنے نسلی اور جغرافیائی امتیازات کے باوجود کارفرما نظر آتی ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کے جذبات سے متاثر ہوتے ہیں اور طلبہ کا مطمح نظر، ان کے اساتذہ ہی قائم کرتے ہیں، اساتذہ کی شخصیت کا اثر، طالب علموں پر پڑتا ہے۔ اس ایک چراغ سے ہی دوسرے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ اس لئے استاد کو اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں نہایت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اچھے عادات و اطوار پیدا کرنے کے لئے زور بازو سے کام نہیں چل سکتا بلکہ کردار کی عظمت کام آتی ہے۔ طلبہ کے غیر آسودہ جذبات کو ابھرنے کا موقع دینا چاہیئے اور خلوص نیت کے ساتھ ان کی تربیت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ڈر اور خوف کے ذریعے منہ تو بند کیا جا سکتا ہے لیکن خیالات نہیں بدلے جا سکتے۔ استاد کا کام، خلوص و محبت کا کام ہے اور اگر استاد پیار کی نظر کے ساتھ ساتھ صبر سے کام لے کر طلبہ کے اعمال و افعال کی درستی کرتا ہے تو وہ جذباتی طور پر مطمئن اور آسودہ طبیعتیں بنانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

نسلی، مذہبی اختلافات، لسانی اور تہذیبی امتیازات جیسے تفریق پیدا کرنے والے عناصر جمہوری زندگی کے لئے شدید خطرہ ہیں۔ ماہرینِ نفسیات نے تعصب کو دلوں سے دور کرنے کے لئے پہلی شرط یہی بتائی ہے کہ لوگوں کے مابین امتیاز نہ برتا جائے اور ان میں تفریق نہ کی جائے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تعصب صرف شخصی تعلقات کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم انجان قوموں اور اجنبی لوگوں کے بارے میں بھی عجیب عجیب معتقدات قائم کر لیتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں کچھ ایسے بندھے ٹکے تصورات جگہ پا جاتے ہیں جنھیں ہم بے جھجک حسبِ ضرورت چسپاں کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ہندوستانی عموماً انگریز کو غلیظ سمجھتا ہے اور انگریز کے نزدیک ہندوستانی گندا ہوتا ہے۔ اگرچہ بات اتنی سی ہے کہ ہندوستان کی آب و ہوا میں جسمانی صفائی تو آسانی سے ہو سکتی ہے۔ مگر ہم دیر تک صاف نہیں رہ سکتے۔ ہمارے عوام کا معیارِ زندگی بھی ایسا نہیں ہے کہ جلدی جلدی لباس بدلا جائے۔ اس صورتِ حال کے برعکس۔ انگلستان کی آب و ہوا میں جسمانی صفائی دقت طلب ہے اگرچہ بہتر لباس بیشتر لوگ فراہم کر سکتے ہیں اور دیر تک صاف ستھرا رہا جا سکتا ہے۔ لیکن ہندوستانی اور انگریز ان طبعی اور معاشی حالات سے بے خبر ایک دوسرے سے تعصب رکھتے ہیں! اسی طرح نہ معلوم کتنے تعصبات ہیں جو ایک جماعت کے افراد، دوسری جماعت کے بارے میں رکھتے ہیں اور آپس کے اختلاف کی وجہ دریافت کرکے دمگزیرے سے کام نہیں لیتے۔ علاوہ ازیں یہ بھی درست ہے کہ مختلف فرقوں کے درمیان بہت سے اختلافات بالکل حقیقی بھی ہوتے ہیں۔ ایسے اختلافات کو ان کے پس منظر میں بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تھوڑی سے سوجھ بوجھ اور صفائی کے ساتھ ایسے امتیازات کو واضح کیا جائے تو تعصبات جگہ نہیں پاتے۔ پھر بھی یہ سب باتیں ایک لحاظ سے سطحی کہی جا سکتی ہیں کیونکہ لوگوں کے دلوں میں اکثر تعصبات اوائل عمر ہی میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ یہ تعصبات عموماً کسی ذاتی مشاہدے یا تجربے کا نتیجہ نہیں ہوا کرتے ہیں بلکہ لوک کہانیوں اور گیتوں، حکایتوں، تقریروں اور باتوں کے ذریعے نادانستہ طور پر نئی نسل کو کلچر کا ترکہ بنا تے رہتے ہیں۔ لہٰذا تعصبات کا مسئلہ اپنے اندر بڑی گہرائی رکھتا ہے۔ ایک ہی سماج کا با اثر طبقہ، ان لوگوں سے گرانی محسوس کرتا رہتا ہے جنھیں اپنا حریف گردانتا ہے۔ اس وقت ہمارا دیس ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہے۔ صنعتی اور معاشی انقلاب کا آغاز ہے۔ آزادی کے بعد

غیر معمولی طور پر نقل مکانی کی مصیبت سے بہت سے لوگوں کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ ان سب تغیرات نے تعصبات میں کچھ اور اضافہ کیا ہے اور ہم آہنگی کی راہ میں مزید رکاوٹ ثابت ہوئے ہیں۔

کیا ان تعصبات کا کوئی حل ہے؟ واحد حل تو کوئی نہیں۔ اور نہ کسی ایک نہج پر معاملہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ یہ مسئلہ نفسیاتی ہونے کے علاوہ معاشی، سماجی، سیاسی اور تاریخی بھی ہے لیکن یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ تعلیم ہی کے ذریعہ تعصبات کی روک تھام ممکن ہے۔ اس باب میں سب سے پہلی بات تو یہ کہی جاتی ہے کہ تعلیم کی بنیاد ذاتی مشاہدے اور تجربے پر رکھی جائے اور جماعتوں کے تذکرے کے بجائے افراد کے بیان پر زور دیا جائے۔ مثلاً بچوں کو جاپانیوں یا مصریوں کے بارے میں محض ایک جماعتی تصور سے روشناس کرانے کے بجائے، افراد کی زندگی کی ایسی تصویر پیش کی جائے جس سے ان کے مختلف النوع ہونے کا اندازہ ہو سکے اور سب کی اپنی اپنی خصوصیات اجاگر ہو جائیں۔ اس کے علاوہ یہ مشورہ بھی مناسب ہے کہ بچوں کے ادب میں مختلف جماعتوں کے آپس کے تعلقات اور میل ملاپ کو اس طرح داخل کیا جائے کہ ربطِ باہمی کا احساس فروغ پا سکے اور سماجی تعلیم کچھ اس ڈھنگ سے دی جائے کہ جماعتوں کی تفریق کے بجائے ان کی انفرادیت کا احساس قائم ہو سکے۔ لیکن ان تمام باتوں سے بڑھ کر بچوں کی اپنی عملی زندگی سے تعصبات سے محفوظ رکھنے کا موثر ڈھنگ یہی ہے کہ اشتراکِ عمل کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ جذباتی ہم آہنگی بھی ایک سماجی عمل ہے۔ آپس کا میل ملاپ صرف ایک دوسرے کو سمجھنے اور اپنے آپ کو حالات کے سانچے میں ڈھالنے پر آمادہ کرتا ہے بلکہ اس طرح دلوں کا کھوٹ بھی نکل جاتا ہے۔

"معلم"

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائیٹل: دیال پرنٹنگ پریس دہلی

APPROVED REMEDIES for QUICK RELIEF

for COUGHS & COLDS
CHESTON
SYRUP

for ASTHMA
ALERGIN
TABLETS

TONIC FOR STUDENTS
...IN WORKERS
...SPHOTON

for FEVER & FLU
QINARSOL

...ON
...ERA

PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES
Cipla
BOMBAY 8

...ABLE AT ALL CHEMISTS

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۹ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۳ء | شمارہ ۳

فہرست مضامین

مجلسِ ادارت

پروفیسر محمد مجیب　　ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ　　ضیاء الحسن فاروقی

عبداللطیف اعظمی (مرتب)

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

جینے کا سلیقہ

پروفیسر خواجہ غلام السیدین

(پیشِ نظر مضمون دراصل ایک توسیعی لکچر ہے، جو شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام ۲۸ مارچ ۱۹۶۳ء کو دیا گیا تھا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ جلسے کے صدر تھے۔)

جب مجھے یہاں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی تو موضوع کے انتخاب میں مجھے خاصی مشکل پیش آئی۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ "جینے کا سلیقہ" (یعنی آرٹ آف لیونگ) کے عنوان سے اپنے کچھ خیالات آپ کے سامنے پیش کروں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کے بعض پہلوؤں پر کبھی کبھی میں نے اظہارِ خیال کیا ہے، دوسرے میں سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹی کے طلبہ اور استادوں کو اس کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا ضروری ہے۔ ایک لحاظ سے یہاں جس قدر علوم پڑھائے جاتے ہیں، وہ سب ایک ذریعہ ہیں زندگی کو شرافت اور کامیابی کے ساتھ بسر کرنے کا، ان قدروں کی پہچان کا جو اس کو گہرائی اور معنی بخشتی ہیں، اس اندازِ فکر و نظر کی تربیت کا جو دماغ کو خوب اور ناخوب میں تمیز کرنا اور انسانی رشتوں میں محبت و غیریت برتنا سکھاتا ہے، لیکن مجھے اندیشہ یہ ہے کہ اپنے بندھے ہوئے معمول کو پورا کرنے اور امتحان پاس کرنے اور کرانے کی مشغولیت میں ہمارے طلبہ کی شخصیت اور قدروں پر مدرسوں اور کالجوں کی زندگی کا اثر ضرور پڑتا ہے لیکن یہ ضمنی اثر ہوتا ہے، ان کی توجہ اور فکر کا مرکز نہیں بنتا۔ بہت سے استاد یہ نہیں سوچتے کہ وہ اپنے طلبہ کو کس قسم کے ذہنی اور اخلاقی سانچوں میں ڈھال رہے ہیں اور جب وہ امتحان کی منزل پھلانگ کر دنیا کے امتحان خانے میں قدم رکھیں گے، اس وقت ان کے دل و دماغ کے کیسے میں کن قدروں

کی بدولت ہوگی۔ یعنی ان کے دماغوں میں فکر کی روشنی ہوگی یا نہیں، دل گداز سے آشنا ہوں گے یا پتھروں کے رشتہ دار، ان کی آنکھوں کو حسن کی پرکھ اور کانوں کو موسیقی سے لطف اندوزی کی صلاحیت ملے گی یا وہ اس دنیائے رنگ و بو سے گونگوں اور بہروں کی طرح گذر جائیں گے۔ اگر یونیورسٹی کے ماحول میں ان کی چھپی ہوئی، سوئی ہوئی قوتیں نہ جاگیں تو کہاں جاگیں گی؟ یہی تو وہ ماحول ہے جہاں انسان کی میراث کو جس میں حسن اور حق کی، خیر اور عدل کی، خدمت اور محبت کی ساری دولت ملتی ہے، ایک دل کش انداز میں سمو کر طالب علم کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے جہاں زندگی کے ایوان کے سارے دروازے کھول کر طالب علم کو کائنات سے روشناس کیا جا سکتا ہے، جہاں حکمت کو ہر صاحب ایمان کی، ہر سچ کے متلاشی کی کھوئی ہوئی پونجی سمجھا جا سکتا ہے، کہ جہاں کہیں اسے مل جائے اس کا مال ہے۔ اس کے واسطے نہ جغرافیہ کی قید ہے نہ تاریخ کی، نہ زبان کی، نہ نسل کی، نہ قوم کی، نہ مذہب کی۔ تہذیب اور تمدن کی یہ دولت انسان کو اس قدر مالامال کر سکتی ہے کہ وہ قارون کی دولت اور ہٹلر کی قوت کو ٹھکرا سکتا ہے۔

اگر یونی ورسٹی اپنے فرض کو پہچانے تو اس کے پاس نوجوانوں کی تربیت کے لئے کیا کیا بیش بہا وسیلے نہیں ہیں؟ سائنس جس سے فطرت کے راز کھلتے ہیں اور قوت ہاتھ آتی ہے، مذہب جس سے کائنات میں نظر پیدا ہوتی ہے، ادب جس میں نہ صرف لطف اندوزی کے اتھاہ ساگر ہیں بلکہ جس کے ذریعے صحیح جذبات اور قدریں نشو و نما پاتی ہیں، تاریخ جو نظر میں وسعت اور توازن پیدا کرتی ہے اور ماضی، حال و مستقبل کے رشتوں کی تفسیر کرتی ہے، ٹکنولوجی جس کے ذریعے انسان نے مادی دنیا کو تسخیر کیا ہے اور دنیا کی پیداوار میں بے اندازہ اضافہ، اور فنون لطیفہ جن میں انسان اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے اور زندگی میں حسن اور مسرت کے سرچشمے تلاش کرتا ہے۔ اور پھر تہذیب و تمدن کے اس خزانے میں ہر زمانے، ہر قوم اور ہر مذہب نے اپنا اپنا خراج پیش کیا ہے جو انسان کی مشترکہ دولت ہے مثلاً ہندو دھرم کا اصرار کہ زندگی کا ہر شکل میں احترام کرو، بدھ مت کی تعلیم کہ اہنسا کو زندگی کا مرکز بناؤ اور نفرت کو بیا

چونکہ وہ جمیعت کا پیغام رحمت، محبت اور اسلام کا انسانیت اور معاشرتی انصاف تصور جو اخوت اور مساوات کی بنیاد ہے۔ اس لئے ہمارے معلمین اور ماہرین تعلیم کو یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ کسی جز و کی دیکھ بھال میں کل کو نہ بھول جائیں۔ زندگی کے باغ میں الگ الگ درختوں کو دیکھیں لیکن باغ ان کی نظر سے اوجھل نہ ہو جائے۔

علوم کی دولت کے علاوہ یونیورسٹی میں اور بھی بہت سے قیمتی تحفے اس مسافر کے کیسے میں ڈالے جائیں گے۔ تلاش حق کی مسرت، ادب اور فنون لطیفہ کی محبت، دنیائے معنی کی تسخیر کا شوق، ہم خیال اور ہم شغل ساتھیوں کی رفاقت جو نسل اور رنگ و زبان کے اختلافات سے بلند ہے۔ ان ہی سب کے تال میل سے زندگی کا وہ تصور، انسانی شخصیت کی وہ تصویر اور سماج کا وہ نقشہ تیار ہوتا ہے جو ذہنی اور اخلاقی دیانت رکھنے والوں کے لئے چراغ راہ بن جاتا ہے۔
اب اگر یونیورسٹیاں اس فرض کو انجام نہ دیں گی تو کون اس کی ذمہ داری لے سکتا ہے؟۔ کیا سیاست کا پلیٹ فارم جہاں قوت کا کھیل کھیلا جاتا ہے اور اخلاق کی بازی لگائی جاتی ہے؟ یا روپیہ کمانے کا چور بازار جہاں عزت سستی اور کم عیار ہے اور دولت عزت کا معیار ہے؟۔ اس لئے بس یہی ایک پلیٹ فارم ہے جہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے!

انسانی شخصیت کی تربیت کے لئے بہت سی شرطیں اور اثرات ضروری ہیں لیکن ان میں سے تین سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اول نیک اور شریف انسانوں کی صحبت، جن کی ذات میں ہمیں اعلیٰ اخلاق اور قدروں کا جلوہ بے نقاب نظر آتا ہے۔ دوسرے اچھی اور بلند پایہ کتابیں، جو گزری ہوئی نسلوں کی فکر و نظر کی دولت کو اس نسل تک پہنچاتی ہیں اور شریف اور بلند نظر افراد کے ان خوابوں اور آرزوؤں کی جھلک ہمیں دکھاتی ہیں، جو انھوں نے مستقبل کے بارے میں دیکھے ہیں۔ وہ ایک طرف تو انسانی نسل کے لئے حافظہ کا کام کرتی ہیں اور ماضی کو حال سے جوڑتی ہیں اور دوسری طرف حال کے ڈانڈے مستقبل کے ساتھ ملاتی ہیں۔ تیسرے اچھا اور سچا کام، جس کو ایمانداری اور خلوص اور شوق کے ساتھ کیا جائے جس کے بغیر

زندگی میں معنی پیدا ہوتے ہیں ہر رنگ کا کام جس کو سچے صناع اور دستکاروں کی طرح فخر اور محبت کے ساتھ کیا جائے جس میں انسان اپنی بہترین صلاحیتوں کا مکمل اظہار کر سکے جس میں عبادت کی سی کیفیت ہو کام جس کے سانچے میں انسان کی سیرت اور شخصیت ڈھلتی ہے جس سے حسن آرٹ اور قوت پیدا ہوتی ہے، کام جس میں کبھی دوسرے انسانوں کی رفاقت کا لطف نصیب ہوتا ہے اور کبھی مہتاب کی سی تنہائی میں خونِ جگر جلا کر انسان حسن آفرینی کرتا ہے یا فطرت کے بھیدوں کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے۔ اچھا اور سچا کام جو آدمی کو دستکار بناتا ہے، کلاکار بناتا ہے، سائنٹسٹ بناتا ہے، سماج سیوک بناتا ہے۔ کیوں ذکر کیا میں نے ان تین مقدم اور لازمی شرطوں کا؟ ـــ اس لئے کہ جینے کا سلیقہ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر تعلیم گاہ اور خاص کر یونیورسٹی طلبہ کو فیض کے ان تینوں سرچشموں سے فائدہ اٹھانے کا موقع دے۔ جس یونیورسٹی میں قابل، علم دوست، صاحب فکر و نظر استادوں کی کمی ہے، جہاں اسٹاف کا تقرر قابلیت اور ذاتی شرافت اور شخصیت کے معیار پر نہ ہو، بلکہ اس میں اقربا نوازی، یعنی ذات پات، مذہب زبان اور صوبے کے بندھنوں کو دخل دیا جائے وہ ودّیا کا مندر نہیں، وہ دیانت اور شرافت کا حرم نہیں، بلکہ زندگی کے ایک غلط اور گھٹیا تصور کو عام کرنے کا کارخانہ ہے۔ یہ امید کرنا تو خوش فہمی ہے کہ ہر قسم کے سرکاری اور قومی ادارے، خواہ وہ سماجی ہوں یا سیاسی یا اقتصادی گھٹیا اور کم مایہ لوگوں سے پاک رہ سکتے ہیں، لیکن دل میں یہ آرزو ضرور سر اٹھاتی ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں جہاں آنے والے زمانے کا سانچہ ڈھل رہا ہے، ان اثرات سے محفوظ رہیں جن کی بدولت ہمارا ملک اس وقت ایک خطرناک اخلاقی بحران میں سے گذر رہا ہے۔

تربیت کا دوسرا سرچشمہ کتابیں ہیں جن سے دوستی اور محبت کئے بغیر ایک اچھی زندگی اور اچھے دل و دماغ کی بنیادیں نہیں قائم ہو سکتیں۔ لیکن حال یہ ہے کہ ہمارے بیشتر طلبہ، بلکہ بہت سے استاد بھی، علم و ادب کے ان سرچشموں سے فیض حاصل نہیں کر پاتے۔ دریا کے کنارے پہنچتے ہیں لیکن اپنی پیاس نہیں بجھاتے۔ بعض دفعہ امتحان پاس کرنے یا کرانے کے لالچ میں کنکریوں سے کھیلتے ہیں، لیکن سمندر کی جاں بخش لہروں سے دور رہتے ہیں۔ اگر وہ یونیورسٹی میں رہ کر بھی اقلیم معنی سے

جو کتابوں کے ذریعہ پہنچائی جا سکتی ہے، اجنبی رہیں گے تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ زندگی کے جھمیلوں میں پڑنے کے بعد انھیں اس بات کا دماغ ہو یا شوق یا فرصت؟ انھوں نے پڑھنے کا فن تو سیکھا ہے لیکن نہ پڑھنے کا شوق ہے، نہ صلاحیت، نہ ذوق۔ وہ یا تو سرے سے کتابیں پڑھتے ہی نہیں یا گھٹیا، بے معنی کتابیں پڑھتے ہیں اور سستے رومانی ناول اور افسانے جن میں وقت تو کٹ جاتا ہے لیکن نہ دماغ میں روشنی پیدا ہوتی ہے نہ دل میں انسانیت کی نرمی اور گرمی۔ جو لوگ زیادہ تر انھیں چیزوں کو اپنی ذہنی غذا بناتے ہیں وہ کچھ عرصے کے بعد اس قابل نہیں رہتے کہ اعلیٰ اور لطیف ادب سے لطف اٹھا سکیں۔ جس طرح بازار میں کھوٹا سکہ کھرے سکے کو باہر نکال دیتا ہے، اسی طرح ان کی زندگی میں اس گھٹیا اور کم عیار ادب کا سکہ چلتا ہے اور بلند پایہ شاعری، ڈراما، ناول افسانے، تاریخ، سوانح عمری اور ادب کی دوسری صنفیں، جو ہر تعلیم یافتہ شخص کی میراث ہیں، ان کی زندگی میں گہرائی اور معنی نہیں پیدا کرتیں۔ جب تک ادب کا خوش مذاق مطالعہ ایک تعلیم یافتہ شخص کی زندگی کا جزو نہیں بنتا وہ میرے نزدیک تعلیم یافتہ ہی نہیں۔ اور صرف ادب ہی نہیں بلکہ اپنی زبان پر قدرت اور مختلف زبانوں سے واقفیت بھی، آدمی کو انسان بنانے کے لئے ضروری ہے۔ زبان فرد اور قوم دونوں کی زندگی میں اس طرح رچی بسی ہوئی ہے جیسے شریر میں آتما، یا شمع میں روشنی۔ اسی کے ذریعہ ہمارے خیالوں میں صفائی پیدا ہوتی ہے اور دل کی بات سانچے میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔ اور اس زبان کے کیا کیا حسین روپ نہیں ہیں؟ — یہ کہیں چھوٹے بچوں کے توتلے بول بن کر ہمارا دل لبھاتی ہے، کبھی ٹیگور کے گیتوں کے سانچے میں ڈھل کر روح کو بالیدگی بخشتی ہے، کبھی ابوالکلام آزاد کی تقریر اور سروجنی دیوی کی شاعری بن کر ان میں آگ لگاتی ہے، اور کبھی گاندھی جی کی سیدھی سادی، دل سے نکل کر دل میں اتر جانے والی بولی میں دنیا کو پریم اور شانتی کا پیغام پہنچاتی ہے۔ اس لئے زندگی کے سلیقے میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ انسان گفتگو کا فن سیکھے اور اس کے ذریعہ اپنی اور دوسروں کی زندگی کو خوشگوار بنائے۔

ہمارے بزرگ عموماً اپنی مادری زبان کو بہت اچھی طرح جانتے تھے برخلاف آج کل کے

نوجوانوں کے بیوں اپنی زبان جانتے ہیں نہ انگریزی اور ایک عجیب ملی جلی بے ہنگم بولی بولتے ہیں جس میں نہ دل کشی ہوتی ہے نہ وضاحت خیال۔ میں ایسے مشاہیر کی صحبت میں بیٹھا ہوں جن کی گفتگو میں وہ لوچ، دل آویزی اور سلیقہ ہوتا تھا کہ وہاں سے اٹھنے کو دل نہ چاہے مثلاً سر تیج بہادر، سروجنی نائیڈو مولانا آزاد، سید راس مسعود، ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین یعنی یہ کیفیت کہ

"وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"

اس کشش کی وجہ محض یہ نہ تھی کہ وہ زبان پر قدرت رکھتے تھے یا رکھتے ہیں بلکہ ان کا دماغ روشن اور مرتب تھا، انھیں دراصل کچھ کہنا ہوتا تھا اور ان کی سیرت ان کے تجربوں سے مالامال تھی۔ وہ اپنے سننے والوں میں دل چسپی رکھتے تھے اور انھیں اپنی زندگی اور تجربوں میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ جمہوریت کے اس زمانے میں، جب زبان سے ترغیب اور تبادلہ خیال کا زیادہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے، اچھی گفتگو نہ صرف ایک سماجی ہنر ہے بلکہ ایک سیاسی ہتھیار بھی ہے جس کا صحیح استعمال سیکھنا ضروری ہے۔

اچھے لوگوں اور اچھی کتابوں کی صحبت کے علاوہ تیسری چیز جو اچھی زندگی کی بنیاد ہے وہ کام ہے — میں نے ابتدا میں اس بات کو اشارۃً بتایا تھا کہ کام کے بارے میں میرا کیا تصور ہے — جس کے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے اپنے ایک خطبہ میں لکھا ہے کہ "کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ کام کچھ کر کے، وقت کاٹ دینے کا نام نہیں، کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں، کام کام ہے، با مقصد محنت ہے، کام دشمن کی طرح آپ اپنا محاسبہ کرتا ہے اور اس میں جو پورا اترتا ہے تو وہ اسے ایسی خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں ملتی۔ کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔" واقعہ یہ ہے کہ انسان کی شخصیت اس وقت تک کسی حسین سانچے میں نہیں ڈھل سکتی جب تک اس کے دل میں اس انداز سے کام کرنے کی لگن پیدا نہ ہو جیقر سے حقیر کام میں معنی اور لطف پیدا ہو سکتا ہے بشرطیکہ کام کرنے والا اس کا رشتہ کسی بڑے مقصد کے ساتھ قائم کرے۔ دو مزدور ایک پہاڑی پر پتھر توڑ رہے تھے ایک رہ گذر نے پہلے سے پوچھا "تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے

جل کر جواب دیا: "دیکھتے نہیں ہو؟ اپنی قسمت کے لکھے پتھر پھوڑ رہا ہوں" ـــ ذرا اور آگے بڑھ کر اس نے دوسرے مزدور سے یہی سوال کیا تو اس نے بہت فخر اور خوشی کے ساتھ جواب دیا: "میں ایک گرجا کی تعمیر کر رہا ہوں" ـــ دیکھا آپ نے؟ پتھر وہی تھے لیکن ایک مزدور ان سے اپنی قسمت پھوڑ رہا تھا اور دوسرا ایک عبادت گاہ بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا! ہمارے ملک میں نہ صرف طلبہ بلکہ سب لوگوں کو کام کرنے کے صحیح آداب سکھلانے کی ضرورت ہے۔ کسی کام کو سرسری انداز میں کرنا گویا سر سے ایک ناگوار بوجھ اتارنا ہے۔ نہ اس میں خوشی تلاش کرنا نہ پانا، نہ اس کی حسین تکمیل میں فخر محسوس کرنا، نہ اس کے ذریعے اپنی دنیا کو سمجھنا اور اپنے ہم جنسوں کے دکھ سکھ میں شریک ہونا یہ نہ تو ذہنی دیانت کا تقاضا ہے نہ اخلاق کا! زندگی تو خدا کا ایک انمول عطیہ ہے اور وہ تمام صلاحیتیں اور ہنرمندیاں اور جوہر، جو اس کے ساتھ قدرت ہمارے کیسے میں ڈالتی ہے، ان کی قیمت انسان صرف کام کے ذریعہ اور کام کے سکے میں ادا کر سکتا ہے۔ جو شخص اس قیمت کو خوش دلی اور دیانتداری کے ساتھ ادا نہیں کرتا اس کی حیثیت میرے نزدیک ایک چور کی ہے۔ وہ خود کا چور ہے، سماج کا چور اور خدا کا چور ہے۔

لیکن جینے کا سلیقہ صرف بڑے بڑے اصولوں کی پابندی ہی پر منحصر نہیں۔ اس میں بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی شامل ہیں۔ ایک معمولی انسان کی زندگی کا ہر لمحہ ایسی سطح پر بسر نہیں ہوتا جہاں ہر قدم پر منصور کی طرح انا الحق کہنے کی ضرورت ہے۔ اس میں ان سے زیادہ اہمیت ہے، ایسی بظاہر معمولی اور چھوٹی چھوٹی صفات کی جو انسانی رشتوں میں خوشگواری پیدا کرتی ہیں۔ یہ کونسی صفات ہیں؟ آپس کے میل جول میں دوستی اور مہربانی، معاملات میں انصاف، سچائی اور بھروسہ، مل جل کر کام کرنا، دوسروں کے حقوق کی پاسداری اور ان کی رائے کا احترام، خوش مزاجی اور ظرافت اور خواہ مخواہ کی دل شکنی اور بدگوئی سے پرہیز ـــ میرا خیال ہے کہ ہماری آئے دن کی زندگی میں بہت سے نفسیاتی دکھ اور محرومیاں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ ہم اپنے دوستوں عزیزوں اور ہم جنسوں سے مہربانی، فیاضی اور ہمدردی کا سلوک نہیں کرتے۔ ان کے بارے میں

لوگوں کے سلسلے غیر ذمہ داری کے ساتھ ایسی بات چیت کرتے ہیں جس سے ان کی نیک نامی پر برا اثر پڑتا ہی یا محض تفریحاً اور کبھی محض کی خاطر ایسی گفتگو میں شامل ہو جاتے ہیں جو دوسروں کی برائی کو بغیر جانچ پڑتال کے آسانی سے مان لیتے ہیں ان کو شبہ کا فائدہ بھی نہیں دیتے بلکہ جب ہم جانتے ہیں کہ وہ بے قصور ہیں اس وقت بھی جرأت سے کام لے کر ان کے حق میں کلمۂ خیر نہیں کہتے ۔ لیکن دراصل لوگوں کے بارے میں حسن ظن رکھنا اور ان کی اچھی باتوں کی تلاش اور قدر کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم ان کی طرف سے بدظن رہیں اور ان کی عیب جوئی کرتے رہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ بعض دفعہ انسان ہر کسی کو شریف اور قابل اعتبار سمجھ کر نقصان اٹھاتا ہے لیکن اخلاقی اور سماجی اعتبار سے یہ نقصان بہت کم ہے اور دل تنگی، بدبینی اور شبہ کی ذہنیت سراسر گھاٹے کا سودا ہے ۔ جو شخص اس قسم کی طبیعت اور دل و دماغ رکھتا ہے وہ عمر بھر کے لئے ایک روگ خرید لیتا ہے اور نہ خود خوش رہ سکتا ہے نہ دوسروں کو خوش رکھتا ہے ۔ برخلاف اس کے خوش مزاجی روزمرہ کی زندگی اور رشتوں میں لطف اور شیرینی پیدا کرتی ہے اور صحیح قسم کی ظرافت بہت سی ناگواریوں کا علاج ہے، وہ ظرافت جس کا مقصد دل دکھانا نہ ہو، جو دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ حماقتوں پر طنز کرے لیکن کسی کی ذاتی تحقیر نہ کرے، جو دوسروں سے زیادہ خود اپنی حماقتوں کا خاکہ اڑائے اور اپنے بارے میں دوسروں کی ظرافت کو جھیل سکے ۔ جو شخص خود کو بہت اہم سمجھتا ہے، اپنی شان میں نہ گستاخی کر سکتا ہے نہ اسے جھیل سکتا ہے ۔ اپنے کو تنقید سے بلند اور دوسروں کو اپنے سے کم تر جانتا ہے، جس کی طبیعت میں ضبط نہیں جس کا مزاج آسانی سے بھڑک اٹھے، جو اپنی دولت یا خاندان یا منصب کو نہ بھول سکے، خود بھی ان سے مرعوب رہے اور دوسروں پر بھی ان کا رعب ڈالنا چاہے وہ جینے کے سلیقے سے بالکل ناآشنا ہے ۔ اگر تعلیم خود پسندی اور خود پرستی کے ان بتوں کو نہ توڑے اور لوگوں کو خود پر سختی کے ساتھ احتساب کرنا اور دوسروں کے ساتھ سمجھداری اور نرمی کے ساتھ پیش آنا نہ سکھلائے تو وہ زندگی کے لئے تیار نہیں کر سکتی ۔ یہ انکسار اور خود شناسی کی صفت بھی زندگی کے گوناگوں نقشے میں ایک لطیف رنگ بھرتی ہے ۔

بات صرف اتنی ہی نہیں کہ اخلاقی اعتبار سے ایک کھلا دل، ایک فیاض طبیعت تنگدلی سے بہتر ہے۔ بلکہ دوسرے لوگ جو سلوک ہم سے کرتے ہیں وہ بھی بڑی حد تک اس سلوک پر منحصر ہے جو ہم ان کے ساتھ کریں۔ اگر ہم ان کے ساتھ دوستی، نیک نیتی اور بھروسے کے ساتھ پیش آئیں تو امید ہو سکتی ہے کہ ان کا رویہ بھی ہمارے ساتھ دوستانہ ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص جو میرے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے وہ دوسروں کے ساتھ بدسلوکی کرے اگر وہ اس کے ساتھ شرافت سے پیش نہ آئیں۔ یعنی لوگ صرف سفید یا سیاہ رنگ میں رنگے نہیں ہوتے کہ سب کے ساتھ اچھے ثابت ہوں گے یا برے۔ دراصل دوسروں کی فطرت کی خوبیوں یا خرابیوں کو اجاگر کرنا ایک حد تک خود ہمارے اختیار میں ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھیے کہ یک طرفہ نیکی کرنے میں بڑی برکت ہے، خواہ لوگ اس بات کو مانیں یا نہ مانیں۔ نیکی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اکثر بدی کے ہتھیار رکھوا لیتی ہے۔ اگر ہم میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ جس بات کو نیک اور سچ سمجھتے ہیں اسے کریں اور اس کی زیادہ فکر نہ کریں کہ دوسرے کیا کہتے ہیں تو ہم دھیرے دھیرے اپنے مخالفوں کے دل کو جیت سکتے ہیں۔ نیکی بھی بدی کی طرح متعدی ہے اس کا اثر دور دور تک پھیلتا ہے اگر ہم روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں، چھوٹی چھوٹی باتوں میں نیکی اور سچائی سے کام لیں تو وہ آہستہ آہستہ ہماری ساری زندگی کے کاروبار میں راہ پا جاتی ہے اور جب کبھی ہمیں کوئی ایسی نازک اور اہم صورت حال پیش آتی ہے، جہاں ہمیں خیر و شر کی ازلی جنگ میں حصہ لینا پڑے اور اپنی تقدیر کو بنانے یا بگاڑنے والے فیصلے کرنے ہوں تو عمر بھر کی یہ عادتیں اور رجحان ہمارے کام آتے ہیں اور ہم قدرتاً خیر کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس طرح زندگی کے چھوٹے اور بڑے کاموں میں ایک منطقی رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور بقول پیغمبر اسلام کے ساری دنیا ایک "مسجد" بن جاتی ہے جہاں انسان ہر کام اس انداز سے کرتا ہے گویا وہ اپنے بنانے والے کے سامنے کھڑا ہوا عبادت کر رہا ہے۔ بہت مشکل ہے اس قسم کی کیفیت پیدا کرنا اپنے دل و دماغ میں، لیکن

یہ سب مذہبوں کی مشترک تعلیم ہے اور بہت سے مردانِ خدا نے، بلکہ بہت سے نیک اور گمنام لوگوں نے بھی واقعتاً اس شان کے ساتھ زندگی گذاری ہے۔ اور پھر کیسی قوت پیدا ہو جاتی ہے ایسے لوگوں میں کہ موت بھی ان کو زیر نہیں کر سکتی!

ایک نظر سے دیکھیے تو انسان کی زندگی ایک ٹمٹماتے چراغ کی طرح ہے جو چند لمحوں کے لئے روشن ہوتا ہے اور پھر موت کی ایک ہلکی سی پھونک اسے بجھا دیتی ہے۔ لیکن جب کوئی انسان اپنی زندگی کو بڑے مقصدوں کے ساتھ وابستہ کر لیتا ہے اور ان کی قدروں کا حامل بن جاتا ہے اور انھیں روزمرہ کی زندگی میں برتتا ہے تو کوئی آندھی اس چراغ کو نہیں بجھا سکتی۔ موت اس کے جسم کو فنا کر دیتی ہے لیکن اس کے دماغ کی جولانی، اس کے دل کا گداز، اس کی روح کی بلندی، اس کے مقصد کی تابانی قائم رہتی ہے اور تھکے ماندے، راستہ سے بھٹکے مسافروں کی ہمت بندھاتی ہے۔ اس قسم کے چراغ جلانا ہر انسان کا فرض ہے اور چراغ کا کمال یہ ہے کہ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو، ساری دنیا کا اندھیرا بھی اسے نہیں بجھا سکتا۔

لیکن انسان کی شخصیت کو صرف فکر کی روشنی اور کام کی تپسیا ہی "تاج محل" نہیں بناتی۔ اس کو جذبات کی دولت بھی ملی ہے جن کی صحیح تربیت اور ہدایت کے بغیر اس کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس مقصد کے لئے اس کی حسن شناسی اور حسن آفرینی کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور اس میں ذوقِ جمال کی شمع جلانا ضروری ہے۔ خوبصورتی سے لطف اٹھانے کی صلاحیت قدرت کی ایک انمول دین ہے۔ جو زندگی میں مسرت کا رنگ بھرتی ہے اور اس کو طرح طرح سے مالا مال کرتی ہے۔ خواہ وہ خوبصورتی عالمِ فطرت میں پائی جائے یا انسانوں کے خد و خال میں یا علم اور حق کی تلاش میں یا آرٹ اور دستکاری کی تخلیق میں۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے تاروں کو اس حسن فراواں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بناتا تو یہ صلاحیت ٹھٹھر کر ختم ہو جاتی ہے اور اس بدنصیب کو اپنے نقصان کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ کس قدر مفلس ہے وہ شخص جس کے قلب و نظر متاثر نہیں ہوتے، وہ جب

آسمان کے پس منظر میں روشنی اور سایہ کی آنکھ مچولی، بادلوں کی صورت آفرینی اور طلوع و غروب کے مناظر دیکھتا ہے، جب اس کی نظر سرسبز کھیتوں اور درختوں اور پھولوں کی خوبصورتی پر پڑتی ہے یا جب حسن کے جلوے سنگ تراش کے مجسموں، مصوروں کی تصویروں اور مغنیوں کی آواز اور سازوں سے نکل کر اس کی آنکھوں اور کانوں پر نعمتوں کی بارش کرتے ہیں۔ اگر اس کے احساس کے تار اپنی لچک اور لوچ کھو بیٹھیں، اس میں نہ ذوق جمال پیدا ہو نہ اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز باقی رہے تو اس کی تعلیم ادھوری اور ناقص ہوگی۔ میرا یہ مطالبہ نہیں کہ ہر شخص ایک کلاکار ہو۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ لیکن یہ خیال ضرور ہے کہ ہر نارمل انسان میں کلا کی قدردانی کی صلاحیت جگائی جا سکتی ہے۔

میں نے زندگی کی جن قدروں کی طرف اشارہ کیا اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ میرے نزدیک زندگی کا مقصد محض یہ نہیں کہ انسان اپنی ذات کے لئے دولت قوت اور اختیار حاصل کرے اور اپنی جائز اور ناجائز، اعلیٰ اور ادنیٰ، ضروری اور غیر ضروری خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے ہر قسم کی مادی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھائے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر ہمیں زندگی کو ایک سندر روپ میں ڈھالنا ہے تو مادی قدروں کے ساتھ ساتھ لیکن ان سے کہیں زیادہ، ہمیں اس کا رشتہ ادبی، ذہنی، اخلاقی اور جمالی قدروں سے جوڑنا ہوگا۔ مشرق اور مغرب دونوں میں مادی اور روحانی قدروں کی جنگ رہی ہے اور کبھی ایک کا کبھی دوسری کا غلبہ رہا ہے۔ جب مادیت کی طرف زیادہ جھکاؤ ہوا تو گویا مادہ نے خدا کی جگہ لے لی جب روحانی قدروں کا زیادہ زور ہوا تو رہبانیت نے زندگی کو اپنے سایہ میں لے لیا۔ لیکن ضرورت ان میں اعتدال اور توازن پیدا کرنے کی، ان کی خوبیوں کو سمونے کی ہے۔ مذہب، فلسفہ، سائنس، سیاست سب کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ انسان زندگی کو شرافت کے سانچے میں ڈھالے اور اپنی تمام جسمانی اور روحانی قوتوں کو فروغ دے۔ لیکن اس جدوجہد میں یہ نہ بھولئے کہ مادی دنیا

کی حیثیت ایک ذریعہ کی ہے جس کی تسخیر سے انسان دنیا کے معنی میں، روحانی قدروں کی اقلیم میں اپنا مقام حاصل کرسکتا ہے۔ اس تصورِ حیات میں مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی رواداری، اور وضع داری، انسانیت اور روحانی بصیرت بھی شامل ہیں اور مغرب کی روشن خیالی، ذہنی جرات، انسان دوستی، فعالیت اور عام انسانوں کی پاسداری اور احترام بھی۔ سورہ فاتحہ کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے بتایا ہے کہ روحانی تسکین کی یہ تلاش تاریخ اور جغرافیہ کی پابند نہیں، نسل اور قوم کی پابند نہیں بلکہ دنیا کے تمام نیک اور شریف آدمی، جو اس تلاش میں شریک ہیں، ایک ہی برادری کے ممبر ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جب ایک مردِ مومن خدا کے سامنے دستِ سوال اٹھاتا ہے تو وہ ایک ایسے سیدھے اور سچے راستہ پر چلنے کی دعا مانگتا ہے جو تاریخ انسانی میں سچ کے پرچاروں اور سیوکوں کا مشترک راستہ رہا ہے نہ کہ کسی خاص قوم یا گروہ یا نسل کا۔ اور جب وہ ظلم اور برائی کے راستے سے پناہ مانگتا ہے تو وہ بھی ان سب لوگوں کے راستے سے، خواہ وہ کسی قوم یا نسل کے ہوں، جو سچائی سے منہ موڑ کر ظلم اور نافرمانی کی دلدل میں جا پھنسے۔ دراصل جس کسی صاف باطن انسان نے حقیقت کو بے نقاب دیکھا ہے اس نے یہی سبق سکھایا ہے کہ آدمیت کی صرف ایک کسوٹی ہے اور وہ ہے آدمی کی عزت کرنا، ہر آدمی کی بلا لحاظ نسل و ملت، کیوں کہ اس میں نورِ الٰہی کا جلوہ ہے، خواہ وہ کتنا ہی مدھم ہو۔ جو عشق کا بندہ ہوتا ہے وہ خدائے رحمت کے طریقہ پر چلتا ہے اور کفر و دین کا فرق بھلا کر کافر اور مومن دونوں کے لئے اپنے دل کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اگر خدا نے اپنی حکمت اور مصلحت سے زندگی کا لباس طرح طرح کے کپڑوں سے تیار کیا ہے اور اس میں الگ الگ رنگ بھرے ہیں تو ہم کون ہیں جو اس بات کی ناکام اور نامناسب کوشش کریں کہ قدرت کے بنائے لباس کے بجائے سب لوگ صرف ایک ہی رنگ کے ریشم یا کھدر یا اون کو استعمال کریں؟ اگر وقت نے، جو ذاتِ الٰہی کا ایک جامہ ہے، دنیا میں مختلف

تہذیبیں، مذہب، زبانیں اور نسلیں پیدا کی ہیں تو ہمیں کہاں سے حق پہنچتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی رنگ یکسانیت میں ڈھالنے کی کوشش کریں؟ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ ــــ

"اے ہمارے (رسول) اگر تیرا خدا چاہتا تو دنیا کے تمام انسان ایک ہی مذہب کے ہوتے (یعنی ان کے عقیدوں اور نظریہ میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ لیکن اس کی یہ مشیت نہ تھی)، پھر کیا تم انھیں اس بات پر مجبور کر سکتے ہو؟ ــــ" اس لئے قدرت کے بنائے ہوئے اختلافوں کے ساتھ نباہ کرنا اور ان کو زندگی کی دولت سمجھنا بھی جینے کے سلیقے کا ایک لازمی جزو ہے۔ ہمارے شاعر اقبال نے جس کے کلام میں بعض تنگ نظروں نے اپنی مکروہ صورت کا عکس دیکھا اور اس کو تنگ نظر سمجھا، اس بارے میں ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ اس کے نزدیک عام لوگ کافر اور مومن کے لفظوں کا ٹھیک مطلب نہیں سمجھتے اور ان کا غلط استعمال کرتے ہیں ان میں اصلی فرق رسمی عقیدوں کا نہیں بلکہ دل اور دماغ کی ساخت کا ہے۔ زندگی کے بنیادی نصب العین اور آدرش کا ہے، ان سہاروں کا ہے جن کے بل بوتے وہ زندگی کو بناتا اور سنوارنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اقبال کی دنیا میں ایک نام نہاد مسلمان کافر ہو سکتا ہے اور ایک نام نہاد کافر مسلمان۔ فرق لیبل کا نہیں، اس شراب کا ہے جو ان ساغر دل میں چھلکتی ہے!

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

جس صالح زندگی کا خواب دنیا کے بہترین دماغوں نے دیکھا ہے اس کی تعمیر کے لئے اپنی خودی کی پاسداری کے ساتھ ساتھ دوسروں کی خودی کا احترام بھی ضروری ہے۔ جب تک ہم اس کی عزت نہ کریں گے ان کے لئے خیالات، عقائد اور اعمال کی (خواہ وہ ہم سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں) وہی آزادی نہ چاہیں گے جو اپنے لئے چاہتے ہیں، جب تک ہم رواداری کو اپنی کشتی کا بادبان نہیں بنائیں گے ہماری اپنی خودی پھل پھول نہیں سکتی۔ یہ وہ سچی اور گہری رواداری ہے جو میں اور تو کے فرق کو بھلا کر دوسروں کے لئے بھی وہی اچھی چیزیں چاہتی ہے جو اپنے لئے

جو اختلاف کے اندر بھی ایکتا کی تلاش کرتی ہے، جو دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتی ہے آج کل کی دنیا میں اس ذہنیت کی جتنی کمی ہے اتنی ہی اس کی اہمیت ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "آندھی میں چراغ" میں لکھا ہے اس زمانے میں کوئی سبق، کوئی پیغام، فکر کی کوئی یاترا مذہب کا کوئی اصول اس قدر اہم نہیں، جتنا یہ سیدھا سادا، پہاڑوں جیسا پرانا، سمندر جیسا گہرا، سورج جیسا روشن، گلاب جیسا شگفتہ، شبنم سحر جیسا نیا پیغام کہ اپنے دل اور دماغ کے دروازوں کو کھول دو تاکہ تعصب اور تنگ نظری اور نسلی حسد کے جالے صاف ہو جائیں، تاکہ انسان، انسان کو اس کے سچے روپ میں دیکھ سکے، تاکہ محبت کی دھیمی روشنی اور ٹھنڈی ہوا، بند غنچوں کو پھول بنا دے، تاکہ انسان ایک دوسرے کا خون پینے اور خون بہانے کے بجائے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بننا سیکھیں، تاکہ علم اور سائنس کی فتح مندیوں نے اس کو جو بے اندازہ قوت بخشی ہے وہ انسان کی سیوا کے لئے، تخلیقی جدوجہد کے لئے، زندگی کی گود کو فراغت، خوش حالی اور اطمینان سے بھرنے کے لئے استعمال ہو سکے۔"

میں نے اب تک ان مختلف سروں کا ذکر کیا، چھوٹے اور بڑے، جو زندگی کے نغمے میں سموئے ہوئے ہیں مگر میں نے خود سے اکثر یہ بھی پوچھا ہے کہ آیا کوئی ایسی مرکزی قدر بھی ہے جس کے گرد زندگی گھومتی ہے اور جس سے وہ اپنی تمام شرافتوں اور کامرانیوں اور مسرتوں کے لئے فیض حاصل کرتی ہے۔ ہاں زندگی کے کھیل میں، جہاں رنج اور خوشی، کامیابی اور ناکامی ایک دوسرے کے ساتھ آنکھ مچولی کرتے رہتے ہیں، ایک ایسا محرک ہے اور وہ ہے محبت کا جذبہ۔ جس سے ادیبوں، شاعروں، سنگ تراشوں، مغنیوں، مفکروں، نبیوں اور خدا کے بہت سے اور نیک بندوں نے الہام حاصل کیا ہے۔ اس نے مردوں کو وہ جرات اور استقلال بخشا جس کے بل بوتے انھوں نے دنیا کی تسخیر کی ہے اور عورتوں کو ایمان اور ایثار کی وہ قوت جس کی بدولت انھوں نے زندگی کی بہترین قدروں کا پالن اور ان کی سیوا کی ہے۔ اگر زندگی کے ایوان میں اس کا شعلہ روشن نہ ہو تو اس میں نہ حسن ہے

نہ چاشنی نہ معنی۔ اس کے معجزے صرف دنیا کے بڑے بڑے مجاہدوں، شہیدوں اور سیوکوں کی زندگی ہی میں نظر نہیں آتے بلکہ لاکھوں، کروڑوں، معمولی مرد اور عورتوں کی روزمرہ کی زندگی میں بھی اس کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ ماں کی محبت اپنے بچوں کے لئے، بہن کی محبت بھائی کے لئے، بیوی کی محبت شوہر کے لئے، دوست کی محبت دوست کے لئے، حبیب کی محبت محبوب کے لئے۔ یہ ایک رحمت کا پردہ ہے جو تمام انسانی رشتوں پر پھیلا ہوا ہے اسی جذبے کے اعجاز سے وہ دیواریں گرجاتی ہیں جو آدمی کو آدمی سے جدا کرتی ہیں۔ وہ اپنی خودی کے تنگ خول سے باہر نکل کر ساری دنیا کو اپنے دل کی وسعتوں میں سمیٹ سکتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر وقت اور فاصلے کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور ممکن اور ناممکن کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دعوے آپ میں سے بعض کو ایک شاعرانہ مبالغہ معلوم ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ انسانی تاریخ کا جائزہ لیں اور اس کے تمام کارناموں پر، اس کی اعلیٰ ترین تخلیقوں پر، اس کے جلال وجمال پر، اس کی بلندی اور گہرائی پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ زندگی میں جتنی اچھی اور بڑی اور قابل قدر چیزیں ہیں ان سب میں محبت کا جلوہ جھلکتا ہے، محبت اپنی مختلف حسین شکلوں میں! مظاہر آرٹ اور مناظر فطرت کی محبت، علم کی محبت، تسخیر کائنات کی محبت اور سب سے زیادہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور ہم جنسوں کی محبت۔ اگر دنیا کی ساری دولت اور قوت آپ کو حاصل ہے لیکن دل اس چیز سے خالی ہے تو آپ کی زندگی ایک فقیر کے کیسے کی طرح مفلس ہے اور اگر محبت کی دولت نصیب ہے تو آپ کے دل کے تار دنیا کے دکھ سکھ کی موسیقی کے ساتھ ناچیں گے اور خود غرضی وخود پسندی کا رنگ کٹ جائیگا اور تنہائی اور علیحدگی کا بھیانک تصور آپ کی زندگی کو تلخ نہیں بنا سکے گا۔ محبت کے طلسم سے آپ کے سامنے بہت سے نئے راستے کھل جائیں گے جن میں یقیناً خوشی اور رنج دونوں آپ کے ہم سفر ہوں گے لیکن دونوں قدم قدم پر آپ کی شخصیت کو مالا مال

کریں گے۔

بس جو کہنا تھا۔ کہہ چکا۔ جی چاہتا ہے کہ آخر میں زندگی کے معنی اور مقصد کے بارے میں ایک بہت خوب صورت اور دل نشین عبارت کا ترجمہ آپ کو سناؤں جو میں نے ایک امریکی رسالے میں پڑھی تھی۔ اس کا عنوان ہے حضرت عیسیٰ کا یہ قول کہ "انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا" ــــ اور بتانا یہ ہے کہ زندگی کے حسین نغمے ہیں کتنے بہت سے اور کتنے مختلف سرسائے ہوئے ہیں۔ اگر ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں تو گویا اپنی زندگی کو تنگ اور بے مایہ بناتے ہیں۔ سنئے:

"انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا بلکہ زندہ رہتا ہے حسن اور ہم آہنگی سے، سچائی اور نیکی سے، کام اور کھیل سے، محبت اور دوستی سے، آرزو کی خلش اور عبادت کے شوق سے۔"

"صرف روٹی سے نہیں بلکہ رات کے سناٹے میں تاروں بھرے آسمان کی خوب صورتی سے، طلوع آفتاب کے وقت آسمان کی شان و شوکت اور غروب آفتاب کے وقت رنگوں کے حسین میل سے، پھولوں سے بھرے ہوئے درختوں کے جمال اور سر بفلک پہاڑوں کی عظمت اور جلال سے۔"

"صرف روٹی سے نہیں بلکہ سمندر کی موجوں کے جوش و خروش سے، جھیل کے ساکن پانی پر چاند کی نقرئی کرنوں کے کھیل سے، پہاڑوں اور نالوں کے تڑپتے ہوئے سیمابی پانی سے برف کے شفاف ٹکڑوں کی حسن کاری اور باکمال کلاکاروں کی صناعی سے۔"

"صرف روٹی سے نہیں بلکہ بلبل کے میٹھے راگوں سے، درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ سے، ستار کے جگائے ہوئے جادو سے اور عبادت خانوں کی دھیمی روشنی کے اثر آفرینی سے۔"

"صرف روٹی سے نہیں بلکہ گلاب کی عطر بیزی سے، نارنگی کے شگوفوں کی مہک سے، تازہ کٹی ہوئی گھاس کی بھینی بھینی خوشبو سے، دوست کے مصافحہ کی گرمی اور ماں

کے محبت بھرے پیار کی نرمی سے "۔

" صرف روٹی سے نہیں بلکہ شاعروں کے تغزل سے، حکیموں کی حکمت سے، ولیوں کے تقدس سے، اور بڑے آدمیوں کی داستانِ حیات سے"۔

" صرف روٹی سے نہیں بلکہ رفاقت اور حوصلہ مندی سے، ڈھونڈنے اور پانے سے، سیوا اور مل بانٹ کر کھانے سے، چاہنے اور چاہے جانے سے "۔

" انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا ہے وہ زندہ رہتا ہے حضورِ قلب کے ساتھ عبادت کرنے سے، ہدایت الٰہی کے لئے دل کے دروازے کھول دینے سے اور رضائے الٰہی کے راستے پر چلنے سے "۔

زندگی گزارنی ہے تو اس طرح کا دل اور دماغ، اس طرح کا فکر و نظر پیدا کیجئے !۔

الجبرا کا آغاز

جناب شبیر احمد خاں غوری

(ذیل میں کوئی تحقیقی مقالہ پیش نہیں کیا جا رہا۔ صرف ارباب علم کے لئے ایک دعوت فکر و نظر ہے یونانی الجبرا، مسلم جبر و مقابلہ اور ہندو بیج گنِت کا مختلف زمانوں کے اندر ایسے مقامات پر آغاز و ارتقا ہوا جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اس کے باوجود ان میں غیر معمولی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس لئے ذہن فوراً "اثر و تاثر" کے نظریہ کو ان پر آزمانا شروع کر دیتا ہے۔ مگر اس سے گتھیاں سلجھنے کے ساتھ الجھتی بھی جاتی ہیں۔ بہرحال مسئلہ دلچسپ ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ ماہرینِ فن اسے حل کرنے کی کوشش کریں۔)

الجبرا (صحیح نام "علم الجبر و المقابلہ") اپنی موجودہ شکل میں محمد ابن موسیٰ الخوارزمی کے زمانے میں شروع ہوا لیکن اس فن کا جرثومہ قدیم مصریوں کے یہاں ملتا ہے۔ تقریباً سنہ ۱۷۰۰ ق م میں احمیس نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ملخص برٹش میوزیم کے حصیری مخطوطات میں محفوظ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم اہل مصر بھی مجہول المقدار اشیاء کی قیمت دریافت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے مگر ان کی کاوش اسی حد تک محدود رہی جسے ہم "درجہ اول کی مساوات" کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم حصیری یادداشتوں میں ایسی تحریریں بھی ملتی ہیں جو ایک گونہ "درجہ دوم کی مساوات" شاید کہی جا سکتی ہیں۔ مگر انھیں درجہ دوم کی مساوات قرار دینا مناسب نہ ہوگا، کیونکہ حصیری یادداشت میں انھیں "حساب الخطائین" کے ذریعے حل کیا گیا ہے۔

عہد حاضر کے الجبرا کا جرثومہ زیادہ واضح شکل میں یونانیوں کے یہاں ملتا ہے۔ مگر ان کے یہاں

بھی اس نے مستقل فن کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی، ابھی الجبرا حساب ہی کا ایک شعبہ سمجھا جاتا تھا۔ دوسری کمی یونانی الجبرا نویسوں کے یہاں یہ تھی کہ وہ اپنی تصانیف میں مقادیر مجہول کی قیمت دریافت کرنے کے قواعد کی منطقی وجہ نہیں بتاتے تھے۔

الجبرا کا آغاز

الجبرا کو اس کی موجودہ شکل میں محمد ابن موسیٰ الخوارزمی نے وضع کیا جیسا کہ ابن خلدون نے "مقدمہ" میں لکھا ہے:

"سب سے پہلا شخص جس نے اس فن (جبر و مقابلہ) میں کتاب تصنیف کی ابو عبداللہ الخوارزمی ہے، اس کے بعد شجاع بن اسلم کا زمانہ آتا ہے۔ بعد میں لوگ اس (الخوارزمی) کے نقش قدم پر چلے۔ الخوارزمی کی کتاب میں مسائل شش گانہ کے باب میں (معادلات شش گانہ کے حل میں) اُن سب کتابوں میں بہتر ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ فضلائے اندلس میں سے بہت سے ماہرین نے اس کتاب کی شرحیں لکھیں"۔

(مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵۷۹)

اسی طرح ابو کامل شجاع بن اسلم نے اپنی کتاب "کتاب الوصایا بالجبر والمقابلہ" میں الخوارزمی کو اس فن کی ایجاد کا شرف دیا ہے۔ (تراث العرب العلمی فی الریاضیات والفلک از حافظ قدری طوفان صفحہ ۱۲۴)

محمد ابن موسیٰ الخوارزمی

محمد ابن موسیٰ الخوارزمی (جو بنو موسیٰ بن شاکر سے قطعاً علیحدہ شخصیت ہے) دنیا کے مشہور ماہرین ریاضی و ہیئت میں سے تھا۔ وہ خوارزم کا رہنے والا تھا۔ دو سو سال بعد اس سرزمین سے ابوریحان البیرونی پیدا ہوا۔ خوارزم اپنے منجمین اور ہیئت دانوں کے خدانت و کمال کے لئے قدیم زمانے سے مشہور تھا۔ البیرونی کہتا ہے کہ یہاں منجم عربوں سے زیادہ ماہر ہوتے تھے۔ بہرحال اسی مردم خیز سرزمین میں محمد ابن موسیٰ الخوارزمی پیدا ہوا۔ جب مامون الرشید ۱۹۸ - ۲۱۸ھ) کی علمی سرپرستی

اور سند بن علی کے قصے سے تو وہ بھی اس کے دربار میں پہنچا اور اپنے علم و فضل کی بنا پر ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ عرصہ تک بیت الحکمۃ مامونی کے اندر تحقیقات کرتا رہا۔ اس کے تین کارنامے مشہور ہیں۔

(۱) الخوارزمی نے اس فن کو مرتب کیا جو آج "مسلم علم الہیئت" کہلاتا ہے۔ اس سے پہلے تین ہیئتی نظام مستعمل تھے:۔ برہم سدھانت جو السندھند الکبیر کہلاتا تھا، زیج شہریار اور بطلیموس کی المجسطی۔ الخوارزمی نے ان تینوں نظاموں کی مدد سے ایک نیا ہیئتی نظام وضع کیا۔ یہ نظام ہیئت مسلمان ہیئت دانوں میں بہت زیادہ مقبول ہوا، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے "طبقات الامم" میں لکھا ہے:۔

"السندھند الکبیر (محمد ابن ابراہیم الفزاری کے ترجمۂ برہم سدھانت) پر لوگ مامون کے زمانہ تک عمل کرتے رہے۔ مامون کے زمانہ میں ابو جعفر محمد ابن موسیٰ الخوارزمی نے اسے مختصر کیا اور اپنی وہ زیج تیار کی جو ممالک اسلامیہ میں مشہور ہے۔ اس کے اندر اس نے اوساط کواکب کے باب میں السندھند (برہم سدھانت) پر اعتماد کیا ہے۔ مگر تعدیلات اور میل کلی کے سلسلے میں اس سے اختلاف کیا ہے۔ تعدیلات کے اندر اس نے ایرانیوں کے مدرسۂ فکر (زیج شہریار) کا اتباع کیا ہے اور آفتاب کے میل کلی کے باب میں بطلیموس (کی کتاب المجسطی) کا ..... پس اس زمانے کے لوگوں نے جو السندھند کے طریقہ کے پیرو تھے، اسے بہت زیادہ پسند کیا اور یہ نیا ہیئتی نظام تمام دنیا میں پھیل گیا اور اہلِ فن کے نزدیک ہمارے زمانہ تک مقبول رہا ہے۔" (طبقات الامم صفحہ ۸۵)

بہت سے ہیئت دانوں نے الخوارزمی کی اس زیج کی طرف توجہ کی۔ البیرونی نے اس سلسلے میں تین کتابیں لکھیں، یورپ بھی اس قدر شناسی میں مشرق سے پیچھے نہیں رہا اور ایڈیلارڈ آف باتھ نے اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔

۲۔ الخوارزمی نے ہندوستانی علم الحساب پر بہترین کتاب لکھی۔ بدقسمتی سے اس کی عربی اصل ناپید ہے مگر چونکہ اس کتاب نے جلد ہی یورپ میں اپنے قدردان پیدا کر لئے تھے، اس لئے ایڈیلارڈ آف باتھ نے اس کا بھی لاطینی میں ترجمہ کر لیا۔ خوش قسمتی سے یہ لاطینی ترجمہ موجود ہے۔ بہرحال اسی کتاب کے

ذریعے یورپ ترقیم اعداد کے مروجہ طریقے سے واقف ہوا۔

۴- الخوارزمی نے "الجبر والمقابلہ" پر سب سے پہلے کتاب لکھی۔ اس کے امتیازی اوصاف حسب ذیل ہیں۔

(الف) اس نے مسلمانوں میں سب سے پہلے اس موضوع پر مستقل کتاب تصنیف کی۔

(ب) اس فن کے یونانی اور ہندوستانی ماہرین کے برخلاف الخوارزمی نے الجبر والمقابلہ کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے پیش کیا۔

(ج) اپنے پیش روؤں کے برعکس اس نے اسے ایک سائنسی علم بنا دیا اور ہر ضابطے اور فارمولا کی ہندسی دلیل دی۔

(د) وہ پہلا ریاضی داں ہے جس نے درجۂ دوم کی مساواتوں کے دو حل ہونے کی ضرورت پر اصرار کیا۔

اپنے ان امتیازی اوصاف کی بنا پر الخوارزمی کے "الجبر والمقابلہ" کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ابو کامل شجاع بن اسلم مصری نے اپنی کتاب "کمال الجبر وتمامہ والزیادۃ فی اُصولہ" میں الخوارزمی کے فضل وتقدم کا اعتراف کیا۔ بعد میں بہت سے فضلاء جیسے سنان بن الفتح الحرانی، عبداللہ بن الحسن الصیدنانی، ابوالوفاء البوزجانی وغیرہ نے اس کتاب کی شرحیں لکھیں۔ یورپ نے بھی مشرق کے اس عظیم عبقری کی قدر شناسی میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور رویرٹ آف چیسٹر نے اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔

عہد حاضر میں فریڈرک روزن نے ۱۸۳۱ء میں الخوارزمی کی کتاب "الجبر والمقابلہ" کو انگریزی ترجمہ اور تعلیقات کے ساتھ لندن سے شائع کیا۔ ۱۹۱۵ء میں کارپنسکی نے رویرٹ آف چیسٹر کے لاطینی ترجمہ کو انگریزی میں منتقل کرکے شائع کیا۔ عربی متن کو دوبارہ ۱۹۳۹ء میں علی مصطفیٰ مشرفہ اور محمد موسیٰ نے مصر میں شائع کیا ہے۔

الجبرا میں خوارزمی کا ماخذ

ابن خلدون نے محمد ابن موسیٰ الخوارزمی کو "علم الجبر والمقابلہ" کا موجد قرار دیا ہے۔ ابو کامل شجاع بن اسلم کا بھی یہی خیال ہے۔ مگر فریڈرک روزن جس نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، لکھتا

ہے کہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے یہ فن ذیوفنطس (DIOPHANTUS) یا ہندوؤں سے لیا ہے۔ مگر عرب چوتھی صدی ہجری کے وسط تک ذیوفنطس کی تصانیف سے بالکل ناواقف تھے، اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں سے جبر و مقابلہ کے ابتدائی معلومات حاصل کئے ہوں گے جو خلیفہ مامون الرشید کے دربار میں معزز عہدوں پر فائز تھے۔

فریڈرک روزن کا یہ خیال دو وجہوں سے ہے۔

(الف) عرب چوتھی صدی ہجری کے وسط تک ذیوفنطس کی تصانیف سے بالکل ناواقف تھے

(ب) الخوارزمی نے اپنے جبر و مقابلہ کی ابتدائی معلومات ان ہندوؤں سے حاصل کیں جو مامون کے دربار میں معزز عہدوں پر فائز تھے۔

۱۔ ان میں سے پہلا خیال زیادہ وزنی معلوم نہیں ہوتا کیونکہ

(۱) ابوالوفاء البوزجانی (۳۲۸ - ۳۸۷ ھ) سے ایک صدی پیشتر یعنی تیسری صدی کے وسط میں قسطا بن لوقا نے ذیوفنطس کے جبر و مقابلہ کا عربی میں ترجمہ کیا تھا چنانچہ ابن ابی اصیبعہ قسطا کی تصانیف میں "کتاب فی ترجمۃ ذیوفنطس فی الجبر والمقابلہ" کے عنوان سے اس کا ذکر کرتا ہے۔

(۲) ذیوفنطس کا الجبرلیا "الارثماطیقی" (علم الحساب) یونان کے سائنسی ادب کا ایک نادر شاہکار تھا۔ لہٰذا یہ تصور نہیں ہوسکتا کہ مسلمان فضلاء جن کی علمی پیاس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، دوسری صدی میں جبکہ انھیں یونانی علم و حکمت کی ثروت کا اندازہ ہوا اُس سے واقف نہ ہوئے ہوں، یا واقف ہونے کے بعد اس سے استفادہ کرنے میں انھوں نے تساہل سے کام لیا ہو۔

(۳) رہا یہ شبہ کہ ابن الندیم نے "کتاب الفہرست" میں ابوالوفاء سے پہلے ذیوفنطس کے الجبر والمقابلہ کے تراجم کا ذکر نہیں کیا تو یہ شبہ زیادہ قوی نہیں ہے، کیونکہ ابن الندیم صرف ان کتابوں کی فہرست دیتا ہے جن کی اس کے زمانے میں مانگ تھی۔ یہ ضروری نہیں کہ جس کتاب یا ترجمہ کا اس نے ذکر نہ کیا ہو اس کا وجود ہی نہ ہو۔ مثلاً وہ عبداللہ بن المقفع کے ترجمۂ قاطیغوریاس

وغیرہ کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ اس ترجمہ کے مخطوطے آج بھی موجود ہیں۔

اس لئے جب تک کافی وفنی دلائل سے اس بات کی تردید نہیں ہوجاتی، یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذیوفنطس کے الجبرا سے مسلمان دوسری صدی ہی میں واقف ہوچکے تھے۔ نیز ان مماثلتوں کے پیش نظر جو ذیوفنطس کی کتاب اور الخوارزمی کے "الجبر والمقابلہ" میں پائی جاتی ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ اسی سے محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے اپنی کتاب کا خیال اخذ کیا تھا۔

(ب) فریڈرک روزن کی دوسری وجہ پر جناب محمد عثمان صاحب عمادی استاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: "فاضل مترجم (فریڈرک روزن) نے ہر جگہ بھاسکر آچاری کی کتاب لیلاوتی اور وجے (برہم؟) گپتا کے حوالے سے اپنے دلائل کو مستحکم کرنے کی کوشش کی لیکن .... یہ حقیقت بالکل بھول گیا کہ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی نویں صدی ہجری (مسیحی؟) کے آغاز میں تھے اور بھاسکر آچاری مصنف لیلاوتی بارہویں صدی کا شخص ہے۔ لہذا یہ ناممکن ہے کہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی مصنف لیلاوتی سے خوشہ چینی کرسکے۔ بخلاف اس کے گمان غالب ہے کہ بھاسکر چاری نے محمد بن موسیٰ الخوارزمی سے اپنے معلومات اخذ کئے ہوں"۔ یہ تعقب بظاہر بڑا معقول ہے مگر دقت یہ ہے کہ اسے تسلیم کرتے ہی دوسرے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں، جن کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ مثلاً (۱) کیا بھاسکر آچاری عربی سے واقف تھے؟ اگر واقف تھے تو پھر ان کی سوانح حیات میں ان کی عربی دانی اور اسلامی علوم سے واقفیت کا پتہ چلنا چاہیئے۔
(۲) لیکن اگر واقف نہیں تھے تو پھر وہ الخوارزمی کے "الجبر والمقابلہ" سے کس طرح مستفید ہوئے؟
(ا) ترجمہ کے ذریعہ؟ تو سنسکرت ادب کی تاریخ میں اس کا کوئی اشارہ ملنا چاہیئے کہ الخوارزمی کا الجبرا سنسکرت میں ترجمہ ہوا تھا۔

(ب) اپنے ہندو پیشروؤں کی کتابوں کے ذریعے؟ تو پھر یہی سوالات اُن ہندو پیشروؤں کے متعلق کئے جائیں گے۔

(ج) کسی مسلمان عربی دان ماہر ریاضیات کی صحبت میں؟ تو پھر ان کی تفصیلی سوانح حیات کو

کھنگالنا پڑے گا۔ نیز قرونِ وسطیٰ کے ہندوستانی مسلمان فضلاء میں ریاضیات بالخصوص الجبر والمقابلہ کی تدریس و تصنیف کی تاریخ پر بھی نظر ڈال کر اس احتمال کا جائزہ لینا ہوگا۔ اور اگر اس بات پر اصرار ہی کیا جائے کہ ہندو علمائے ریاضیات مسلمانوں کے الجبرا کے خوشہ چیں تھے تو پھر ایک اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ بھاسکر آچاری بارہویں صدی میں تھے اور گیارہویں صدی تک مسلمان ریاضی دانوں کی کاوشیں درجۂ دوم کی مساوات سے بڑھ کر درجۂ سوئم کی مساوات تک حل کر چکی تھیں، کیونکہ خیام نے ۴۶۷ھ کے قریب اپنا "الجبر والمقابلہ" مرتب کیا تھا اور اس کا امتیازی کارنامہ درجۂ سوم کی مساوانوں کا استقصاء ہے۔ نیز اس کے پیشرو الماہانی، ابوجعفر الخازن، ابوسہل الکہی، ابوالجود وغیرہ ماوراء النہر و خراسان میں اور ابن الہیثم مصر میں الجبرائی تحقیقات کے اندر بہت کچھ کام کر چکے تھے اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ہندوستان اور خراسان کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں تھی اور دونوں ملکوں کے علمی و ثقافتی روابط اس حد تک پہنچے ہوئے تھے کہ فضلائے ہند کا خراسان و ماوراء النہر کے محققین کی تحقیقات سے متاثر ہونا فطری تھا۔ لہٰذا ہندوستان میں جہاں بھی ریاضی و حساب کے سلسلے میں تدریس و تصنیف ہوئی ہو، الجبرا کے اندر درجۂ دوم کی مساوات کے ساتھ درجۂ سوم کی مساوانوں کی بحث کا آجانا بھی ناگزیر تھا اور اگر اس زمانے کے ہندو ریاضی دان اپنے ہم وطن مسلمان فضلاء کی کاوشوں سے متاثر ہوئے ہوں تو ان کے یہاں بھی درجۂ سوم کی مساواتوں کا تذکرہ ملنا چاہیئے۔ مگر نہ تو "لیلاوتی" میں اس قسم کا کوئی ذکر ملتا ہے اور نہ کسی اور ہندو ماہر جبر و مقابلہ کی تصنیف میں۔

یہ چند دقتیں ہیں اور جب تک ان کا اطمینان بخش حل پیش نہیں کیا جاتا، یہ مفروضہ زیادہ وقیع معلوم نہیں ہوتا کہ

"بھاسکر آچاری نے محمد بن موسیٰ الخوارزمی سے اپنے معلومات اخذ کئے ہوں"۔

لہٰذا اگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے بھاسکر آچاری کی خوشہ چینی کی ہے تو یہ کہنا بھی قبل از وقت ہے کہ بھاسکر آچاری نے محمد بن موسیٰ الخوارزمی سے اپنے معلومات اخذ کئے ہیں۔ بہر حال

مسئلہ اپنی جگہ پر رہتا ہے کہ الخوارزمی اور بھاسکر آچاری کے درمیان اس غیر معمولی مماثلت کی وجہ کیا ہے ؟ ایک توجیہہ یہ کی جا سکتی ہے کہ دونوں نے کسی قدیم تر ماخذ سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن اس قدیم تر ماخذ کا تعین بھی ایک مشکل مسئلہ ہے :- پہلا خیال یہ ہے کہ یہ "قدیم تر ماخذ" ہندوستانی الاصل تھا۔ اس کا موید یہ قرینہ ہے کہ الخوارزمی ہندو ریاضی وہیئت سے متاثر تھا، چنانچہ

۱۔ حساب کے اندر "ترقیم اعداد" کے سلسلے میں اس نے ہندوستانی حساب ہی کو اپنی بنیاد بنایا اور اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی جسے ایڈیلارڈ آف باتھ نے لاطینی میں ترجمہ کیا تھا اور جس کے ذریعہ یورپ ہندوستانی علم الحساب بالخصوص "عشری طریقۂ ترقیم" سے واقف ہوا۔

ب۔ اسی طرح ہیئت کے اندر الخوارزمی نے اپنی کاوش کی اساس "السند ہند" (برہم سدھانت) کو بنایا، اگرچہ اس نے اس میں "المجسطی" اور "زیج شہریار" کی پیوندکاری بھی کی ہے۔

ان شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاضی وہیئت کے معاملے میں الخوارزمی کا مدار ہندوستانی مصادر پر تھا۔ پھر یہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ الخوارزمی سے پہلے حساب اور جبر و مقابلہ کے دوائر متعین نہیں ہوئے تھے۔ لہذا ہندوستانی حساب کی کتابوں کے مطالعہ کے سلسلے میں الخوارزمی ہندوستانی الجبرا سے متاثر ہوا ہوگا۔

مگر اس مفروضہ میں ایک اور دقت بھی ہے۔ وہ ہے الخوارزمی اور ڈیوفنطس میں غیر معمولی مماثلت یعنی ڈیوفنطس اور قدیم ہندوستانی زیج گرنٹ کے مصنفین میں غیر معمولی مماثلت۔ اس لئے یا تو ڈیوفنطس ہندوستانی الجبرا نویسوں سے متاثر ہوا تھا یا موخرالذکر ڈیوفنطس سے متاثر ہوئے تھے۔

فضلائے یورپ کا رجحان دوسری شق کی جانب ہے: وہ کہتے ہیں کہ عربوں نے ہندوؤں سے جو ریاضی وہیئت سیکھی تھی وہ یونانی الاصل تھی، چنانچہ اولیری لکھتا ہے :-

"وہ ریاضی وہیئت جو عربوں نے ایرانی وساطت سے اپنے ہندو اساتذہ سے سیکھی تھی، یونانی الاصل تھی اور اسکندریہ سے شمالی مغربی ہندوستان تک پہنچی تھی"

ان کا کہنا ہے کہ سکندر اعظم کے حملہ کے بعد وسط ایشیا یونانی ثقافت سے متاثر ہو گیا تھا۔ اولیری دوسری جگہ لکھتا ہے :۔

"مرو باختر اور صغد سب یونانی ثقافت کے مرکز بن گئے تھے"

یہی نہیں بلکہ ہندوستان کا مشرقی علاقہ تک اس ثقافتی اثر سے متاثر تھا۔ اولیری آگے چل کر لکھتا ہے:

"گپتا خاندان کے عہد حکومت میں شہر پاٹلی پتر سائنسی تحقیقات بالخصوص ہیئت وریاضیات کا گہوارہ بن گیا تھا۔ ان دونوں (موخر الذکر) علوم میں اسکندریہ کے معاصر علمی حلقوں کی تحقیقات کے مطابق یونانی اثرات واضح طور پر نمایاں ہیں"

یہ بھی واقعہ ہے کہ قدیم ہندوستان میں جو پانچ ہیئتی نظام مروج تھے، ان میں سے ایک رومک سدھانت بھی تھا جو رومی"، یونانی) ہیئت پر مبنی تھا، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ دوسرا یعنی "پلس سدھانت بھی یونانی ہیئت سے متاثر تھا کیونکہ اس میں مختلف "جیوب" کی قیمتیں بطلیموس کی "المجسطی" میں دی ہوئی "اوتار" کی جدول پر مبنی ہیں۔ اسی طرح "رومک سدھانت" "کا یگ" یونانی حکیم وہیئت دان میطن (METON) کی تقویم (کیلنڈر) پر مبنی ہے، چنانچہ تھیبوٹ (THAIBUT) جس نے وراہ مہر کی پنچ سدھانتکا '(पञ्चसिद्धान्तिका वराहमिहिरकृता)' کو ایڈٹ کیا ہے اس کتاب کے مقدمہ (صفحہ XXII) میں لکھتا ہے :۔ "ظاہر ہے کہ رومک سدھانت کا یگ ادوار میطنی (METONIC PERIOD) پر مبنی ہے جو ایتھنز کے ہیئت دان میطن کے نام پر موسوم ہیں جس نے ۴۳۰ ق م کے قریب ۱۹ شمسی اعتدالی سالوں کو ۲۳۵ قمری مہینوں کے مساوی مان کر اپنے عہد کی متداول یونانی تقویم کی اصلاح کی طرف رہنمائی کی" اس کے ساتھ ہی تھیبوٹ دوسری جگہ (صفحہ XI) شکوہ سنج ہے "جب ہم ہندو علوم کی اس شاخ (ہیئت) کا مطالعہ کرتے ہیں جس میں اس بات کے واضح نشانات موجود ہیں کہ اس کی تشکیل جو یونانی تعلیم کے زیر اثر ہوئی ہے تو اس میں گزشتہ مصنفین (یونانی حکماء) کی افکار و آراء کے قدرشناسانہ حوالوں کا فقدان خصوصیت سے تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے" بہرحال ان مستشرقین کا خیال ہے کہ ہندوستانی جوتش بڑی حد تک یونانی ہیئت کی متاثر ہوئی ہے۔ اس کے بعد فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "کیا ہندوستانی زیچ گرنتھ بھی ذیوفنطس کی الجبرائی کاوشوں کا رہین احسان ہے" یہ مسئلہ ہے جس پر ماہرین فن کو غور کرنا ہوگا!۔

اقبال کا تصورِ آزادی

جناب شاہ مصباح الدین شکیل

اقبال دورِ انحطاط کا نہیں، آغازِ بیداری کا شاعر ہے۔ اسی لئے اس کے پاس غالب اور داغ کی نشاط انگیزی، حالی کا مورخانہ انداز یا اکبر کی قدامت پرستی نہیں، اس کے پاس روح عصر ہے، مقصدیت ہے اور فکر کی گہرائی ہے۔ جوں جوں اس کی نظر بلند ہوتی گئی اور فکر مرتب ہونے لگی تو اس کے نظری سانچوں میں ایک فطری تبدیلی نمایاں ہوئی۔ داغ کا شاگرد غزل کے پرانے دبستاں سے دامن بچا کر چلا تو کبھی حالی نے اور کبھی اکبر نے روکا۔ بالآخر اسے بھرتری ہری، گوئٹے، نیٹشے، برگسان، کانٹ، ابن عربی اور رومی جیسے ازواں ملے اور اس نے وہ منزلیں طے کیں جو ایک جبرئیل صید اور یزداں کا شکار اہل نظر کا مقدر ہوتی ہیں۔ اقبال بھی اولوالعزم انسانوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو کائنات کے مربوط نظامِ حیات کے تحت اپنے اپنے وقت پر پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کے ان عظیم انسانوں میں چاہے وہ مذہبوں کے داعی ہوں یا صاحبانِ علم و فن، جذبۂ حریت اور تسخیر حیات کا احساس بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کی فکر و نظر کی رسائی کا انداز خاصے کی چیز ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ان کی فدا آور تخصیص کے جوہر کھلتے ہیں اور ان کی عظمت کا معیار قائم ہوتا ہے۔

اقبال کے احساسِ حریت اور تصورِ آزادی کا تجزیہ کرنے کے لئے اس کے ذہنی پس منظر پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے ورنہ بظاہر اس کے کلام کے مختلف ادوار کے تدریجی ارتقا میں ایک تضاد سا معلوم ہوگا۔

سر شیخ عبدالقادر کے حوالے سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ابتدائی

مشق کو چھوڑ کر اقبال کا اردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۰۰-۱۹۰۱ء کے لگ بھگ وہ پہلی مرتبہ لاہور کے مشاعروں میں دیکھے گئے اور ان ہی دنوں ایک ادبی مجلس میں شریک ہونے لگے جس میں لاہور کے اونچے علمی طبقے کے افراد شریک ہوا کرتے تھے۔ یہیں انھوں نے اپنی وہ نظم جس میں کوہ ہمالہ سے خطاب ہے پڑھ کر سنائی جو کچھ ہی دنوں بعد مخزن کے پہلے شمارہ میں نکلی اور ہندوستان کے طول و عرض میں شاعر کی ذہانت کا ڈنکا بج گیا۔

جب اقبال نے شعر کہنا شروع کیا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں داغ کا طوطی بولتا تھا لیکن آزاد کی کوششوں سے ۱۸۷۴ء میں نئے طرز کے مشاعرے کی بنیاد پڑ چکی تھی حالی کا مسدس قبولیت عام کے معیار پر پورا اتر چکا تھا۔ اکبر اپنے خاص رنگ میں سماجی اور سیاسی مسائل پر کھل کر تنقید کرنے لگے تھے۔ سرسید کی تحریر اور تقریر نے ذہن و فکر کے گھور اندھیاروں کو دور کرنے میں بڑا کام کیا تھا۔ ادھر ۱۸۳۳ء میں لارڈ مکالے کی اسکیم کے مطابق ولیم بنٹنگ کے ہاتھوں مغربی تعلیم کا رواج ہو چکا تھا۔

دوسری جانب شاہ ولی اللہ اور راجہ رام موہن رائے کی تعلیمات کا رنگ ابھی تازہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی کش مکش آزادی دماغوں سے محو نہ ہوئی تھی۔ کانگریس کی بنیاد پڑے پندرہ ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور سریندر ناتھ بنرجی، دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتا اور بدرالدین طیب جی کی کوششوں سے ہماری سماجی زندگی ایک نیا روپ دھار رہی تھی۔ گوکھلے کی گھن گرج سے ایوانِ حکومت میں ایک غلغلہ پیدا ہو رہا تھا۔ سماج کی رگ و پے میں جوش و خروش کی پیہم لہریں ابھر رہی تھیں۔ کچھ یہ ذہنی پس منظر تھا جب بقول میتھو آرنلڈ ہماری دنیا ایک نئے تمدن کے جنم کا درد محسوس کر رہی تھی۔ اس فضا میں اقبال نے آنکھیں کھولیں۔ تفصیلِ کشورِ ہندوستان ——— ہمالہ اس کی چشم بینا کو سراپا تجلی آنے لگا اور اس نے محیطِ آب کو گواہ بنا کر صدائے درد بلند کی۔ ع۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

احساس کی یہ چبھن اس کے ذوقِ آگہی کے لئے ایک مہمیز تھی، جس نے بالآخر اس سے کہلوایا!

سوتے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

اب یہ شعر کا اعجاز کچھ اس انداز میں ظاہر ہونے لگا ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اس کے بعد شاعر کے لب پر "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا ترانہ ہے اور پھر ہندوستانی بچوں کا قومی گیت جس نے اس کی فکر کے سانچوں میں ایک نئے سوالہ کا ہیولیٰ کھڑا کیا۔ کم و بیش وہ زمانہ ہے جب ہوم رول لیگ کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں کانگریس اپنے بنیادی نظریے میں حالات کے تقاضوں کے ساتھ مناسب تبدیلیاں کر رہی ہے گوکھلے ملک کی آزادی کی تحریک میں سرگرم طول و عرض ہمالہ میں سرگرداں ہے! ابھی ۱۹۰۶ء کا وہ دن نہیں آیا جب کانگریس کے پلیٹ فارم سے پہلی مرتبہ برطانوی سامراج کو ایک بڑا کھلا چیلنج دیا جائے۔ ابھی محبِ وطن گوکھلے کی زبان سے نوآبادیاتی درجے کا مطالبہ ہونے والا ہے اور اقبال ہوشیار کرتا ہے ؎

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو اور تری صدا ہو آسمانوں پر
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اب وہ دور آتا ہے کہ بنارس اور علی گڑھ کی قومی درس گاہیں برگ و بار لا چکی ہیں: ملک مسز اینی بسنت، موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس اور مہاتما گاندھی افقِ سیاست پر اپنی جگہ بنانے جا رہے ہیں۔ علی برادران ساتھ ہیں، سیاسی بحران کے نتیجے کے طور پر مکمل سوراج کا عزم بے باکانہ ظاہر ہوا۔ ادھر اسپنسر اور مل کی تعلیمات نے حریت اور آزادی کی قندیل روشن کی۔ اس دوران اقبال یورپ ہو آئے۔ وطن لوٹے تو برطانوی سامراجیت کے بوجھ تلے دم توڑتے ہوئے

سماج کے توسط سے دنیا کے آگے انھوں نے اپنی فکر و نظر کی بساط کا ایک گوشہ وا کرنا شروع کیا ہے

۱۔ غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

۲۔ نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات

۳۔ ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے   قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

۴۔ تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اقبال کے ذہنی پس منظر کے سلسلہ میں جن تحریکوں اور واقعات کا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے، شاعر نے ان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ شمس العلماء میر حسن کی مشرقیت اور پروفیسر آرنلڈ کے طرزِ فکر کے امتزاج سے جو اندازِ نظر پیدا ہو سکتا تھا اسے ذہن میں رکھیے پھر اقبال جیسے دانشور کی بے پناہ ذہنی تڑپ اور فطانت کا اندازہ لگائیے تو پیامِ مشرق، اسرارِ خودی اور جاوید نامہ کا اقبال سمجھ میں آتا ہے کیا اردو اور کیا فارسی اقبال کے تمام کلام پر اس کا جذبہ حریت طاری و ساری ہے کہیں راست اپنے قاری کے ذہن و دماغ پر ضرب لگاتا ہے کہیں شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتا ہے یہ اس کے طنز کا بھرپور انداز ہے، انسان کے احساسِ خودداری اور جذبۂ حریت کو بیدار کرنے کی اس سے بہتر شاید ہی کوئی اور صورت ہو۔

"ارمغانِ حجاز" میں ایک مقام ہے کہ جہاں قبر اپنے مردے سے مخاطب ہے۔

آہ ظالم تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا   میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر   تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک
الحذر محکوم کی میت سے سو بار الحذر   اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک

شعریت اور نغمگی کے ساتھ ساتھ طنز و استہزا کی یہ تراش خراش، یہ دلوں کو جھنجوڑ کر رکھ کر دینے والا اندازِ سخن اس کے فتراک تصورِ حریت کا وہ بے پناہ تیر ہے جو زندہ رو ہی پر نہیں بلکہ مردہ روح پر بھی کارگر نظر آتا ہے۔ اقبال کے پاس ضرب کاری کے ایسے کئی وار ہیں ؎

نے نصیبِ مار و کژدم نے نصیبِ دام و دد
ہے فقط محکوم قوموں کے لئے مرگِ ابد
بانگِ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

اقبال طرح طرح سے ہمارے قلب و دماغ کو صیقل کرتا ہے کبھی کہتا ہے ؎

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے، غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

یا پھر

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید — آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش — وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک
اے کہ غلامی سے ہے روح تری مضمحل — سینۂ بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا مقام

اقبال کے تصورِ آزادی میں انقلاب کی کھوکھلی نعرہ بازی ہے اور نہ قنوطیت کا احساس، ماحول کو بدلنے کے لئے وہ دہشت پسندی یا تباہی کے طوفانوں کو بھی دعوت نہیں دیتا۔ اس کے تصورِ آزادی میں فکر کی گہرائی، عقل کا شعور اور احترامِ آدمیت کا جذبہ ہر جگہ ملحوظ ہے۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است — اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

نقشِ ناتمام

محترمہ آصفہ مجیب

کہتے ہیں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اگر یہ صفت نہ ہوتی تو زندگی اجیرن ہوجاتی، آئے دن ہزاروں باتیں پیش آتی ہیں، دل شکن واقعات اور حادثات گزر جاتے ہیں، ایک دل ناتواں اتنا بوجھ کیسے سہارے، سینہ ہی شق ہوجائے، بڑے بڑے زخم کاری بھی آہستہ آہستہ مندمل ہونے لگتے ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے کچھ ہوا ہی نہیں۔

مگر کہاں؟ بھول جانا کوئی آسان کام ہے؟ دل کا خون ہوتا ہے، داغ پڑ جاتے ہیں گہرے غار اور لکیریں، وہ کون جانے گزرے ہوئے واقعات اپنا ان مٹ نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ نوعیت الگ الگ ہوتی ہے۔ کچھ کو انسان بھلانا چاہتا ہے کچھ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، کسی کی یاد متاعِ عزیز کی طرح سینہ سے لگائے رکھتا ہے، گویا یاد ہی زندگی کا سہارا ہے۔ اور اسی میں روح کی تسکین کا ساز و سامان ہے۔ اور کچھ ایسے کہ بھلانا چاہے پر نہیں بھولتا۔ تیر نیم کش کی سی خلش ہوتی ہی رہتی ہے۔

گھر میں ایک تقریب کی گھما گھمی میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ معلوم کونسا جادو تھا کہ فرزانہ بے اختیار ادھر کھنچ گئی۔ نکہت کا رنگ کندن کی طرح دمک رہا تھا ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ، لانبے گھنے بال، آواز میں ساز کے تاروں کی سی جھنکار، دونوں ذرا دیر میں گھل مل گئیں۔

نکہت نانی کے ساتھ اپنے ماموں کے یہاں تعلیم کی غرض سے آئی ہوئی تھی۔ ان کا گھر بالکل قریب تھا۔ بس ایک گلی بیچ۔ کچھ دور کی رشتہ داری بھی تھی۔ مگر جب لڑکیوں پر بڑی بوڑھیوں کی کڑی

نظر ہی تھی یہ نہیں کہ اونٹ کی طرح گردن اٹھائی اور جہاں جی چاہا چل دیں۔ نکہت کبھی فرزانہ کے گھر آتی تو نانی خالہ یا مامانی ضرور ساتھ ہوتیں۔ کچھ خاندانی روایات تھیں میل جول کے خاص قاعدے اور آداب مقرر تھے۔ جن سے قدم ہٹانا کفر تھا۔ کہیں جانا ہوتا تو بڑوں سے اجازت لینا ضروری تھا۔ لڑکیاں تو درکنار بڑے اپنے بڑوں سے اجازت طلب کرتے اور بغیر مشورہ کے کچھ نہ کرتے وہ زمانے ہی لد گئے۔ کبھی فرزانہ کی دعوت نکہت کے یہاں ہوتی، یا تقریبوں میں ملتیں۔ فرزانہ کو نکہت بہت پسند تھی۔ کبھی وہ اس کی صورت کو چاند سے تشبیہ دیتی کبھی زلف تابدار پر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ اس سے گانا سنا کرتی۔

ایک دن سب سہیلیوں نے مل کر ایک ڈرامہ کیا۔ نکہت سبز ساڑی باندھے۔ بال کھولے اسٹیج پر آئی اور گانا شروع کیا۔

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

یوں تو لڑکوں کو وہاں آنے کی اجازت نہیں تھی لڑکیاں سمجھ رہی تھیں کہ یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا مگر اس وقت فرزانہ کے بھائی جمو میاں خدا جانے کیسے پہنچ گئے۔ کچھ کھلبلی سی پڑ گئی۔ فرزانہ نے کہا: "اللہ بھیا آپ چلے جایئے۔ یہ لوگ کہیں گی میں نے ہی بلایا۔"

ان کی نظریں دلچسپ سین پر جم گئیں۔ مسکرا کر بولے۔

"مجھے کیا خبر تھی کہ یہاں یہ سوانگ رچایا جا رہا ہے۔ آخر ہمارے دیکھنے میں حرج کیا ہے۔ ہم کیوں نہ دیکھیں۔"

کسی نے حجت نہیں کی سب ہی ان کو مانتی تھیں بھیا بھیا کہتی تھیں سین جاری رہا جمو میاں لڑکیوں کی نظروں میں اپنا بھرم قائم رکھنے اور پاس وضع سے ذرا ہی سی دیر ٹھہرے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سر ہلا کر داد دی اور چلے گئے۔ بعد میں تعریف کرکے سب کی بے حد ہمت افزائی کی، ایکٹنگ کو سراہا۔ کبھی چاندنی رات میں دریا کے کنارے یا کسی باغ میں سیر و تفریح کا پروگرام بنتا۔ بیت بازی کی محفل جمتی۔

موسم خوشگوار تھا۔ شام کا وقت، ڈوبتے سورج نے سونا بکھیر دیا تھا۔ پت جھڑ کے بعد سرس اور لکائن میں نئی نئی ہری ہری کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ سرسبز شاخوں پر سنہری کرنوں کا رقص تھا۔ موتیا اور نواڑے کی تازہ کلیاں چٹک کر عطر کے قرابے لنڈھا رہی تھیں، وہ دونوں سبزے پر بے تکلفی سے میٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ دلوں میں نئی اور پاکیزہ امنگوں کا ایک سیل آتشیں رواں اور دواں تھا۔ فرزانہ نے سنا کہ نکہت کا کہیں سے پیغام آیا ہے، اس لئے ماند ارتیٔ پوچھا: اے نکہت، ایک بات پوچھوں... تم نے انھیں دیکھا بھی ہے... کیا تم کو پسند ہیں؟ نکہت کا چہرہ شرم سے لالہ گوں ہو گیا۔ اس نے منہ چھپا لیا۔ پھر فرزانہ کے پیچھے پڑنے پر وہ بڑے فلسفیانہ انداز سے بولی: انھیں میری پسند ناپسند کیا۔ تم بھی کیا باتیں کرتی ہو..... فرزانہ، اصل میں ماں باپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ لڑکی کی طبیعت اور پسند کا بھی تو ان کو خیال ہوتا ہے....." فرزانہ نے اثبات میں سر ہلایا اور غور کرتے ہوئے کہا:

• تم تو بڑی عالمانہ گفتگو کرنے لگی ہو... مگر بھئی میں سمجھتی ہوں کہ دونوں میں محبت ضروری ہے ورنہ زندگی کا مزہ نہیں۔ ذرا دیکھ بھال کے اس کوچہ میں قدم رکھنا چاہیئے۔

• تمہارا مطلب یہ ہے کہ دونوں لیلیٰ اور مجنوں ہو جائیں۔

وہ ہنستے ہوئے بولی: ہاں اور کیا......

پھر اس موضوع پر تبادلۂ خیالات شروع ہوا۔ آنے والی زندگی کا ایک نہایت حسین دل کش خاکہ مرتب کیا گیا۔ نقشہ میں اپنی اپنی پسند سے رنگ بھرا جانے لگا جس میں رہائش مکان کی آرائش، لباس، زیب و زینت، یہاں تک کہ غذا۔ سیر و سیاحت سب ہی کچھ شامل تھا۔ دبی زبان سے در پردہ کچھ بچوں کا ذکر خیر بھی آگیا جو بہت حسین، نو شگفتہ پھول کی طرح ہونے چاہئیں۔ ذہین ہوں۔ مناسب تعداد کا لحاظ بے حد ضروری تھا، بیکار آبادی میں اضافے سے تو کوئی فائدہ نہیں۔ بات اور آگے بڑھی تو سہیلیوں نے چھیڑ چھاڑ میں ان کے خیالی منصوبوں میں اور حاشیہ لگایا۔ ان دونوں کے بچوں میں سے ایک ا

کی خلش بھی ختم ہوئی۔ اور دوستی کی گویا مہر لگا دی۔ سمدھن کا رشتہ قائم کیا گیا۔ اور عرب مہنی قہقہوں کا جوش خروش رہا۔

ایک دن نکہت کالج سے واپسی پر خلاف معمول رکشا فرزانہ کے یہاں روک کر اتر پڑی۔ اس کی آنکھیں سوجھی سی تھیں اور لال معلوم ہوتا تھا کہ روئی ہے۔ وہ سیدھی فرزانہ کے کمرے میں چلی گئی۔ فرزانہ بڑے انہماک سے امتحان کی تیاری میں مصروف تھی پڑھائی میں محو نکہت نے اپنی کتابیں ایک طرف بےدلی سے ڈالتے ہوئے روانسی آواز میں کہا۔

"اور کچھ سنا فرو.... ماموں جان کا تبادلہ ہو گیا .... اب نانی اماں۔ خالہ جان اور میں گھر چلی جاؤں گی۔ صرف ماموں جان ممانی جان اور بچے وہاں جائیں گے۔

فرزانہ کو ایسا معلوم ہوا کہ بم کا گولا پھٹ گیا۔ ہڑبڑا کر کتاب جو ہاتھ میں تھی دو پٹخ دی اور نکہت کے پاس آ گئی جو آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھی، اس نے سسکی بھر کر کہا،

"میں تم سے چھوٹ جاؤں گی ...... اور میری تعلیم کا کیا ہو گا؟

فرزانہ نے گلے میں باہیں ڈال دیں آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ نکہت کے آنسو پونچھتے ہوئے بہت متفکرانہ انداز سے بولی۔

"سچ بات یہ ہے کہ مجھ سے تو تمھارے بغیر نہیں رہا جائے گا یہاں .....

"میں تو تمھیں اپنے گھر لے چلتی مگر گاؤں میں تم کیسے رہ سکتی ہو۔ عجیب گھٹا ہوا ماحول ہے پردے کی قید الگ۔ تمھارا جی نہیں لگے گا۔ اور یہاں اتنے دن رہنے کے بعد تو اب مجھ سے بھی نہیں رہا جائے گا۔ مگر مجبوری کا نام صبر ہے۔ اگر تم بھی ہوتیں تو جنگل میں منگل کا مزہ آ جاتا۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔

فرزانہ نے جوش سے کہا: "یہ اسکیم بالکل غلط ہے۔ تم کو یہاں سے ہرگز نہیں جانا چاہیئے پڑھائی برباد ہو جائے گی۔ سب کو یہ سوچنا چاہیئے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ تم میرے یہاں رہ جاؤ۔ اپنی تعلیم پوری کر لو۔ یہ کیا اندھیر ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر گاؤں میں جا پڑو۔

"میں یہی کر سکتی ہوں کہ پرائیویٹ امتحان دوں۔ اور کیا صورت ہے؟"

"نہیں تم پریشان نہ ہو۔ میں کوشش کروں گی کہ تمھیں میرے ساتھ رکھا جائے.... پھر دیکھا جائے گا۔"

فرزانہ نے تعلیم کی غرض سے نکہت کو اپنے پاس رکھنے کی بہت زوردار اپیل کی۔ ماں کے پیچھے پڑی کہ نکہت کے گھر والوں کو سمجھائیں۔ اسے نہ لے جائیں کیونکہ وہاں اس کی پڑھائی ختم ہو جائے گی اور پھر ایسا سنہرا موقع نہیں ملے گا۔ موجودہ زمانہ میں لڑکیوں کی تعلیم کی بہت اہمیت ہے۔ شادی کے بعد وقت پڑے تو کچھ کام کر سکتی ہیں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہیں۔ ساری مصلحتیں اونچ نیچ بتا دیا مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ وہ کہہ کر تھک گئی، ہار گئی، غم اور غصہ سے حالت تباہ کرلی۔ جانے کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ نکہت ان دنوں بہت دلیر، منہ پھٹ اور زبان دراز ہو گئی تھی۔ وقت، بے وقت بے اجازت فرزانہ کے گھر پہنچ جاتی۔ کوئی ٹوکتا تو جھنجھلا جاتی.. اب چار دن تو جاتے ہیں رہ گئے ہیں اب بھی نہ جاؤں۔" بوڑھی نانی کو بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی۔ دونوں سر جوڑے گھنٹوں باتیں کیا کرتیں۔ زمین اور آسمان کے قلابے ملاتیں۔ خط بہرحال ضرور لکھنا ہے۔ فرزانہ نے وعدہ کیا کہ آنے والی چھٹی میں سب پروگرام برطرف کرکے صرف اس کے پاس آکر رہے گی۔ اور اس نے مسکرا کر کہا۔

"وہاں جنگل میں منگل منائیں گے نہ؟ جمو بھیا کو بھی ساتھ لاؤں گی۔"

نکہت اس تصور ہی سے کھلکھلا پڑی۔

"ضرور...... انشاءاللہ...... وہاں تالاب کے کنارے..... آم کے باغوں کے کنج میں پکنک ہو تو بڑا مزہ آئے گا۔"

آخر وقت تک منصوبے گانٹھا کیے۔

نکہت کو گئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ فرزانہ کے والد کا تبادلہ بمبئی ہو گیا۔ عہدہ بھی بڑھ گیا

بمبئی کی ہنگامہ خیز زندگی نئی اور انوکھی ہزاروں دلچسپیاں، دل بہلانے کے سوبہانے غیر محسوس طور پر نکہت سے چھوٹنے کا غم غلط ہونے لگا۔ سینما، دعوتیں، پارٹیاں، سیر و تفریح ہزاروں مشاغل تھے۔ ملاقات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر اور زیادہ بلند ہو گیا۔ فرزانہ بالکل محو ہو گئی۔ آہستہ آہستہ اس کے آئینۂ خیال میں نکہت کی یاد کا عکس دھندلا پڑنے لگا۔ خط پر خط چلے آرہے تھے وہ پریشان ہو جاتی۔ جواب دینے کی فرصت کہاں تھی اس سے بھی زیادہ ضروری کام تھے۔ ان کو کیسے پس پشت ڈال سکتی ہے ایک دن اس کا خط آنے پر مسکرائی سوچ رہی تھی نکہت کو کچھ پتہ نہیں کہ اس کا وقت کتنا قیمتی ہو گیا ہے۔ اس کا اندازہ کیسے ہو۔ یہ سوچ کر اب کی یہاں کی دلفریبیوں کا ایک نقشہ کھینچ کر اسے بتایا نئے ملاقاتیوں کا کچھ حال، ان کی سیرت کا کچھ عکس۔ نئی سہیلیوں کے اعداد و شمار۔ ان کی وضع قطع ضمناً جو ناپسند تھے ان کا ذکر بھی آگیا ان سے کیسے پیچھا چھڑایا، اس نے بڑا وقت صرف کیا۔ بہت دنوں کی شکایت آج دور کرنا تھی۔ خط کیا ایک داستان تھی عجیب و غریب۔ پڑھتے پڑھتے نکہت کے پسینہ چھوٹنے لگا۔ جذبات میں ایک تلاطم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مینڈک کی طرح ایک ہی تالاب میں پڑی دنیا سے بے خبر سڑے پانی میں ڈبکی لگا رہی ہے اور وہاں..... فرزانہ کے گرد ایک جیتی جاگتی دنیا آباد ہے جہاں تک اس کی اپنی رسائی ناممکن ہے، اسے کتنا رشک آیا تھا۔ اور ایک شعلہ سا دل میں اٹھ رہا تھا۔ جواب میں اپنی بے کیف زندگی اور خاص کر اس سے دوری کا رونا رونے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ فرزانہ متاثر بھی ہوئی اور یہ بھی سوچا کہ یہ دکھڑا کہاں تک سنے، اس نے آہ بھری آخر وہ کیا کرے۔ اب کی اس نے صاف صاف لکھا کہ کاغذی گھوڑے دوڑانے سے کچھ نہیں ہو سکتا تم خود یہاں چلی آؤ۔ تمہاری جیسی لڑکی کو یہاں کی سوسائٹی سر آنکھوں پر جگہ دے گی۔ دنیا دیکھو گی اور اپنی دنیا آپ بنا سکتی ہو۔ بہتر سے بہتر مواقع چشم براہ ہیں۔ میں تو موجود ہی ہوں، میں تمہاری ہر طرح مدد کروں گی تم کہتی ہو کہ بوڑھی نانی کا تم ہی سہارا ہو اور انھیں چھوڑ کر ہٹ نہیں سکتی ہو۔ اس کا میرے پاس کیا

علاج ہے۔ اماں بیمار ہیں وہ تو خیر کچھ دنوں میں اچھی ہو جائیں گی۔ فکر کی بات نہیں۔ خط و کتابت میں ڈھیل سی پڑ گئی۔ مہینوں بعد نکہت کا خط نئے مضمون کا ملا۔ عنقریب اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اس نے لکھا یہ رشتہ جو ہو رہا ہے مصلحتاً صرف ماں اور نانی کی وجہ سے قبول کر کے میں نے اپنے ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی آرزو اور مصلحتوں کو کیسے رد کر سکتی ہوں۔

فرزانہ کے سر سے پیر تک آگ لگ گئی۔ جل بھن کر اس نے خط بے پروائی سے دور پھینک دیا اور بیر زمین پر پٹختی ہوئی دھم سے صوفے پر گر گئی۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا: "افسوس جو ڈوب رہا ہو اسے میں کیسے بچا سکتی ہوں"۔

پھر یہ تکلیف دہ خیال دل سے نکالنے کی کوشش کی اور سوچنا چھوڑ دیا۔ اور سوچنے کی مہلت بھی نہیں تھی۔ اب وہ خود ایک نئی رنگین زندگی میں قدم رکھنے والی تھی۔ سب کچھ عین پسند کے مطابق تھا۔ منتہائے نظر تک، شادی کے موقع پر اس کو نکہت بہت یاد آ رہی تھی۔ بلایا بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ شائد پتہ بدل گیا ہو مدتوں سے اس نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ فرزانہ نے انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ مہینے گزرتے رہے، سال پہ سال، دونوں کو ایک دوسرے کی خبر نہیں تھی، زندگی میں نئے نئے موڑ آئے۔ تیز دھارے۔ مگر سمتیں بالکل الگ الگ رہیں۔ سوا اس کے کہ مشکل سے کوئی اڑتی پڑتی خبر کانوں میں پڑ جائے۔ شادی ہو گئی بچے ہیں، شوہر کا تبادلہ ہو گیا۔ یا بیمار تھی اب اچھی ہے۔

ایک روز فرزانہ کو نکہت کے گاؤں کی ایک بیوی کہیں اتفاق سے مل گئیں انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ جب وہ ملی تھی تو انھوں نے اندازہ کیا کہ وہ اپنی نئی زندگی سے زیادہ مطمئن نہیں ہے۔ فرزانہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ خیال کہاں کہاں پہنچ گیا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب وہ دونوں زندگی کے کئی نقشے بناتی تھیں۔ کیا پتہ تھا کیا ہو گا۔

زندگی کی دھوپ چھاؤں میں پچھلے دنوں کی یاد بھی اکثر اپنا سایہ ڈالتی رہی۔ نہ معلو

کیا بات تھی کہ اتنے نئے لوگ ملے۔ ان میں اچھے بھی تھے۔ دوستی کا دم بھرتے تھے۔ سہیلیاں ہم مذاق پرلطف صحبتیں گرم رہتیں مگر نکہت کے ساتھ جو کیفیت تھی وہ پھر کسی سے پیدا نہیں ہوئی۔ وہ خلوص وہ سادگی نہیں دیکھی، وہی شاید تعلقات کی جان تھی۔ اور وہ اسے بالکل بھول نہیں سکی۔ ایک عمر بیت گئی۔ کبھی ایک دوسرے کی صورت بھی نہ دیکھنے پائیں۔ بہ ظاہر ذرا سی رمق یا تصور بھی باقی نہیں رہا پچھلے تعلق کا۔

سیاسی اور خاندانی بڑے بڑے انقلاب رونما ہوئے۔ بہت دن ہوئے دونوں کے خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ زمانہ نے کتنے نئے نئے رنگ بدلے۔ فرزانہ کے والد اور والدہ کا انتقال ہو گیا۔ پے در پے حادثات نے اس کے دل و دماغ پر بہت اثر ڈالا۔ اس کی صحت اور دل بہلانے کے خیال سے بڑے بھائی نے اسے کراچی بلا لیا۔ وہ یہاں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔

نکہت کو کہیں سے خبر ملی کہ فرزانہ یہاں آئی ہوئی ہے جدائی کے بعد یہ پہلا اتفاق تھا۔ دونوں ستارے گردش کر کے ایک ہی برج میں آ گئے۔ وہ تڑپ اٹھی۔ خوابیدہ آرزوئیں جاگ پڑیں۔ اتنی عمر جس آرزو میں گذری وہ اب پوری کرنے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے ایسا لگا کہ فرزانہ اب اس کے لئے وہ فرزانہ نہیں رہی۔ غیریت کی ایک دیوار بیچ میں حائل ہو چکی ہے۔ اتنی زندگی گذر گئی کبھی صورت بھی نہیں دیکھی۔ کیا معلوم اس کے دل میں یاد باقی بھی ہے یا نہیں۔ وہ اس سے کیا کہہ کر ملے گی۔ تقدیر کے بھی کیا کھیل ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا، ایک یہ، کیا ٹوٹے تاروں کو جوڑنے اور بنانے سے پھر وہی مدھر نغمے اور رسیلے سر نکل سکتے ہیں حیثیت میں وہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہو گئی ہے۔ اس سے دوستی کا دعویٰ؟ رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں محلوں کے۔ یہی کہنے کو ہو گا۔ وہ کشاکش میں پڑی تھی۔ دل تھا کہ مانتا ہی نہیں تھا۔ گھر والوں میں سے کوئی بھی فرزانہ کے عزیز داروں سے واقف نہیں تھا۔ سواری اپنے پاس نہیں، جانے کیسے قسمت سے ایک دن کسی کی موٹر ذرا سی دیر کے لئے مانگے مل گئی، اور وہ فوراً

روانہ ہوگئی۔ ایک نظر دیکھ تو آئے۔

ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی کے دن۔ گرم ہوا کا پریشان کن جھکڑ چل رہا تھا۔ اس کی موٹر دندناتی ہوئی فرزانہ کے عالیشان مکان کے احاطے میں داخل ہوئی۔ نکہت اپنی خوابوں کی دنیا لیے ہوئے۔ یادوں کو احتیاط سے دامن میں سمیٹے اتر پڑی لیٹیں جھٹکی ہوئی۔ دھوپ کی تڑپ سے سیاہ بالوں میں سفید بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ رخساروں پر شکستہ دیوار کی سی لکیریں زیادہ گہری اور نمایاں ہو رہی تھیں۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ ایک دم وہ جھجک اٹھی۔ بے وقت، بے اطلاع اتنے بڑے گھر میں کہاں آگئی ادھر ادھر گھبرا کر دیکھنے لگی۔ جی چاہتا تھا کوئی شناسا لپک کر پاس آجاتا۔ ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ تو دل کتنا بڑھ جاتا۔ خوشی کے بند سوتے پھوٹ نکلتے۔ جمو بھیا کا مہربان، دلکش چہرہ تخیل کے پردوں پر ابھر آیا۔ مگر وہاں سناٹا تھا۔ ایک صورت دکھائی بھی دی تو انجانی۔ اس کے قدم من من بھر کے ہوگئے۔ اتنہ نہ سہی۔ کوئی جانے نہ جانے اپنی فرزانہ تو ہوگی اور کیا چاہیے۔

کچھ بچے برآمدے میں دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ اس نے ایک کے پاس جا کر کہا

"اے بھیا منو۔ فرزانہ بیگم ہیں..... میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔"

اس نے مشکل سے توجہ ادھر منتقل کی "جی وہ.... جی ہاں...... وہ ہیں....."

وہ لجاجت سے بولی: "اچھا مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

بچہ پاس والے کمرے میں لے آیا جہاں فرزانہ کی چھوٹی بھاوج ثریا، بچے کو گود میں بہلا رہی تھی۔ نکہت نے کسی قدر بے قراری کے لہجے میں پوچھا۔

"فرزانہ کہاں ہیں.... کیا میں ذرا دیر کے لئے ان سے مل سکتی ہوں۔"

ثریا نے سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔

"تشریف رکھیے...... میں انھیں اطلاع کرتی ہوں"۔

فرزانہ ابھی اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے لیٹی تھی۔ کتاب ہاتھ میں تھی۔ نیند کا پہلا

ونکا آنے ہی والا تھا کہ ثریا نے اطلاع دی۔

"آپا جان اُٹھیئے.... کوئی بیوی آپ سے ملنے آئی ہیں۔"

وہ چونک پڑی اور تعجب سے کہا۔

"افوہ اتنی دوپہر میں کون آگیا۔ کمال ہے۔"

ثریا ٹھنکتے بچے کو چمکار کر بولی: "شاید آپ کی سسرال کی ہیں۔ یہ منو تو مجھے ڈھنگ سے کسی سے بات ہی نہیں کرنے دیتا۔ پھوپھی اماں سو رہی ہیں وہ بے چاری اکیلی بیٹھی ہیں۔"

فرزانہ دل میں ہنسی سسرال تو شائد ساری ہی امنڈ کر کراچی آگئی ہے۔ باوا آدم کے وقت کے پرانے رشتے نکلتے ہی آتے ہیں۔ اس وقت اسے اٹھنا کھل گیا۔ طوعاً وکرہاً اٹھ کر بال زرا ہاتھوں سے برابر کیئے اور پاس والے کمرے میں پہنچی۔

نکہت تصور میں غرق پلنگ کی پائتی تکلف کے انداز سے بیٹھی تھی۔ دیکھتے ہی اٹھ پڑی ہمہ شوق۔ زرا جھجکتے ہوئے گلے ملی اور مسکرا کر پوچھا۔

"کہو اچھی رہیں؟"

وہ ایسی نظروں سے فرزانہ کو دیکھ رہی تھی جیسے نیلے آکاش میں ان گنت تارے جھلملا رہے ہوں اور فرزانہ...... خاموش... منہ دیکھنے لگی...... اس نے سوچتے ہوئے پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ کب یہ صورت دیکھی .... کہاں دیکھی .... شاید کبھی نہیں.... یہ رنگ ہیں.... یہ لہجہ.... کتنی جاذبیت ہے ان میں جیسے کہ خوب جانتی ہیں۔ وہ دماغ پر زور دے رہی تھی۔ دریچوں سے اندر جھانک رہی تھی جیسے اندھیرے گھپ میں کچھ ٹٹول رہی ہو۔ مگر تقریباً پچیس برس پرانے بوسیدہ پردوں کی موٹی موٹی تہوں نے یادوں کے دلآویز نقوش اس طرح ڈھانپ لئے تھے کہ نظر ناکام واپس آئی۔ اس کے کچھ بھی ہاتھ نہ لگا۔ وہ شکست خوردگی پر بھی تیار نہیں تھی۔ کوئی اپنے سے اس طرح الگ کے ملے تو منہ پر کیسے پھٹ سے کہہ دے کہ نہیں پہچانتی۔ اس میں دل شکنی بھی اور شرمندگی الگ۔ وہ خیالات میں الجھی ہوئی دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئی اور

اخلاق کے طور پر کہا: "اچھی طرح بیٹھیں ۔تکلیف سے بیٹھی ہیں ..... ہاں جب سے یہاں آئی ہوں میری طبیعت بہت اچھی ہے ۔سب سے مل کر جی بہل گیا ۔ بہت دنوں بعد آئی ہو اب کی "

نکہت زرا کسمسا کر اوپر کھسک گئی ۔

"جب سے سُنا ہے کہ تم آئی ہو بڑا دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا جب ہی سے آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس میں کئی دن لگ گئے ۔ دور بہت ہے ۔سواری کی دقت .... آج بڑی مشکل سے موٹر مانگ کر آئی ہوں"

فرزانہ کے خیالات ایک نو وارد مسافر کی طرح ادھر ادھر بھٹک رہے تھے ۔وہ بات بناتے ہوئے بولی: "ہاں اور کیا غضب کے فاصلہ ہیں یہاں .... ایک سرا یہ تو ایک سرا وہ ... بس راستہ ناپا کرے کوئی ..... بڑی مشکل ہے "

وہ موضوع گفتگو تلاش کرنے لگی ۔

"صحت کا کیا حال رہتا ہے ۔ٹھیک رہتی ہے ؟"

"ہاں ..... ٹھیک ہی ہے آج کل تو ۔

"اور بچے ..... بچے اچھے ہیں .... ؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا ۔کوئی ہو جو زرا سی اس کی مدد کرے ۔اشارہ سے بتا دے کہ کون ہے ۔ثریا بدستور بچے میں منہمک تھی دنیا و مافیہا سے بے خبر ۔ایک ضعیفہ زرا فاصلہ پر پلنگ پر غنودگی کی حالت میں پڑی نیم وا آنکھوں سے کبھی دیکھ لیتیں ۔عدم وجود برابر تھا فرزانہ کا دم گھٹنے سا لگا ۔دل بھی اکھڑا اکھڑا تھا ۔باتیں بھی اوپری اوپری ۔

نکہت نے بہت پست آواز میں جواب دیا ۔

"ہاں خدا کا شکر ہے بچے سب اچھی طرح ہیں ۔"

یہ کہہ کر اس نے سر تھام لیا دماغ تپنے سا لگا ۔آہ فرزانہ اسے بھول چکی ہے ۔ میٹھی باتوں

اسے کچھ بھی دھیان نہیں ہے۔ اب تک وہ دھوکے میں تھی۔ سراب کو حقیقت سمجھ کر تشنہ لب یہاں دوڑ آئی۔ یہاں کیا دھرا ہے۔ خشک ویران کھنڈر۔ سب کچھ خواب ہو گیا۔ خوابوں کی دنیا درہم برہم لگ رہی تھی۔ کیا وہ اپنے کو تیلائے کہ کون ہے۔ بھولا ہوا افسانہ پھر سے دہرا لے۔ بھولی بسری باتوں کو رٹ کے بیٹھے...... اور پھر بھی نہ یاد آئے تو...... اب کچھ کہنا سننا بیکار ہے جو ہونا تھا ہو گیا..... دل کی عجیب کیفیت ہونے لگی۔ وہ کھوئی ہوئی سی کھڑی ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ گنوا دیا ہو۔

" اب جا رہی ہوں..... اتنی ہی دیر کے لئے موٹر ملی تھی جنھوں نے دی ان کو کہیں جانا ہے اس وقت "

فرزانہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں جو کرنیں سی تھوڑی دیر پہلے چمک رہی تھیں وہ غائب ہو چکی تھیں وہ گھبرا کر اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

" ارے ابھی سے..... اتنی جلدی....."

وہ بہت جلدی میں تھی۔ تیزی سے جا کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ چلتے وقت گھر کے کچھ لوگ آئے بھی تو کوئی بات چیت نہ ہو سکی۔ فرزانہ کا بے اختیار جی چاہا کہ اس کا دامن پکڑ کے کھینچ لے۔ صاف صاف پوچھے۔ کچھ بتائے۔ وہ عجیب مخمصے میں کھڑی رہ گئی۔ نکہت ہوا ہو گئی۔ فرزانہ کو ایسا معلوم ہوا کہ بادل ایک دم گھر کر آئے اور رم جھم برس کر نکل گئے۔ یا نسیم بہار کا کوئی جھونکا آیا۔ فضا خوشبو سے اب تک معطر ہے۔ وہ حیران تھی۔ کوئی شعلہ ہو یا بجلی آئی بھی اور گئی بھی۔ اس کا دل بھاری تھا نکہت کے جانے کے بعد اس نے ایک ایک سے کہنا شروع کیا " بھئی یہ کون تھیں میں نے آخر وقت تک انھیں نہیں پہچانا۔ دماغ پر بہت زور ڈالا کچھ پتے نہیں پڑا۔ ثریا ہنس کر بولی۔

" لیجئے ہم تو سمجھی کہ آپ جانتی ہیں۔ کوئی خاص عزیز ہیں آپ کی "

آپس میں خوب چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ تب پتہ چلا کہ یہ نکہت تھی۔

فرزانہ کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس وقت عجیب حالت تھی۔ ایک دم سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

ہائے یہ نکہت تھی..... اس کی نکہت جس کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہو سکی۔ اتنا کہہ کے کوئی اس نے پہچانا نہیں۔ اندھیر ہو گیا۔ دنیا تاریک لگ رہی۔ زمین اور آسمان اس کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ کتنی گذری باتیں اس کے ذہن میں ایک ایک کرکے نیش زنی کر رہی تھیں کچوکے دے رہی تھیں، پہچانتی تو کیسے ملتی۔ پلکیں فرش زاہ کرتی۔ خوب خوب گلے شکوے کرتی ———— اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

عقل پر کیسے پتھر پڑ گئے تھے۔ وہ دماغ جیسے ماؤف ہو گیا ہے۔ جی کیسا ٹوٹ گیا ہوگا۔ جب ہی کچھ نہ کہا نہ سنا، کیا ستم ہے زمانے نے اس تو بہار ناز مجسم رعنائی کو آج اس پامال حالت میں دکھایا۔ اب وہ کیا کرے۔ وہ ضرور اسے ڈھونڈے گی ضرور ملے گی۔

وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ نکہت کے دل میں اب تک اس کی یاد باقی ہے۔ سالہا سال گذر گئے۔ محبت امر ہے وہ کبھی فنا نہیں ہوتی۔ اس پر ایک روحانی کیف چھا گیا۔ وہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد خود کو ایک اعلیٰ اور بلند مقام پر محسوس کر رہی تھی جو روحانیت سے معمور اور منور تھا۔ جہاں وہ اور نکہت تھی۔

اس نے اب کوئی کوشش اس سے ملنے کی اٹھا نہ رکھی۔ پتہ پوچھا۔ اِدھر اُدھر بھاگی پھری لیکن حسرت ہی رہی، نکہت نہ مل سکی۔

اتنی بڑی دولت پا کر بھی وہ تہی دست اور محروم تھی۔

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے)

خُطبات ماجدی یا سیرۃ نبویؐ قرآنی

از مولانا عبدالماجد دریابادی

سائز $\frac{20\times30}{16}$ حجم ۲۶۴ صفحات، قیمت دو روپے ۷۵ نئے پیسے۔ تاریخ اشاعت: ۶۴ء

ملنے کا پتہ: صدق جدید ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ

پیش نظر کتاب ان چند لکچروں کا مجموعہ ہے، جو ۱۹۵۸ء میں "سیرۃ نبویؐ قرآن مجید کی روشنی میں" کے عنوان سے مدراس میں دئے گئے تھے۔ فاضل مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "یہ مجموعۂ اوراق ہرگز ایک مکمل سیرۃ نبویؐ قرآنی نہیں"۔ لیکن فہرست مضامین سیرت نبویؐ کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں پر حاوی ہے ویسے یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس پر جس قدر بھی لکھا جائے سیری نہیں ہوتی۔ بہرحال اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے، جیسا کہ خود فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ اس خصوصی موضوع پر مولانا عبدالشکور لکھنوی مرحوم کی ایک مختصر کتاب کے علاوہ اور کوئی کتاب نہیں ہے۔

مولانا دریابادی اب عمر کے اس دور میں ہیں، جب عام طور پر لوگ ہار تھک کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں مگر مولانا کا قلم اب بھی جوان ہے اور علم و دین کی خدمت میں پورے جوش و خروش کے ساتھ مصروف ہے۔

سرچشمۂ قرآن

تالیف: مولانا ابوالفدا محمد عبدالقادر

سائز $\frac{20\times30}{16}$، حجم ۴۲۸ صفحات۔ قیمت دو روپے ۲۵ نئے پیسے تاریخ اشاعت ۶۲ء، ملنے کا پتہ: حیدرا بینڈ سنز تاجر کتب چارکمان۔ حیدرآباد (اے۔ پی)

ایک مشہور مستشرق ڈاکٹر ٹسڈل نے ایک کتاب لکھی ہے، جو عربی فارسی میں ینابیع الاسلام" اور انگریزی میں "سورسز آف اسلام" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ جناب نیاز فتحپوری نے نگار کے جنوری فروری ۱۹۴۵ء کے مشترکہ شمارہ میں ماخذ القرآن" کے نام سے اس کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں لکھا گیا ہے کہ قرآن مجید سابقہ مذہبی کتب اور تعلیمات اور جاہلیت عرب کے رسوم سے ماخوذ ہے مولانا عبدالقادر صاحب نے اپنی اس کتاب میں ڈاکٹر ٹسڈل کے خیالات اور اعتراضات کا تفصیل سے جواب دیا ہے۔

شیخ الہند جنتری ۱۹۶۳ء ناشر: گوشۂ ادب - مٹیا محل - دہلی ۶

شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کی یادگار میں یہ جنتری مرتب کی گئی ہے۔ اس میں عیسوی اور ہجری تاریخوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری رائج تاریخیں بھی درج ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف قسم کی مفید اور ضروری معلومات بھی دی گئی ہیں، جن کی وجہ سے اس کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اگلے سال اس میں مفید تر ہم و اضافہ کا وعدہ کیا گیا ہے۔
قیمت ایک روپیہ۔

کوائف جامعہ

مولانا عبدالماجد دریابادی جامعہ میں

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ان بزرگوں میں سے ہیں، جن کو جامعہ سے قلبی لگاؤ ہے اور اس کی کامیابیوں اور ترقیوں سے خوش ہوتے ہیں۔ موصوف ابھی حال میں چند دنوں کے لئے دلی تشریف لائے تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے یہاں قیام کیا تھا۔ اپنی غیر معمولی مصروفیت کے باوجود انھوں نے جامعہ کو یاد رکھا اور خاص طور سے وقت نکال کر جامعہ تشریف لائے۔

ہمارے یہاں کے ایک استاد، اپنے ذاتی شوق کی بنا پر، جامعہ کے ممتاز مہمانوں سے یادگار کے طور پر ان سے کچھ لکھنے کی درخواست کیا کرتے ہیں۔ مولانائے محروم کی آمد سے انھوں نے بھی نامہ اٹھایا اور ان سے کچھ لکھنے کی درخواست کی۔ اس پر موصوف نے حسب ذیل تاثرات لکھے ہیں:۔

"سالہا سال کے بعد آج حدود جامعہ میں قدم رکھنے کا اتفاق ہوا۔ اکابر اصاغر، بڑوں اور چھوٹوں سب نے جس لطف و محبت کے ساتھ پزیرائی کی، اس کا گہرا نقش دل پر بنا کر جاتا ہوں۔

نماز مغرب بہت بڑی جماعت کے ساتھ پڑھی۔ اس لئے کم سے کم نماز مغرب کی پابندی کی حد تک بڑا خوشگوار اثر پڑا۔ دینی شعبوں کے استاد و نگراں حضرات سے توقع بھی اسی کی تھی۔

محمد علیؒ اور محمود حسنؒ کے لگائے اور ذاکر حسین خاں کے پروان چڑھائے ہوئے پودے کے حق میں بجز دعائے خیر کے اور دل سے نکل ہی کیا سکتا ہے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو ان کی کتاب کی پیش کش

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے، عرصہ ہوا بچوں کے مشہور پرچے پیام تعلیم میں اپنی لڑکی رفیقہ حیاتؔ

کے نام سے بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی تھیں۔ مکتبہ جامعہ نے اس سال ان کہانیوں کا مجموعہ "ابو خاں کی بکری" بلاک کے ذریعہ بہت خوب صورت شائع کیا ہے۔ اس کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے مکتبہ جامعہ نے ۲۷ جولائی کو مخصوص تقریب منائی اور جنرل جناب غلام ربانی صاحب تاباں کی درخواست پر شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے ڈاکٹر ذاکر صاحب کی خدمت میں کتاب پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے بچوں کے ادب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "صحیح معنوں میں بچوں کی کتاب وہی لکھ سکتا ہے جو اسے لکھتے وقت خود بھی بچہ بن جائے۔ بچوں سے بالاتر ہو کر اگر ان کے لئے لکھا جائے تو اس کو چاہے نام کچھ ہی دے دیا جائے، وہ بچوں کی کتاب نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ کہانیاں بچہ بن کر لکھی ہیں اس لئے بچوں نے بھی انہیں پسند کیا ہے اور مجھے یقین ہے آپ حضرات بھی انھیں پسند فرمائیں گے۔"

ملک کے ایک ممتاز آرٹسٹ ستیش گجرال صاحب نے اس کتاب کی تصویریں بنائی ہیں۔ وہ بھی خاص طور پر اس جلسے میں مدعو تھے۔

مراسلے

ہندوستانی قومیت اور مسلمان

از دہلی

مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۶۳ء

کرم فرمائے بندہ جناب سرور صاحب۔ تسلیمات

رسالہ جامعہ میں "ہندوستانی قومیت اور مسلمان" کے عنوان سے آپ کا جامع مضمون پڑھا، اور بہت غور سے پڑھا۔ ایک تو موضوع اتنا اہم اور پھر مضمون آپ کا لکھا ہوا۔ آپ سے میری اتنی بے تکلفی ہو چکی ہے کہ اس معاملہ میں کسی غلط فہمی کے اندیشہ کے بغیر دل کھول کر اپنے خیالات لکھ سکتا ہوں پہلے ایک دو جملوں میں پس منظر عرض کر دوں۔

فروری ۱۹۶۲ء میں دلی کارپوریشن کا انتخاب ہوا میری اہلیہ بھی کانگریس ٹکٹ پر امیدوار تھیں۔ ہندوؤں کی اکثریت نے جن سنگھی امیدوار کو ووٹ دیے مسلم اکثریت نے آزاد مسلمان امیدوار کو ہندو زیادہ تھے مسلمان کم لہٰذا جن سنگھ جیت گیا۔ اعداد آرا کچھ ایسے تھے کانگریس تین ہزار جن سنگھ سوا تین ہزار اور آزاد مسلمان ایک ہزار آٹھ سو، ظاہر ہے کہ مسلمان امیدوار کی کامیابی کے کوئی امکانات نہیں تھے مگر وہ اس ضد پر کھڑا کیا گیا کہ کانگریس نے مسلمان کو ٹکٹ دینے کے بدلے ایک ہندو عورت کو ٹکٹ کیوں دیا۔ چھ پولنگ پر جن سنگھ جیتا، پانچ پر کانگریس یعنی میری اہلیہ اور دو پر آزاد مسلمان ظاہر ہے کہ اگر وہ نہ کھڑا ہوتا تو ان دونوں پر میری اہلیہ جیتتی۔ نتیجہ نکلنے کے بعد بھی بیشتر مسلمانوں کا یہی کہنا تھا کہ ہمیں اس سے کیا کہ ہندو کانگریسی کامیاب ہوا یا ہندو جن سنگھی جب مسلمان کامیاب نہیں ہوا تو ہمارے لئے دونوں یکساں ہیں، مسلم ووٹوں میں سے سات سو میری اہلیہ کو اور ایک ہزار سات سو آزاد مسلم امیدوار کو ملے مجھ کو

جب جناب لال بہادر شاستری نے دریافت کیا کہ کوئی آزاد مسلم امیدوار تو نہیں کھڑا ہوا ہے تو میں نے نہایت یقین کے ساتھ کہا کہ ہاں ایک لڑکا ہے تو مگر مسلم ووٹوں کی اکثریت تو ہمارے خلاف نہیں جا سکتی شاستری نے فرمایا مشکل ہے، میں نے کہا کہ مجھے تو کوئی مشکل نظر نہیں آتی انھوں نے فرمایا کہ میں تمام ہندوستان کا تجربہ کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں میں نے عرض کیا کہ جب تک ووٹ نہ پڑ جائیں میں آپ کی بات نہیں مان سکتا آخر ان کی بات صحیح نکلی جب سے میں ایک ذہنی انتشار میں مبتلا ہوں۔ میں اسی علاقے سے اسمبلی کا الکشن لڑا تھا اور کامیاب ہوا تھا کیونکہ براہ راست جن سنگھ سے مقابلہ تھا ہندوؤں میں میرے آٹھ سو ووٹ گھٹ گئے تھے مگر مسلمانوں کے ساڑھے چودہ سو ووٹ میرے حق میں پڑے اس لئے میں ساڑھے چھ سو ووٹ سے جیت گیا تھا اب مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اس وقت بھی کوئی آزاد مسلمان کھڑا ہو گیا ہوتا تو میں ہار جاتا۔

یہ سب باتیں بر سبیل تمہید عرض کی ہیں۔ اب اصل موضوع پر آتا ہوں آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ڈاکٹر تارا چند کے مکان پر عرض کیا تھا کہ تابوت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں جماعت اسلامی کے جذبات کا خیال رکھنا ضروری ہے مگر اس اجتماع کی اکثریت نے میری بات نہیں مانی۔ جب ظفر کا مجسمہ نصب کرنے کا سوال پیدا ہوا تو بیگم حمیدہ اور حکیم خلیل الرحمن صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم مسلمان ہوتے ہوئے اس کی تائید نہیں کر سکتے۔ میرے لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی، مجھے وہ زمانہ یاد ہے کہ جب پارلیمنٹ کے ممبر ہونے سے پہلے مولانا حفظ الرحمن صاحب فوٹو کا کیمرا سامنے دیکھ کر ہٹ جایا کرتے تھے اور زیادہ وضاحت سے عرض کر رہا ہوں کہ ہندوؤں کا خدا ناچتا ہے گاتا ہے مکھن چرا کر کھاتا ہے مسلمان اسے کیسے برداشت کرے اور یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہندوستان کے تمدن میں کرشن کا کتنا بڑا دخل ہے۔ صوفیوں کی بدولت قبروں پر گانا بجانا ہونے لگا یہ اور بات ہے لیکن دیوبندی یا وہابی طبقہ تو اسے پسند نہیں کرتا شاہ ابن سعود تو مہاتما گاندھی کی قبر پر پھول چڑھانے نہیں گئے کہ کہیں قبر پرستی کا الزام نہ لگ جائے اگر اقبال نے کہا کہ "ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیست"

تو بات تو فقط مختصر ہے لیکن مقام غور ضرور ہے کیونکہ قوم المسلمین کے ہوتے ہوئے اور قوم کہیں آپ کہیں گے کہ قوم کا لفظ کن معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا مولانا حسین احمد مرحوم نے اقبال کے جواب میں کہا تھا لیکن قوم کی تعریف تو آج تک مغرب میں بھی طے نہ ہو سکی (NATION) اور NATIONALITY کی بحث میں اب تک بال کی کھال نکالی جا رہی ہے مجھے یاد ہے کہ کانگریس میں شامل ہونے سے پہلے جب میں کائستھ صدر سبھا کا ممبر تھا تو کائستھ ہتکاری نام سے جو اخبار نکلتا تھا اس پر درج تھا۔ "چھیالیس لاکھ 'قوم' کائستھان کا واحد ترجمان"

اور جب میں ۱۹۱۷ء میں لکھنؤ کی عدالت میں بہ حیثیت نقل نویس ملازم ہوا تو وہاں قوم لوہار قوم کمہار وغیرہ لکھا جاتا تھا۔ پہلے قوم کی تعریف طے ہو تو قومیت کا سوال حل ہو اور ہندوستانی قومیت تو اس کے بھی بعد کی بات ہے۔ قوم کی بنیاد نسل، مذہب، تمدن، زبان، جغرافیائی حدود یا حکومت ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں نسل ایک نہیں، مذہب ایک نہیں، زبان ایک نہیں، تمدن ایک نہیں جغرافیائی حدود بدلتے رہتے ہیں، البتہ حکومت ایک ہے اور ظاہر ہے کہ یہ قومیت کی سب سے کمزور بنیاد ہے۔

پچھلی صدی میں غدر کے ناکام ہونے کے بعد جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں انگریز کی خوشامد کا مقابلہ شروع ہوا تو ہندو کہتا تھا کہ ہم بھی آرین نسل سے ہیں اور انگریز بھی، ادھر مسلمان کہتا تھا کہ ہم بھی اہل کتاب ہیں اور انگریز بھی، اسی بات پر اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

از راہِ تملق کوئی جوڑا کرے رشتہ
انگریز تو نیٹو کے چچا ہو نہیں سکتے

لیکن آخر اس چچا نے ملک تقسیم کرا دیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس بارے میں ہندوؤں کا ہاتھ زیادہ تھا یا مسلمانوں کا، شاید ہندوؤں کا ہاتھ زیادہ تھا۔ کیونکہ میرے سیاست میں داخل ہونے کے بعد جس چیز سے پاکستان کی پہلی بنیاد پڑی وہ شدھی سنگھٹن کی ۲۳ء کی تحریک تھی جس کی گاندھی جی نے اور مجھ سے والنٹیروں نے مخالفت کی مگر یہ نہ بھولنا چاہیے کہ

راجندر بابو ہندو مہا سبھا میں تھے اور مولانا آزاد تنظیم کے کام میں۔ جب آپ ابوالکلام کے نام پر یا راجندر بابو کے نام پر متحدہ قومیت کی اپیل کرتا ہوں تو یہ مصلحت آمیزی اس لئے ہے کہ اس بات میں بلاواسطہ کوئی فتنہ انگیزی ہوگی بیشک ہندو اور قوم پرور مسلمان پاکستان کی مخالفت کر رہے ہیں مگر ہندو اس لئے کہ ہندوؤں کا غلبہ تمام ملک پر رہے اور مسلمان اس لئے کہ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد مسلمان دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے کہا تھا کہ

"LET US NOT FORGET THAT A MUSLIM THINKS MORE IN TERMS OF KHILAFAT THAN IN TERMS OF SWARAJ"

اور یہ وہ زمانہ تھا جب تمام ملک میں ہندو مسلم اتحاد کا ڈنکا بج رہا تھا۔ بلاشبہ مولانا آزاد اور راجن بابو کی زندگی ہم لوگوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ لیکن وقتی ہوا کے تند جھونکوں نے کبھی کبھی اسے بھی مدھم کر دیا۔

مسلمان آج اپنے تئیں مظلوم سمجھتا ہے تو ٹھیک سمجھتا ہے نوکریوں میں، ٹھیکوں میں، تجارت میں ہر جگہ اس کے خلاف امتیاز ہوتا ہے اس لئے کہ عام ہندو کا خیال ہے کہ اس نے پاکستان بنوایا۔ اس مسلمان کا یہ قصور ضرور ہے کہ اب بھی وہ میچ کے کھیل میں پاکستان کی جیت چاہتا ہے اور پاکستان میں ہندوؤں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی دل کھول کر مذمت نہیں کرتا۔

اب رہی بیڑی اسلام کی بات۔ ایک مولوی کو پردہ اٹھنے پر غصہ آتا ہے۔ اب اگر آپ یا میں پردہ کے خلاف ہوں تو مذہبی معاملے میں ہماری رائے کی کیا اہمیت ہے۔ جواہر لال نہرو نے پردہ اٹھانے کو کہا تو دعوت نے اسے مداخلت فی الدین قرار دے کر پنڈت جی کے خلاف بہت سخت مقالہ لکھا۔ سوال یہ ہے کہ جب ملکی رہنما ترقی کی ایک راہ سمجھتے ہوں اور دینی رہنما دوسری تو پھر کیا ہو، بہر حال دین دنیا پر مقدم ہے اس لئے پردہ رہنا ہی چاہیئے۔ داڑھی رکھنی چاہیئے، نماز عربی میں ہونی چاہیئے، جانداروں کی تصویریں بنانا، گانا بجانا نامناسب خلاف اسلام ہیں اور حکومت وقت ان سب کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ اب اگر مسلمان ان سب معاملوں

ہی زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز پر عمل کرے تو ٹھیک ہے لیکن اگر وہ تحقیق کے ساتھ اسلام کی پیروی کرے تو ہندوستان میں گنڈ کیسے ہو اس تختہ بندی کے ساتھ تحر دریا میں دامن تر تو ہونا ہی ہے۔ گستاخی معاف وکرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔

اردو کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اسے اس لئے نہیں لکھا کہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں مسلمان آج اگر اردو کے لئے ہندی رسم الخط قبول کرلے تو ہندو اپنی روایتی تنگ دلی کی بنیاد پر اسے رواداری نہیں بلکہ اعتراف شکست سمجھے گا۔ فرمایئے کہ متحدہ قومیت کیسے قائم ہو۔ دلی میں بیشتر ہندو بزرگ بے ایمانی سے اپنی زبان ہندی لکھاتے ہیں۔ والسلام

نیازمند

گوپی ناتھ امن

اعظمی صاحب!

اس کا جواب میرے خیال میں ضروری نہیں۔ امن صاحب کو بظاہر میرے بنیادی تصورات سے اختلاف نہیں ہے۔ اس راہ کی دشواریوں کی طرف انھوں نے ضرور اشارہ کیا ہے۔ دشواریوں کا مجھے بھی احساس ہے، اسی لئے اس موضوع پر اظہار خیال کرنا تھا۔ کچھ ہندوؤں کی تنگ نظری کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنے فرض کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔

سرور

۱۰ رجون ۱۹۶۳ء

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۹ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء | شمارہ ۴

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

تعلیم کا فلسفہ

پروفیسر محمد مجیب

انسان کو شاید جس بات کا سب سے پہلے احساس ہوا وہ زندگی اور موت کا فرق تھا۔ اور اس وقت سے اب تک وہ موت سے بچنے کی طرح طرح سے تدبیریں کرتا رہا ہے جسم کو تو محفوظ رکھا نہیں جا سکتا تھا، بقا کی صورت صرف یہ ہو سکتی تھی کہ نسل کو قائم رکھا جائے اور اسے قائم رکھنے میں صرف تندرستی کے طریقوں پر بھروسہ نہ کیا جائے، بلکہ ان سے گذر کر ان قدروں کا سہارا لیا جائے، جن کی بدولت زندگی میں معنی اور مقصد پیدا ہوتے ہیں۔ تعلیم کا سلسلہ جب شروع ہوا یہیں سے شروع ہوا۔ اب اگر ہم پیچھے مڑ کر انسان کی ہزاروں برس کی تاریخ کو دیکھیں تو تعلیم کی شکلیں، اس کے طریقے بدلتے ہوئے نظر آئیں گے، اس میں نئی وسعتیں پیدا ہوتی، نئے شوق کارفرما ہوتے ملیں گے، لیکن بنیادی طور پر اس کا مقصد وہی رہا ہے جو شروع میں تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تعلیم کا مقصد مقرر کرنا کبھی بھی آسان تھا۔ قدروں کی ترجمانی ہمیشہ کسی نظام حیات کی شکل میں کی گئی جسے شریعت یا دھرم بھی کہہ سکتے ہیں اور اسے قائم رکھنے کی ایک صورت یہ سمجھی گئی کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہونے دی جائے اور دوسری یہ کہ قاعدے قانون کے اصل منشا کو اس کی ظاہری شکل پر ترجیح دی جائے۔ قدیم مصر، ہندوستان، یونان جہاں کہیں بھی دیکھیے، ظاہر اور باطن کی کش مکش نظر آئے گی اور یہ کش مکش خود معلموں نے پیدا کی، مثلاً قدیم ہندوستان میں عقیدہ، رسم اور دستور کی بنیاد پر دینی زندگی کو ایک خاص شکل دی گئی، مگر ان فلسفیوں نے جن کے تصورات اپنشدوں میں ملتے ہیں یہ کہا کہ یہ تمام رسمیں جو برہمن ادا کرتے ہیں مہمل ہیں، انسان کے وجود کا مقصد کہ اس کی ذات اصل وجود میں یعنی اس کی آتما پرم آتما میں فنا ہو جائے ان رسموں کے

ذریعہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ یونان میں روایتی مذہب کے مقابلے پر ایسے تصورات لائے گئے ہیں جن پر صحیح زندگی کی بنیاد رکھی جاسکتی تھی اور افلاطون کی مشہور کتاب ریاست میں زندگی کے ایک پورے نظام کا خاکہ ملتا ہے جس کی بنیاد عدل پر رکھی گئی اور جسے قائم رکھنا تعلیم کا منصب قرار دیا گیا۔ مسلمانوں میں قریب ایک ہزار سال سے شریعت اور طریقت، کتابی اور وجدانی علم، عقل اور عشق کی آویزش نظر آتی ہے۔ ہمارے اپنے زمانے میں اگر ایک طرف یہ میلان ہے کہ مسلسل تغیر کو بقا کا ضامن قرار دیا جائے تو دوسری طرف اس کی کوشش کی جارہی ہے کہ انسان کو معلوم اور معین عقیدوں یا علمی اور سماجی نظریوں کا پابند رکھا جائے، یا پھر لوگ اس کا گلہ کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ دبدھا میں دونوں گئے، نہ مایا ملی نہ رام۔ تعلیم کے ایسے اصول اور طریقے جن میں قیام اور تغیر دونوں کی قدروں کو ہم آہنگ کیا گیا ہو فرض تو کیے جاسکتے ہیں مگر انھیں عمل میں لانا اسی وقت ممکن ہوگا جب ایسے استاد ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں مل جائیں جن کی اپنی طبیعتوں میں نئی اور پرانی قدریں ہم آہنگ ہوگئی ہوں، اس لئے کہ ایسے ہی استاد نئی نسلوں کی رہنمائی کرسکیں گے۔

ایک اور مشکل یہ ہے کہ تعلیم کے مقاصد صرف ذہنی اور روحانی نہیں بلکہ مادی بھی ہیں، انسان کی اخلاقی تربیت کا کوئی طریقہ کامیاب نہیں ہوسکتا اگر اس میں روزگار کے مسئلے کو نظر انداز کیا جائے۔ اب دنیا کے اکثر حصوں میں دینی تعلیم کا وہ مرتبہ نہیں رہا ہے جو دو تین سو برس پہلے تھا، اب اسے شہریت اور اخلاق کی تعلیم کا روپ دے دیا گیا ہے، جس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ خالص مادی اغراض کا مقابلہ کرسکے جب کہ زندگی کا نقشہ صنعت اور کاروبار کی ضرورتیں بناتی اور بگاڑتی ہیں۔ بے شک محسوس کیا جاتا ہے کہ تعلیم کو اخلاقی اور روحانی قدروں سے بے تعلق نہ ہونا چاہیے، اور کہیں کہیں تعلیم کو آزاد رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن ایسے ملک بھی ہیں جن میں تعلیم کو اصولاً معاشی اور سماجی اغراض کا پابند کردیا گیا ہے۔ اس بات کو ہم صحیح سمجھیں یا غلط، تعلیم کا منصب وہی رہتا ہے جو شروع میں تھا، یعنی وہ نظام زندگی کے تحفظ کی ذمہ دار مانی جاتی ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ تعلیم صرف ایک آلہ ہے جس کا متضاد مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دین کو قائم رکھنے اور اس کی جڑوں کو اکھاڑنے کے

لئے۔ انسان کو یہ سکھلانے کے لئے کہ اسے آزادی اور یک سوئی کے ساتھ اپنی شخصیت کی تعمیر اور اپنے مقاصد کے حصول میں مصروف رہنا چاہیئے اور اسے اس قابل بنانے کے لئے کہ وہ دولت پیدا کرسکے، چاہے اس کی خاطر اسے اپنی شخصیت کو قربان کرنا پڑے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ تعلیم کا ایک الگ فلسفہ ہے، اس کے اپنے مقاصد ہیں، اپنا نصب العین ہے، وہ سراسر خادم نہیں بلکہ ایک حد تک مخدوم بھی ہے؟

اس سوال کا جواب سب کی طرف سے نہیں دیا جا سکتا، اسے ہر ایک کو اپنے لئے اور اپنی ذمہ داری پر دینا چاہیئے۔ میں خود اپنی استعداد کو دیکھتا ہوں تو ایک قصہ یاد آتا ہے جو ایک دوست نے کچھ دن ہوئے سنایا تھا کہ بنگال کے مشہور عالم ودیا ساگر سے ان کے ایک معتقد ملنے کے لئے کلکتہ آئے، وہ شہر سے واقف نہ تھے، اسٹیشن سے نکلے تو ان کی نظر ایک جوان پر پڑی جو بظاہر بہت سمجھدار معلوم ہوتا تھا، انھوں نے اس سے ودیا ساگر کا پتہ پوچھا، اس نے کہا کہ ودیا ساگر کا پتہ کس کو معلوم نہیں، چلئے میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔ بیچارہ مسافر صبح چھ بجے سے سہ پہر کو چار بجے تک نوجوان کی رہنمائی میں بھٹکتا رہا، جب آخر کار ودیا ساگر کے مکان پر پہنچا اور ان کو اپنی بپتا سنائی تو وہ ہنس کر بولے کہ میں اس نوجوان کو اچھی طرح جانتا ہوں، یہ فلکیات کا ماہر ہے، آسمان کے جغرافیہ سے بہت اچھی واقفیت رکھتا ہے، زمین کے جغرافیہ کو بالکل نہیں سمجھتا۔ جو لوگ تعلیم کے مقاصد کی کھوج کرتے ہیں وہ اکثر اس کی فلکیات میں گم ہو جاتے ہیں، ان کے فکر میں دنیا کی حیثیت سیاروں میں ایک سیارے کی سی ہو جاتی ہے، وہ وقت کا حساب اس انداز سے لگاتے ہیں کہ رات دن کیا، صدیاں ایک پل سے بھی کم معلوم ہوتی ہیں، کائنات کے کیمیائی تغیرات کا حال اس طرح بتلاتے ہیں کہ آدمی کو بھوک اور پیاس کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے، مگر کیا وہ لوگ جو فرش اس دنیا کی بات کرتے ہیں اور آسمان کی طرف دیکھنا بھی غیر ضروری ٹھہراتے ہیں ہمیشہ مفید اور معاملہ کی بات کہتے ہیں؟ اس کا حال آپ کو مختلف ملکوں کی تعلیمی رپورٹوں سے معلوم ہو جائے گا اور جن ملکوں میں تعلیم اور معاشی اغراض کا رشتہ بہت قریبی اور مضبوط کر دیا گیا ہے اور اس کا نتیجہ عام خوشحالی

مسلم حکومتوں میں غیر مسلم وزراء

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

اسلام نے ان تمام غیر مسلموں کو جو نظام اسلامی کے تحت زندگی بسر کرنا قبول کریں "ذمی" قرار دیا تھا یعنی ان کے جان و مال عزت اور مذہب کے بقاء و حفاظت کی پوری ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد کی گئی تھی۔ اس کے معاوضہ میں ان سے ایک حقیر سالانہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ جسے "جزیہ" کہا جاتا تھا کیونکہ یہ حکومت کی مذکورہ خدمات کی "جزاء" یا بدلہ ہوتا تھا۔ یہ رقم کسی صورت میں بھی ۴۸ درہم سالانہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی یعنی ایک روپیہ ماہوار۔

اس حقیر رقم کی ادائیگی کے بعد، ان کو ہر قسم کا اعتماد، اطمینان اور تحفظ حاصل تھا۔ مصر، شام اور اسپین میں عیسائی یہودی اور قبطی، فارس میں مجوسی اور ہندوستان میں ہندو پوری آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی تقریبات مناتے تھے، اپنے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کرتے تھے، اپنی عبادت گاہیں اور مدارس تعمیر کرتے تھے ان کو اپنے ملی و مذہبی معاملات میں نہ صرف پوری آزادی حاصل تھی بلکہ حکمرانوں کی مدد اور سرپرستی بھی۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کا پرسنل لاء محفوظ تھا۔ وہ اپنے مقدمات اپنے ہی حاکم سے فیصل کراتے تھے۔ یہ حکام اپنے ہی مذہب کے حاکم اعلیٰ سے وابستہ ہوتے تھے جس کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس طرح اسلامی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کے تحت ہر اہل ملت کا مخصوص ملی نظام قائم تھا۔

آدم متز نے تصریح کی ہے،

"عہد حکومت عباسیہ میں، دار الخلافہ بغداد میں، خلیفہ کی طرف سے دوسرے اہم ترین عہدے داروں

کی طرح نسطوری اور یعقوبی عیسائیوں کے لئے الگ الگ لاٹ پادری مقرر کئے جاتے تھے، جنہیں جاثلیق کہتے تھے۔ ان دینی رئیسوں کے تحت ان دونوں اہم عیسائی فرقوں کا مذہبی نظام قائم تھا۔

اسی طرح یہودیوں کا مذہبی نظام بھی قائم تھا۔ رئیس یہود کو ملک (بادشاہ) کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ یہودیوں سے اپنے طور پر ٹیکس وصول کرتا تھا جس کا نصف حصہ خود رکھ لیتا تھا اور نصف بیت المال میں بھیج دیتا تھا۔ بغداد کا یہودی حاکم اعلیٰ "راس الجالوت" کہلاتا تھا۔

بلاد فارس میں مجوس کو بھی یہی حقوق دیے گئے تھے۔ ان کے مذہبی سردار کو بھی شاہانہ القاب سے ملقب کیا جاتا تھا اور اس کے اہل مذہب اسے بھی مذہبی ٹیکس ادا کرتے تھے۔[1]

گویا ممالک اسلامیہ میں اسلامی حکومت کے تحت، غیر مسلموں کے مختلف فرقوں کی اپنی اپنی دینی ریاست قائم تھی جس کے تحت وہ اپنے مذہبی احکام کے مطابق اپنی زندگی کا نظام بناتے تھے۔

سلاطین اسلام نے غیر مسلموں کے پرسنل لاء میں مداخلت میں جو احتیاط برتی ہے غیر اسلامی حکومتوں میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مثلاً عام قانون یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مال و جائداد چھوڑ کر مر جائے اور اس کا کوئی شرعی وارث موجود نہ ہو تو وہ مال خزانہ حکومت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی قانون آج بھی تمام متمدن ملکوں میں رائج ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں اسلامی حکومتوں کا طرز عمل دیکھئے۔
اسلامی حکومتوں نے غیر مسلموں کے متروکہ مال کو انکی ملت کے ہی سپرد کرنا ضروری قرار دیا۔

معتضد باللہ عباسی نے اپنے زمانہ میں بغداد کے قاضی یوسف بن یعقوب سے ذمیوں کے متروکہ اموال کے سلسلے میں سوال کیا تو قاضی صاحب کا جواب یہ تھا کہ: ——

---

[1] [redacted] بواسطہ التاریخ الاسلامی السیاسی ج ۳ ص ۱۰۴ -

"رسول اللہؐ کے ارشاد کے مطابق مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وراثت جاری نہیں ہوتی۔
سنت رسول اللہؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر غیر مسلم میت کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کے مال کے وارث اس کے اہل ملت ہی ہوں گے خزانہ عام میں داخل نہ ہوگا"[1]

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ لاوارث مسلمانوں کے متروکہ مال سے تو غیر مسلم ذمی استفادہ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بیت المال میں داخل ہو جاتا تھا۔ اور بیت المال سے فائدہ حاصل کرنے کا حق مسلم اور غیر مسلم سب کو تھا۔ مگر لاوارث غیر مسلموں کا چھوڑا ہوا مال ان کے مخصوص دینی نظام کے تحت صرف ان ہی کے مفاد میں صرف ہوتا تھا۔ مسلمان اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

مسلم حکومتوں میں غیر مسلموں کا عمل دخل کس حد تک تھا؟ آیئے اس پر ایک نظر ڈالیں۔
عہد خلافت راشدہ میں غیر مسلموں کو نظم و نسق حکومت میں دخیل نہیں بنایا گیا۔ حضرت عمرؓ سے ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ حیرہ کے نصرانیوں میں سے ایک غلام ہے جو انشاء پرداز، اور کلام شعراء و ادبا کا حافظ ہے۔ آپ اسے اپنا کاتب (سکریٹری) بنا لیجئے۔"

حضرت عمرؓ نے انکار فرما دیا اور کہا: "اگر میں ایسا کروں تو مومنوں کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ہمراز بنا لوں گا" یہ دراصل تو قرآن کریم کی ایک آیۃ کی طرف اشارہ تھا۔ لیکن یہ اس زمانہ کا واقعہ تھا جب خلافت اسلامی کی بنیادیں اٹھ رہی تھیں اور ایرانی اور رومی اس نو تعمیر عمارت کو گرانے کے لئے ہر قسم کی سازشوں میں مصروف تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ انہی سازشوں کا شکار ہوئے۔
مگر عہد خلافت راشدہ کے بعد جب اسلامی حکومت کو استحکام حاصل ہوا، فاتحین و مفتوحین میں تمدنی و معاشرتی روابط قائم ہوئے، ازدواجی تعلقات نے غیریت کے پردے اٹھا دئے ملک میں امن و اتحاد کی فضا قائم ہو گئی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ غیر مسلم اسلامی حکومت کے نظام سے بے تعلق رہیں؟

---

[1] کتاب الوزراء للصابی ص ۲۴۸۔

اسلامی حکومت میں خلیفہ یا سلطان کے بعد سب سے بڑا منصب "وزیر" کا ہے۔ اس کے بعد کاتب (چیف سکرٹری)، اور والی (گورنر) وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔ عہد عباسی میں یہ سوال بحیثیت فقہی سے فقہاء اسلام کے سامنے آیا کہ "آیا اسلامی حکومت میں غیر مسلم وزارت کے عہدہ پر فائز ہو سکتا ہے یا نہیں؟"

عباسی حکومت میں وزارت کے جو مختلف انداز چل رہے تھے ان کے پیش نظر فقہاء کرام نے وزارت کی دو قسمیں قرار دیں۔ (۱) وزارت تفویض اور (۲) وزارت تنفیذ الماوردی ۴۲۵ھ نے ان کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

وزارت تفویض اور وزارت تنفیذ میں اختیارات کے اعتبار سے فرق یہ ہے کہ:

(۱) وزیر تفویض۔ اپنی رائے سے ملکی معاملات ومقدمات کے فیصلے کر سکتا ہے۔ (۲) والی (گورنر) اور عامل (کلکٹر) وغیرہ اپنے حکم سے مقرر کر سکتا ہے۔ (۳) صلح وجنگ کے مسائل اپنی رائے سے طے کر سکتا ہے (۴) بیت المال میں اپنے اختیار سے تصرف کر سکتا ہے۔

وزیر تنفیذ، کو ان اہم ترین معاملات کو بطور خود سرانجام دینے کا استحقاق نہیں ہے، بلکہ ان معاملات میں وہ جو کچھ کرے گا "سلطان" کے حکم سے کرے گا۔ ان چار معاملات کے علاوہ دیگر سیاسی و ملکی مسائل میں اس کو مکمل اختیارات حاصل ہیں۔

اختیارات کے اس فرق کی وجہ سے، غیر مسلم، غلام، احکام شریعت اور آئین سیاست سے ناواقف، وزیر تفویض نہیں ہو سکتا۔ البتہ وزیر تنفیذ ہو سکتا ہے[۱]

---

[۱] الاحکام السلطانیہ ص ۲۶، لابی الحسن علی بن محمد البصری۔ علامہ ابن خلدون نے بھی اپنے مقدمہ میں وزارت کی ان دونوں قسموں سے بحث کی ہے! وہ آخر عہد عباسی میں وزراء کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض وزراء سلاطین پر غالب آجاتے۔ درحقیقت حکومت کا نظم ونسق ان ہی کے ہاتھوں میں ہوتا۔ یہ وزراء تفویض کہلاتے۔ بعض سلاطین کی ماتحتی میں ان کی رائے سے حکومت کا نظام چلاتے۔ یہ وزراء تنفیذ کہلاتے۔ (دیکھئے مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۲۰۷)۔

بہرحال فقہائے کرام کے سامنے تو یہ بحث مسئلہ کی حیثیت سے بعد میں آئی۔ مگر امراء اسلام نے ان کے فیصلہ کا انتظار نہیں کیا اور نہ فیصلہ کے بعد ان کی مقرر کردہ شروط کا کچھ زیادہ لحاظ کیا بلکہ انھوں نے سیاسی و انتظامی مصالح کے پیش نظر غیر مسلموں کو بے تکلف وزارت اور دوسرے اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنا شروع کر دیا اور جو جوہر قابل نظر آیا اسے تاج حکومت کی زینت بنا لیا۔ اس معاملہ میں تقدم کا فخر حضرت امیر معاویہ کو حاصل ہے۔

امیر معاویہ نے ایک عیسائی کو اپنا چیف سکریٹری مقرر کیا اور ایک دوسرے عیسائی ابن آثال کو حمص کے صوبہ کا فنانشل کمشنر مقرر کیا۔ ایک یہودی ماسرجویہ بھی امیر معاویہ کے دربار میں معزز منصب پر مامور تھا۔

عبدالملک بن مروان کا چیف سکرٹری بھی ایک عیسائی ابن سرجون تھا۔

سلمویہ بن بنان جو عیسائی تھا خلیفہ معتصم باللہ کا مقرب ترین درباری امیر تھا۔ معتصم کا کوئی فرمان اس کے دستخطوں کے بغیر صادر نہ ہوتا تھا۔ سلمویہ جب بیمار ہوا تو معتصم خود اس کی عیادت کے لئے گیا اور اس کی حالت نازک دیکھی تو بے اختیار رونے لگا۔ جب اس کے مرنے کی خبر آئی تو معتصم نے حکم دیا کہ اس کا جنازہ شاہی محل میں لا کر رکھا جائے اور عیسائی مذہب کے مطابق وہیں اس کی نماز جنازہ ادا کی جائے۔ اس نے سلمویہ کے غم میں سارے دن کھانا نہیں کھایا۔

ابن الفرات خلیفہ مقتدر باللہ (۲۹۵ - ۳۲۰) کا وزیر با تدبیر تھا۔ اس نے اپنے عہد وزارت میں ایک عیسائی کو محکمہ فوج کا افسر اعلیٰ بنا دیا۔ علی بن عیسیٰ نے (جو ایک دوسرا با رسوخ امیر تھا اور ابن فرات کے بعد عہدہ وزارت پر فائز ہوا) اس سے شکایت کی کہ "تم نے خدا کا خوف تو کیا ہوتا، لشکر اسلام کا کمانڈر انچیف تم نے ایک نصرانی کو بنا دیا، مجاہدین اسلام اور غازیان دین اس کی دست بوسی کرنے اور اس کے احکام کی اطاعت کرنے پر مجبور رہیں۔

ابن الفرات نے جواب دیا، یہ اقدام سب سے پہلے میں نے ہی تو نہیں کیا پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ الناصرالدین اللہ نے اپنے چیف سکریٹری اسرائیل نصرانی کو لشکر کا سپہ سالار بنایا تھا اور معتضد نے ملک بن الولید نصرانی کو بنایا تھا۔

علامہ عیسیٰ نے کہا۔ انھوں نے بھی اگر ایسا کیا تو اچھا نہ کیا۔ ابن الفرات نے جواب دیا۔ میرے لئے ان دونوں کا طرز عمل اقتدار کے لئے کافی ہے خواہ تمھاری رائے میں وہ غلط ہی ہو۔[1]

عضد الدولہ بویہی (۳۶۷ - ۳۷۲) جو خلیفہ عباسی الطائع کے عہد میں حکومت کے در و بست پر قابض ہو گیا تھا اور مسجدوں میں شاہنشاہ اعظم کے لقب کے ساتھ اس کا نام خطبہ میں لیا جاتا تھا اس نے اپنا وزیر ایک عیسائی نصر بن ہارون کو مقرر کیا تھا اور اسے اجازت دی تھی کہ وہ آزادی کے ساتھ حکومت کے خرچ پر گرجے اور خانقاہیں تعمیر کرائے اور بیت المال کے روپے کو آزادی کے ساتھ اپنی ملت کے عزیا و فقراء پر خرچ کرے۔[2]

مصر کے سلاطین فاطمیین کے دربار میں خصوصیت کے ساتھ نصاریٰ اور یہود کو اقتدار حاصل رہا۔ اس دور کے مشہور ترین وزراء میں یعقوب بن کلس ہے۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ وہ بغداد کا ایک یہودی تھا بڑا ذہین و فطین اور عیار و طرار تھا۔ کافور اخشیدی کے عہد میں مصر میں وارد ہوا۔ کافور نے اس کی ذہانت و فطانت خصوصاً انتظام اراضی کے سلسلہ میں اس کی قابلیت کو بھانپ لیا اور کہا اگر یہ شخص مسلمان ہوتا تو وزارت کے قابل تھا۔ یعقوب تک یہ بات پہنچی تو مسلمان ہو گیا پھر وہ مصر سے فرار ہو کر مغرب پہنچا اور ان یہودیوں کے گروہ میں شامل ہو گیا جو معز الدولہ کے حامی تھے معز نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور پھر وہ اس کے ساتھ ہی مصر آیا۔

معز کے بعد اس کا بیٹا عزیز تخت حکومت پر متمکن ہوا تو یعقوب کا آفتاب اقبال نصف النہار پر پہنچ گیا، بقول ابن خلکان "دنیا اس پر امنڈ آئی، لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کے دروازہ پر آپڑے، اس نے بڑی لیاقت سے آئین حکومت کی تدوین اور نظام ریاست کی تشکیل کی اور اس تدبر سے حکمرانی کی کہ کسی کو مجال سخن نہ رہی۔[3]

---

[1] کتاب الوزراء للصابی ص ۹۵۔ واضح رہے کہ اس روایت کا ناقل "الصابی" خود بھی غیر مسلم ہے۔

[2] ابن الاثیر ص ۲۵۵/۸ [3] ابن خلکان ص ۴۹۱/۲۔

عزیز نے بھی اس پر لطف وکرم کی بارش برسادی۔ گراں مایہ القاب وخطابات سے نوازا اور عطایا وہدایا کے اس کے قدموں میں ڈھیر لگا دئے۔ صرف اس کی سالانہ تنخواہ ایک لاکھ اشرفی تھی، چار ہزار غلام اس کی ڈیوڑھی پر حاضر رہتے تھے۔ منجملہ دیگر ساز وسامان کے اس کے پاس ایک ہیرا تھا جس کی قیمت چار لاکھ اشرفی تھی[1] شعرا مصر نے بھی اس کی مدح میں قصائد کے انبار لگا دئے ممتاز شاعر ابو الرقعمق کے اکثر مدحیہ قصائد اسی کی شان میں ہیں۔ اس کا مشہور قصیدہ۔

کل یوم لہ علی نُوَب الدھر وکر الخطوب بالبذل غارۃ

(وہ ہر روز مصائب وحوادث دہر کے لشکروں پر اپنی جود وکرم کی فوج سے حملہ آور ہوتا ہے) اسی سے متعلق ہے۔

مگر دوستوں کے ساتھ دشمن بھی ہوتے ہی ہیں۔ ایک شاعر حسن بن لبشر الدمشقی اس زمانہ میں ہجو گوئی میں ممتاز تھے۔ وہ یعقوب سے ناراض ہوئے اور اس لطیف انداز میں اس کی ہجو لکھی[2]

(نصرانی بن جاؤ کہ نصرانیت دین حق ہے۔ ۔ ہمارے اس زمانے کا یہی فتویٰ ہے

تین خداؤں کے لئے عزت وجلال کا اقرار کرو ان کے سوا اوروں کو چھوڑ دو کہ وہ بیکار گیا

وزیر یعقوب باپ ہے اور خلیفہ عزیز بیٹا ہے اور فضل (امیر لشکر) روح القدس ہے)

اسی عزیز نے عیسیٰ بن فسطورس نصرانی کو اپنا چیف سکریٹری بنا لیا تھا اور ایک یہودی منشا کو ملک شام میں اپنا نائب السلطنت قرار دیا تھا۔ ان دونوں عظیم المرتبت عہدیداروں کی وجہ سے یہود نصاری کو بڑا اقتدار حاصل ہو گیا اور انھوں نے مسلمانوں کو ذلیل کرنا شروع کر دیا۔ بادشاہ تک

تنصّر فالتنصر دین حق علیہ زماننا ھذا یُدلّ

وقل بثلاثۃ عزوا وجلّوا وعطّل ما سواھم فہو عطل

فیعقوب الوزیر ابٌ وھذا العزیز ابنٌ وروح القدس فضل

[1] ابن خلکان ص۲۴۳ [2] ابن خلکان ص۲۴۳ -

مسلمانوں کی فریاد پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی غیر مسلم امرا سلطنت نے دروازہ روک رکھا تھا۔ آخر اہل مصر نے ایک پرلطف تدبیر کی۔ انھوں نے کاغذ کا ایک پُتلا بنایا اور اسے اس راستہ پر جہاں سے بادشاہ گزرنے والا تھا کھڑا کر دیا۔ اس پتلے کے ہاتھ میں ایک درخواست رکھدی۔ درخواست میں لکھا تھا:

"قسم ہے اس ذات کی جس نے یہود کو منشا کے ذریعہ عزت دی اور نصاریٰ کو عیسیٰ بن نسطورس کے ذریعہ اقتدار عطا کیا اور مسلمانوں کو تیرے ہاتھوں ذلیل کیا، تو میری فریاد سُن !"

تدبیر کامیاب ہوئی۔ بادشاہ عزیز ادھر سے گزرا تو اس نے سواری روک کر پتلے کے ہاتھ میں رکھی ہوئی درخواست لے لی۔ بہت شرمندہ ہوا اور ان دونوں عہدیداروں سے بازپرس کی۔[1]

حاکم بامر اللہ (۳۸۶ - ۴۱۱ھ) نے اپنے عہد حکومت میں عیسیٰ بن نسطورس کو معزول کر دیا تاہم اس کا دربار عیسائی سکرٹریوں اور اس کا محل عیسائی طبیبوں سے بھرا رہا۔ ۳۸۶ھ میں اس نے اپنے استاد برجوان کو اپنا وزیر بنایا۔ پھر ۳۹۰ھ میں حسین بن جوہر کو حسین کا چیف سکرٹری بھی فہد بن ابراہیم نصرانی تھا اور بڑی حد تک حکومت کا نظم ونسق اسی کے ہاتھ میں تھا۔

۴۳۶ھ میں خلیفہ مستنصر نے مصر میں صدقہ بن یوسف کو عہدہ وزارت تفویض کیا۔ یہ نو مسلم یہودی تھا۔ اس کا رفیق کار ابوسعید تستری یہودی تھا اور در اصل امور حکومت یہی سرانجام دیتا تھا۔ ان دونوں نے جب بے جا طور پر اپنے اہل ملت کو نوازا تو کسی دل جلے نے ان الفاظ میں صدائے فریاد بلند کی۔[2]

[1] ابن الاثیر ص ۹/۴۲

یہودی ھذا الزمان قد بلغوا	غایۃ آمالھم وقد ملکوا
العز فیھم والمال عندھم	ومنھم المستشار والملک
یا اھل مصر انی نصحت لکم	تھوّدوا قد تھوّد الفلک

(اس زمانے کے یہودی اپنی آرزوں کی معراج کو پہنچ گئے ہیں اور بادشاہ ہو گئے ہیں عزت ان کے پاس ہے دولت ان کے پاس ہے، ان میں کوئی وزیر ہے اور کوئی بادشاہ اے اہل مصر میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم بھی یہودی ہو جاؤ کیونکہ آسمان یہودی ہو گیا ہے۔)

یہ چند واقعات جو سرسری طور پر نگاہ میں آئے تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے متعلق ہیں اور ان عرب ملکوں سے متعلق ہیں جہاں کی اکثریت حلقہ بگوش اسلام تھی۔ اور صرف منصب وزارت سے متعلق ہیں۔ اسپین ٹرکی اور ہندوستان میں، شاہان اسلام نے اپنے درباروں میں غیر مسلم وزراء و امراء کا جس کشادہ دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا، ان کو وزارت، گورنری اور سپہ سالاری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا، ان سے رشتہ داری کے تعلقات پیدا کر کے من و تو کا فرق مٹا دیا۔ اس کا ذکر طویل فرصت اور وسیع دفتر کا محتاج ہے۔

غیر کا سہارا

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں دوسروں کے کارناموں سے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ ان کی عزت یں اپنی عزت سمجھتے ہیں، ان کی شہرت میں اپنی شہرت تعلقات پر اتراتے ہیں اور احباب پر اکڑتے اپنی زندگی سنوارنے کے بجائے سنوری ہوئی زندگیوں میں اپنے خواب زندگی کی تعبیر دیکھ کر ایسا خوش ہوتے ہیں کہ اپنی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتے لیکن دوسرے کی سج دھج کو اپنی چمک دمک خیال کر لینے سے سچ مچ تو اپنی رونق نہیں بڑھ جاتی۔ ہماری کمزوریاں، ہماری ہی رہتی ہیں تاوقتیکہ ہم خود انھیں دور نہ کریں۔ کسی دوسرے کا حسنِ صحت، ہماری توانائی کا باعث نہیں ہو سکتا، خواہ ہمارا رفیق ہو، یا ہمدرد۔ اسی طرح دوسروں کی سمجھ بوجھ، دوسروں کی ہی رہتی ہے۔ ہماری تعریف سے، وہ ہماری نہیں ہو جاتی۔ ہنر و ہمت، سے کام لے کر لوگ نام پیدا کرتے ہیں۔ ان کے نام کی مالا جپ کر ہم ہنرمند اور ہمت والے نہیں ہو سکتے۔ لیکن محرومی اور ناکامی کا احساس جب شدید ہو جاتا ہے تو کم درطبیعتیں ہمت چھوڑ جاتی ہیں اور ان کے اندر ہاتھ پاؤں مارنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ اس وقت اپنے آپ کو بہلانے کی ایک صورت یہ بھی نکل آتی ہے کہ دوسرے کی ذات سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کے بعد اس کے جمال و کمال کو اپنے لئے وجہ سکون قرار دے دیا جائے۔ اس طرح عمر کے سہاروں پر گذر بسر ہونے لگتی ہے۔

یوں تو دنیا کا کاروبار آپس کے میل ملاپ پر چلتا ہے۔ ہماری زندگی کا دارومدار باہمی تعلق پر ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ خلوص و محبت برتنے سے ہی کام بنتا ہے۔ ایثار اور قربانی اعلیٰ صفات ہیں۔ اور انسان کی ترقی میں تخلیق کے ساتھ ساتھ تقلید کا بھی ہاتھ ہے۔ لیکن آسرے کی زندگی

اور بات ہے جب کوئی اپنی ذات کا انحصار، دوسرے کی صفات پر کر بیٹھتا ہے تو واقعی اس کی اپنی شخصیت اپاہج ہو کر رہ جاتی ہے۔ اب وہ سہارے کا محتاج ہوتا ہے۔ اپنی اپنی کمزوریوں کے مطابق سہارے ڈھونڈے لئے جاتے ہیں۔ زندگی میں جس کمی کا احساس تکلیف دہ ہوتا ہے، اسی کے مطابق ایک مخصوص بہانہ اختیار کرا لیا جاتا ہے تاکہ اپنے اوپر کوئی حرف نہ آئے۔ اپنے اندر یقین و عمل کی کمی رکھنے والے مختلف جتن کرتے ہیں۔ سماج کے سامنے ان کی کوششیں کچھ اس طور نظر آتی ہیں:

۱۔ کوا چلا ہنس کی چال:۔ احساسِ کمتری کا شکار کسی ذات والاصفات کا شیدائی ہو جاتا ہے اس کے قدم پر قدم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو اس معیار تک سے مطابقت دینے میں راحت ملتی ہے۔ یہ جذبہ ہمیں بہت سے اچھے نمونوں کی پیروی کی طرف بھی مائل کرتا ہے۔ ایک بچہ بہت کچھ اسی طرح سیکھتا ہے۔ وہ اپنی لاچاری اور بے بسی کی بنا پر والدین کو غیر معمولی حیثیت کا مالک سمجھتا ہے۔ ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر نہ صرف ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ والدین کے اعمال کو ہی اپنی کارگزاری خیال کر لیتا ہے۔ عموماً بچوں کو اپنے والدین کی حیثیت اور اہمیت پر ناز بھی ہوتا ہے۔ بچے کے لئے یہ بات بیجا نہیں ہے۔ بُری بات تو یہ ہے کہ جوان آدمی بھی بچوں کی طرح دوسروں کا منہ تکنے لگے اور اپنی حقیقت سے بے خبر ہو کر نقالی پر اتر آئے۔ ایسی صورت میں ہنر مند نہیں بنتا بلکہ بہروپیہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر سوانگ اچھا بھی ہو تب بھی زندگی اچھی نہیں ہو پاتی کیونکہ ملمع سازی سے صرف ظاہری مشابہت پیدا ہو سکتی ہے، اصلیت نہیں بدلتی۔ اس طرح کسی نادان کو دھوکے میں تو ڈالا جا سکتا ہے لیکن جوہر ذاتی میں اضافہ ممکن نہیں ہے بلکہ اس مصنوعی زندگی کی بدولت اپنا اصلی روپ بھی خراب ہو کر رہ جاتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جس کا کام اسی کو ساجے، اور کرے تو ڈنڈا باجے۔ اب اگر یہ نوبت نہ بھی آئے تب بھی ہمیں سمجھنا چاہئے کہ قوم کے سینے میں "میں شاہین کا جگر

پیدا ہونے سے رہا۔ اور ٹپکے گا وہی ظرف سے جو ظرف میں ہو گا؟

۲۔ عقیدت کا بخار:۔ اس بخار کی شدت میں اچھے خاصے انسان کے اوسان جلتے رہتے ہیں۔ وہ کسی ذات شریف سے اس قدر مرعوب ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی سدھ ہی نہیں رہتی۔ اس کی نگاہیں اپنے وجود پر نہیں پڑتیں بلکہ خارجی مرکز پر ٹک کر رہ جاتی ہیں۔ کیونکہ اپنی محبوب شخصیت کے قالب میں اُسے اپنی ذات کی خیالی اور مثالی تصویر کا عکس نظر آجاتا ہے وہ، اس کی پرستش سے اپنی روح کی پیاس بجھاتا ہے۔ اپنے 'معیاری کردار' کا ہر عمل اس کے لئے کرامت ہی ہوتا ہے۔ اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی، اس کی کوئی حرکت بے معنی نہیں کہی جا سکتی۔ لہذا اس ذات بابرکات کا ایک ایک فعل اس کی اپنی ذات کے لئے باعث فخر ہوتا ہے۔ اس غیر معمولی شغف اور لگاؤ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اچھا خاصا کام کا آدمی 'ڈھنڈورچی' ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ بس دوسرے کے گن گایا کرتا ہے اور اس میں مگن رہتا ہے۔ جبکہ اس کی اپنی ذات میں گھن لگا ہوتا ہے شخصیت پرستی اور عقیدت مندی کے جذبے میں نیک عمل کی توفیق بھی ممکن ہے۔ بشرطیکہ نمونہ مناسب ہو اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اب اگر "ہے خیال حسن میں، حسن جمال کا سا خیال" تو پھر انجام ظاہر ہے۔ زندگی کا کھوکھلا پن نہ صرف بدستور قائم رہتا ہے بلکہ اگر کچھ جوہر موجود بھی ہوتا ہے تو وہ بھی زنگ آلود ہو کر رہ جاتا ہے۔

۳۔ طلسم خیال:۔ صرف جیتی جاگتی ہستیوں کا دامن ہی نہیں پکڑا جاتا بلکہ ادب کے کردار کا بھی ہاتھ تھاما جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ "غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے"۔ اس لئے ناول یا افسانے پڑھتے وقت ہیرو کے کارہائے نمایاں ہی سے اپنی آرزوؤں کے دیوں میں تیل ڈالا جاتا ہے۔ اور دم بھر کو زندگی کے اندھیرے میں چراغ جل اٹھتے ہیں۔ کسی ڈرامے کے کردار کی جرأت و شجاعت کی ایسی داد دی جاتی ہے کہ اپنے دل سے بزدلی اور کم ہمتی کے داغ دھل جاتے ہیں۔ پردۂ سیمیں پر کسی کو سماج سے بغاوت کرتے ہوئے دیکھ کر کچھ اس طرح خوش ہوتے ہیں جیسے زبان حال سے فرما رہے ہوں کہ "یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ اس طرح زندگی کے اس

"دفتر بے معنی" کو غرقِ مے ناب" کرنے کا موقع نکل آتا ہے، گو وقتی طور پر ہی سہی۔ کچھ ایسی بھی صورتیں ہوا کرتی ہیں جبکہ دوسروں سے اپنی وابستگی کی مدت کافی دراز کرلی جاتی ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی سے اپنی قربت اس قدر سمجھ لی جاتی ہے کہ ان کی ترقی، اپنی ترقی کے مترادف ہوجاتی ہے۔ مثلاً ایک ماں، اپنے ارمانوں کی دنیا، اپنے بچے کے سہارے سے آباد کرتی ہے۔ اور یہ کوئی غیر فطری رویہ بھی نہیں ہے لیکن خرابی تو اس صورت میں واقع ہوتی ہے جبکہ ماں کی جملہ خواہشات کا مظہر، بچہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنی محرومیوں کا بچے کی زندگی سے کفارہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ اُسے یہ فکر دامن گیر ہوجاتی ہے کہ کسی طور جلد از جلد اس کا بچہ، اس کی توقعات پوری کرسکے۔ ایسے ہی والدین اپنی اولاد کے لئے رحمت کے بجائے زحمت کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ ان کی بے بنیاد امیدیں، ایسا معیار بچوں کے سامنے رکھ دیتی ہیں جو ان کی اصل کیفیت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے بچے بھی پریشان ہوتے ہیں اور ماں باپ بھی دکھی۔ بہرحال خیالات کا طلسم، وقتی ہو یا دیرپا، وہ طلسم ہی رہتا ہے۔ اور جب بھی ٹوٹتا ہے، حقیقت کی تلخی کچھ اور گراں ہوجاتی ہے۔

۴۔ تعلقات کی دنیا:۔ بھاری بھرکم آدمی سے ناتا جوڑ کر بھی کچھ لوگ اپنی عافیت کا یقین کر بیٹھتے ہیں۔ انھیں اس خیال سے بڑا سکون ملتا ہے کہ چند قابلِ لحاظ لوگوں سے ان کی شناسائی ہے یا اُن تک رسائی رکھتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو عقلِ مصاحبت سے کام لیتے لیتے اسی کے ہورہتے ہیں۔ مصنوعی زندگی کے اس طور عادی ہوجاتے ہیں کہ ان کا حقیقی کردار دب کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے تعلق کی بنا پر اپنے آپ کو کچھ کچھ سمجھنے لگتے ہیں لیکن دنیا انھیں خوب سمجھتی ہے کہ

"ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا"

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اپنے باحیثیت اعزّا، اور اقربا کے تذکرے سے دوسروں کی شمع خراشی کیا کرتے ہیں۔ اس طرح اپنی شخصیت کا لوہا منوانے کی ٹھان لی جاتی ہے۔ اس مزاجی کیفیت کی مضحک صورت اس وقت اور نمایاں ہوجاتی ہے جبکہ لوگ اس معاملے میں دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ نادار گر قریبی عزیز کے ذکر سے بچتے ہیں مگر مالدار ملاقاتی کا ذکر گھما پھرا کر بار بار ہوتا ہے

رہتا ہے۔ اس طرح سننے والوں پر رعب جمانے کی ترکیب نکال لی جاتی ہے۔ اب یہ سوال تو غیر ضروری سا ہے کہ اس تذکرے سے دوسروں پر کیا اثر ہوتا ہے اور اگر کوئی اثر ہوتا بھی ہے تو اس سے صاحب تذکرہ کو کیا فیض پہنچتا ہے۔ البتہ یہ بات بالکل درست ہے کہ اس تعلق کی بنا پر اس کی اپنی شخصیت میں کوئی چار چاند نہیں لگ جاتے بلکہ اس طرح اپنے آپ کو مغالطے میں ڈال کر کچھ اور خوار ہو جاتا ہے۔ اقبال نے "شیر اور خچر" کے مکالمے میں اس کیفیت کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ شیر نے دریافت کیا:

"کون ہیں تیرے اب وجد؟ کس قبیلے سے ہے تو؟" ذرا خچر کا جواب ملاحظہ فرمائیے:

میرے ملوں کو نہیں پہچانتے شاید حضور۔ وہ صبا رفتار! شاہی اصطبل کی آبرو۔ خچر کا یہ جواب، ایک خاص مزاج و مذاق کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایسی ذہنیت کے بہت سے لوگ شکار ہوتے ہیں۔ انھیں اپنی روش پر کسی غیر معقولیت کا شبہ نہیں ہوتا بلکہ ایسے تعلقات کے اظہار میں انھیں اپنی عظمت دکھائی دیتی ہے اور تقویت محسوس کرتے ہیں لیکن دنیا والوں کی نظر میں ان کی طبیعت کا یہ رنگ، انھیں خچر ہی بنائے رکھتا ہے۔

۵۔ دست نگری:- دوسروں کے نفس سے اپنے اندر حرارت محسوس کرنے والے واقعی بے سہارا ہوتے ہیں۔ بالآخر وہ خود اعتمادی کی دولت سے کلیتاً محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب وہ ذرا بھی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو پاتے اور اپنا سارا بوجھ کسی دوسرے کے سر ڈال کر ہی سانس لے پاتے ہیں۔ گویا ان کے اپنے موٹر میں تیل آتا ہی نہیں۔ اب تو انھیں ڈھکیلا ہی جا سکتا ہے۔ اس طرح بری الذمہ ہونے کی ترکیب نکال لی جاتی ہے۔ کبھی کسی ایک دوست پر تکیہ کر لیا جاتا ہے اور کبھی متعدد احباب پر اپنی ذمہ داری بانٹ دی جاتی ہے۔ مقصد تو صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی کوئی گرفت نہ کی جا سکے۔ اس کیفیت کو ایک ہمدم و ہمدرد پر اعتماد و اعتبار کرنے والی صورت سے امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک مخلص اور صاحب فہم دوست تو خدا کی نعمت ہے۔ آپس کا اصلاح مشورہ، اشتراک اور تعاون، زندگی کی مسافت کو بہت کچھ آسان کر دیتے ہیں۔ خرابی تو اس وقت آتی ہے جب کوئی اپنے ہاتھ پاؤں قطعی چھوڑ دیتا ہے اور آسرے کی زندگی

پر قناعت کر بیٹھتا ہے -

۶- ملامت نفس :- جب کسی طور کام نہیں چلتا، ہر سہارا ٹنکے کا سہارا ہی معلوم ہوتا ہے تو طنز یہ انکساری کو بھی آزما کر دیکھا جاتا ہے - یہ دراصل ایک اجتماعی رویّہ ہوتا ہے جو کسی حد تک سینہ گرہ کے انداز میں اختیار کیا جاتا ہے - زمانے کی ناقدری قابلِ برداشت نہیں رہتی اور اپنی کم مائگی کا احساس کھائے جاتا ہے ایسی صورت میں اپنے آپ کو بُرا بھلا کہہ کر بھی چین حاصل کیا جاتا ہے - اپنے معقول فعل تک پر لاحول پڑھی جاتی ہے اور اپنے آپ کو بے جا حد تک نشانۂ ملامت بنایا جاتا ہے - اس طرح اپنے اوپر برس پڑنے کا مطلب تو یہی ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ دراصل اظہارِ حقیقت نہیں ہے بلکہ زمانے کی نااہلی اور ناقدردانی کی مرثیہ خوانی ہے ہم بہت کچھ ہیں لیکن زمانے کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے - وہ ہمیں نہیں پہچانتا - اس طرح اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ کر اور اپنے آپ کو جلی کٹی سنا کر اپنی دانست میں دنیا سے انتقام لیتے ہیں - ایسے لوگ واقعی قابلِ رحم ہوتے ہیں کیونکہ انھیں دوسروں سے ہمدردی بھی حاصل کرنے کا سلیقہ نہیں آتا - وہ دراصل داد کے طالب ہوتے ہیں لیکن ان کا انداز چڑ والا ہوتا ہے - ذرا ذرا سی ناگواریوں پر بچوں کی طرح مچلتے ہیں - منشا تو یہی ہوتا ہے کہ ان کی ہر خواہش، دوسرے پوری کریں لیکن منہ سے یہی نکلتا رہتا ہے کہ انھیں کوئی ہاتھ نہ لگائے - شاہراہ عام پر کھڑے ہو کر روتے بھی ہیں اور کہتے بھی جاتے ہیں کہ

"روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں "منائے" کیوں"

بہ حال اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے ایسے تمام سہارے آزمائے جاتے ہیں لیکن سب "سہارا" ہی ثابت ہوتے ہیں - "یقینِ محکم" اور "عملِ پیہم" ہی جہادِ زندگانی میں کام آتے ہیں جو دراصل سہارا ہے - اقبال نے سچ کہا ہے :

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار　　شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے
تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی　　رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

نوآبادیات کی آزادی

کے لئے اقوامِ متحدہ میں ہندوستان کی جدوجہد

جناب سید جعفر رضا بلگرامی

۱۹۴۵ء میں سر ونسٹن چرچل نے جیسے ہی اس رائے کا اظہار کیا کہ وہ برطانوی سامراج کے تخریب و انتشار کو گوارہ کرنے کے لئے بادشاہ کے پہلے وزیر ہونے کا شرف حاصل کرنا نہیں چاہتے ویسے ہی رائے دہندگان نے ان کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا۔ ابھی وہ زندہ ہیں اور انھوں نے دیکھا ہے کہ ان کے جانشینوں نے نہ صرف اس انتشار کو گوارا کیا بلکہ اس عمل انتشار و تخریب میں پیش پیش رہے۔ اور ۱۹۶۲ء کے آخر تک یہ صورت ہوئی کہ متحدہ جنوبی افریقہ اور پرتگال کے انگولا اور موزمبیق صوبوں کو چھوڑ کر افریقہ کا کوئی ملک کسی غیر قوم کے زیرِ حکومت نہیں رہا۔ گذشتہ پانچ برسوں میں کوئی ۴۲ مختلف نوآبادیاں جن پر کبھی فرانس یا انگلینڈ کا قبضہ تھا آزاد ہوئیں۔ نوآبادیات میں آزادی کا یہ انقلاب جبر و تشدد کے خلاف رواداری بے انصافی کے خلاف انصاف، احساسِ برتری کے خلاف مساوات، اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے خلاف خوش حالی اور سیاسی قید و بند کے خلاف آزادی حاصل کرنے کی انسانی جد و جہد کا نتیجہ تھا۔

۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ کونسل عالم وجود میں آئی۔ نوآبادیات کی آزادی کے لئے یہ ایک نیک شگون تھا کیونکہ اس کونسل نے کم از کم ایسے تمام ممالک کو جو گمنامی کا شکار ہو چکے تھے اور آزاد انسانی برادری میں اچھوت کا درجہ رکھتے تھے ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کر دیا جہاں ان سب نے متحد ہو کر اپنی آزادی کے لئے کوشش کی اور اپنے احساس کمتری کو دور

کرکے اور حکمراں قوم کے شمالی احساس برتری پر ضرب لگا کر قوموں کے مابین مساوات کی عملی شکل پیش کی

اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ کمیٹی نوآبادیات کے حکمراں اور اتنی ہی تعداد میں غیر حکمراں ممبران پر مشتمل ہے۔ یہ نوآبادیات کی تعلیمی، سماجی اور معاشی ترقی کی ذمہ دار ہے جس کے لئے حکمراں ممبران سے ہر سال رپورٹ طلب کرتی ہے تاکہ ترقی و توسیع کا جائزہ لے سکے اور ان کو ایسے اقدامات سے روک سکے جو ان ممالک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہوں۔ یہ ایک قسم کا وقف بورڈ ہے جو اپنے وقف کی حفاظت اور اس کی بقا کا ضامن ہے۔ اس کے قیام کے بعد حکمراں ممبر کی حیثیت ایک متولی کی سی رہ گئی ہے جو وقف بورڈ میں اپنی کارکردگی کی رپورٹ انتہائی دیانت داری سے پیش کرتا ہے لیکن وقف کو اپنے ذاتی فائدے کے لئے کبھی استعمال نہیں کر سکتا۔ عوام کی دقتوں اور پریشانیوں کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ کمیٹی غیر جانبدار ممبروں پر مشتمل کچھ وفود بھی ان ملکوں میں بھیجتی ہے اور ان کی پیش کردہ رپورٹ کی روشنی میں حکمراں ممبران کو اصلاح کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ عوام کی طرف سے براہِ راست بھیجی ہوئی درخواستوں پر بھی غور و خوض کرتی ہے۔ ان سب اقدامات کا واحد مقصد یہ ہے کہ نوآبادیات تعلیمی، سماجی اور معاشی اعتبار سے اس منزل تک پہنچ جائیں جہاں عام طور سے قوموں میں سیاسی شعور بیدار ہو جاتا ہے تاکہ خود مختار حکومتیں قائم کر کے ان کو آزاد ملکوں کی برادری میں مساوی حیثیت سے شریک کیا جا سکے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی ٹرسٹی شپ کمیٹی کے قیام کے ۷ ماہ بعد ہندوستان آزاد ہوا۔ یہ آزادی تمام ایشیائی اور افریقی نوآبادیات کی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ہندوستان نے ٹرسٹی شپ کمیٹی میں ایک ممبر کی حیثیت سے جو کچھ کہا یا کیا اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیمی میدان میں ہندوستان نے قومی تعلیم کا نظریہ پیش کیا جس میں وہاں کے عوام کی شرکت لازمی قرار دی تاکہ یہ تعلیم ان کی اپنی تہذیب و تمدن کے مطابق ہو سکے ورنہ حکمراں قوم کی مسلط کی ہوئی تعلیم عوام پر گراں گزرتی ہے، ان کے قومی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتی اور ان کا شعور کند اور جامد ہو جاتا ہے۔ تعلیم کا ڈھانچہ کچھ ایسا ہونا چاہئے

جو نہ صرف لکھنا پڑھنا سکھاتا بلکہ روزمرہ زندگی کے طریقے اور اس کے آداب بھی سکھلائے، اگر تعلیم کا مقصد مردوں اور عورتوں کو روزی فراہم کرنا ہے، جمہوری نظام کی بنیادوں کو مضبوط کرنا ہے اور افراد کی تمام ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے تو تعلیم ابتدائی منزل میں حتی الامکان لازمی و مفت، سیکنڈری اور یونیورسٹی میں معیاری اور عورتوں اور سن رسیدہ لوگوں میں مقبول ہونی چاہیئے۔ اگر کسی ملک کو آزادی سے روشناس کرانا ہے تو اس میں تعلیم کا رواج ضروری ہے ایسی تعلیم جو ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو خاص طور پر نسلی تعصب سے ورنہ اس کے اعلیٰ مقاصد ختم ہو جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان نوآبادیات میں ایشیائی افریقی اور یوروپین اسکولوں اور کالجوں کا الگ الگ قیام وہاں کے عوام کی مجموعی ذہنی صلاحیتوں کے لئے بڑا مضر ہے کیونکہ ایسی صورت میں ان نوآبادیات میں سماجی اور اقتصادی نابرابری کا تصور راہ پاجاتا ہے۔ یوروپین اسکول ایشیائی اور افریقی اسکولوں کے مقابلہ میں بہرحال سماجی اور اقتصادی اعتبار سے زیادہ بلند و خوشحال ہیں۔ ہندوستان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کانگو میں جبکہ غیر حکمراں قوم کے بچے پر کرنسی کی ضرب ۲۰۰/۱ اکائیاں خرچ ہوتی تھیں تو حکمراں قوم کے بچے پر ۱۶۶۶۔ اسی طرح بعض جگہ یہ فرق ۱۸/۱ اور ۱۷۰۰/۱ اکائیوں کا تھا۔ ہندوستان نے اس تفریق کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ جب تعلیم معاشی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی ترقی کے لئے ایک لازمی بنیاد قرار پائی ہے تو اس کو نسلی تعصب سے پاک رکھنا بہت ضروری ہے۔

معاشی میدان میں نوآبادیات کے افلاس کا سبب یہ ہے کہ پچھلے دو سو برسوں سے حکمراں قوم نے ان کی خوشحالی کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کے برخلاف ان کی دولت حکمراں ممالک پر صرف ہوتی رہی۔ اور حکمراں ملکوں کو ان کی اقتصادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا کبھی خیال نہ آیا اور نہ انھوں نے صنعت و حرفت کی ترقی اور رسل و رسائل کی سہولتوں کو بہتر کرنے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت سمجھی۔ ان کے نزدیک نوآبادیاں خام پیداوار کے گودام اور بنے ہوئے مال کی کھپت کے لئے اچھے بازار سے زیادہ اور کچھ نہ تھیں۔ ہندوستان نے مشورہ دیا کہ ان تباہ شدہ حالات پر قابو پانے کے لئے وہ سب کچھ کرنا پڑے گا جو پچھلی جنگ عظیم

کے نتیجہ میں تباہ حال یوروپ کے لئے کیا گیا تھا۔ اقتصادی ترقی اور سیاسی آزادی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سیاسی آزادی معاشی ترقی کی خود ضامن ہوتی ہے اس لئے اقتصادی پستی کو آزاد نہ کرنے کا بہانہ نہیں بنایا جا سکتا۔

سماجی میدان میں ہندوستان نے فرقہ وارانہ امتیاز کی بڑی مذمت کی ہے۔ یہ تفریق زندگی کے ہر شعبہ میں پائی جاتی ہے تعلیمی میدان میں افریقی ایشیائی اور یوروپین اسکولوں کے الگ الگ قیام کی شکل میں معاشی میدان میں الگ الگ زراعتی فارم کی صورت میں اور خود سماجی میدان میں الگ ہوٹل۔ الگ جیل خانے الگ ہسپتال۔ الگ پارک اور دیگر تفریح گاہوں کے روپ میں بعض نو آبادیات میں درجہ اول کے بازار یوروپین کے لئے مخصوص کر دئے گئے ہیں جہاں کسی افریقی جانے کی قانونی ممانعت ہے۔ کچھ یوروپین علاقوں میں افریقیوں کو بغیر پرمٹ داخلہ کی اجازت نہیں ملتی۔ اس نسلی تعصب کی انتہا یہ ہے کہ ایک ہی عہدہ کے دو نام ہیں اگر اس پہ کسی یورو کا تقرر ہوا ہے تو اس کو مثال کے طور پر "ایگریکلچرل آفیسر" کہا جائے گا لیکن اگر اسی عہدہ پر کسی افریقی کا تقرر ہوا ہے تو اس کو محض "فیلڈ آفیسر" کہیں گے۔ ایک افریقی مجرم کو مقامی جیل م بند کیا جاتا ہے جبکہ اسی جرم کے یوروپین قیدی سنٹرل جیل بھیج دئے جاتے ہیں۔ کانگو میں وہاں کے شہریوں کی سب سے زیادہ تنخواہ ایک یوروپین کی سب سے کم تنخواہ سے بھی کم تھی۔ وہاں یو ملازمین کی تنخواہ ایک لاکھ سے پانچ لاکھ بلجیس فرینک کے درمیان تھی۔ اس کے علاوہ ۱۲۵ فر بیوی اور ۵۰۰ سے ۱۲۵۰ فرینک تک ہر بچہ کا الاونس مقرر تھا جبکہ کانگولی ملازمین کی تنخواہ ۴ سے ساڑھے ہزار اور کچھ مخصوص حالات میں ۷ ہزار بلجین فرینک کے درمیان تھی۔ اس کے علا صرف ۲۰۰ بلجین فرینک بیوی اور بچوں کو الاونس دیا جاتا تھا۔ رہوڈیشیا میں ان یورو مزدوروں کو جو کانوں کے علاقہ میں باہر کام کرتے تھے۔ ۷۵ پونڈ ماہوار اور اندر کام کرنے و کو ۹۰ پونڈ ماہوار ملتے تھے جبکہ کانوں کے باہر کام کرنے والے افریقی مزدور کو صرف ۳ اور اندر کام کرنے والے کو ۳ پونڈ ۳ شلنگ اور ۳ پنس دیئے جاتے تھے۔ ان تمام امتیازا

جائزہ لیتے ہوئے ہندوستان نے بتایا کہ یہ سب حکمراں قوم کے احساس برتری کا نتیجہ ہے۔ ان امتیازات کی موجودگی اتنی باعث تکلیف نہیں ہے جتنی کہ ان کی قانونی حیثیت بہ لحاظ کہ اصل نوآبادیات کے عوام کے لئے اسا باعث توہین نہیں ہے جتنا کہ ان حکمراں ممالک کے لئے جو تہذیب یافتہ ہوتے ہوئے بھی ان کو قانونی حیثیت سے جائز سمجھتے ہیں۔ نسلی امتیازات انسانی وقار کو اس وقت تک ٹھیس پہنچاتے رہیں گے جب تک ان کو برداشت کیا جاتا رہے گا۔ ہندوستان نے کہا کہ جب تک سیاسی اعتبار سے کسی سوسائٹی کی مختلف نسلوں کو برابری کا درجہ حاصل نہیں ہو جاتا اور اس طرح ان میں ایک قومی تصور پیدا نہیں ہو جاتا اس وقت تک یہ امتیازات ختم نہیں ہو سکتے۔ اس اعتبار سے بھی ان ممالک کو آزاد کرنا لازمی ہے۔

اگر نوآبادیات کی سیاسی ترقی پر سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کی گئیں: تاخیر سے کام لیا گیا اور کہیں کہیں تو جائز مطالبات بغیر کسی فیصلہ کے نظر انداز کر دئے گئے۔ اس رویہ نے انتشار پیدا کیا جس کو حکمراں ممبروں نے سماجی تعلیمی اور معاشی سدھار سے دبانا چاہا۔ چونکہ یہ سدھار عوام کے تہذیب و تمدن، ان کی طبیعت و مزاج اور ذہنی تقاضوں سے مختلف تھے اور ان سے سیاسی مطالبات بھی پورے نہیں ہوتے تھے اس لئے یہ عوام کی نگاہ میں آزادی کو روکنے کا بہانا بن گئے۔ اس سے انتشار میں اور شدت پیدا ہوئی اور انھوں نے فسادات کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس سے سیاسی شعور پیدا ہوا، آزادی کے جدوجہد میں جوش و خروش پیدا ہوا اور قومی محاذ مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا۔

ہندوستان نے نوآبادیات کی تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی حالات پر مندرجہ بالا تنقیدی اور اصلاحی اقدامات کے علاوہ ٹرسٹی شپ کمیٹی اور اس کے نیچے ہوئے مختلف وفدوں میں وقتاً فوقتاً جو خیالات پیش کئے ہیں وہ بھی ان ممالک کی آزادی کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ ان خیالات و نظریات کا خلاصہ یہ ہے:-

۱- اگر نوآبادیات کا انتظام ٹرسٹ کے صحیح جذبہ کے تحت کیا جائے تو حکمراں ممبروں کے لئے

بجائے کسی فائدہ کے زیر باری کا سبب بن جائے۔

۲۔ ٹرسٹی شپ کا معاہدہ حکمراں ممبروں کے یک طرفہ فیصلہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی فیصلہ ہے

۳۔ ان نو آبادیات کے سلسلے میں حکمراں ممبروں کے بجائے جنرل اسمبلی کو کُل اختیارات حاصل ہیں۔

۴۔ حکمراں ممبروں کا قانونی فرض ہے کہ اپنے فائدے کے مقابلے میں نو آبادیات کے فائدہ کو ہمیشہ ترجیح دیں۔

۵۔ سیاسی آزادی بجائے خود کوئی مقصد نہیں بلکہ معاشی خوش حالی، سماجی مساوات اور تعلیمی ترقی کا ایک ذریعہ ہے۔

۶۔ سیاسی آزادی ملنے سے پہلے جمہوری اداروں مثلاً سیاسی پارٹیوں اور اسمبلیوں کا قیام لازمی ہے۔

۷۔ معاشی اور سماجی پستی کو آزاد نہ کرنے کا بہانا نہیں بنایا جاسکتا۔

۸۔ رائے عامہ کے لئے جہالت کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

۹۔ معاشی اور سماجی ترقیاتی پلاننگ کی طرح "سیاسی پلاننگ" بھی نہایت ضروری ہے تاکہ حکومت تبدیل ہوتے وقت لوگ ذہنی اور نفسیاتی طور پر اس کو قبول کرنے کے لئے پہلے ہی سے تیار رہیں۔

ان اصولوں کے سلسلے میں حکمراں ممبروں کا ہندوستان سے سخت اختلاف رہا لیکن ٹرسٹی شپ کمیٹی میں ان کو سند قبولیت حاصل رہی۔ یہ اصول اس کمیٹی میں بطور یادگار محفوظ رہیں گے اور خواہ وہ کسی شکل میں اور کسی زمانہ میں رونما ہوں نو آبادیات کو آزادی کے لئے ابھارتے رہیں گے ٹرسٹی شپ کمیٹی اپنے ان فرائض کو جس تیزی سے پورا کر رہی ہے شاید عالم انسانیت اس کے اس احسان سے سبکدوش نہ ہو سکے۔

تنقید تبصرہ

دیوان عزلت

تبصرہ نگار : جناب قاضی عبدالودود،

دیوان عزلت از سید عبدالولی عزلت سورتی، مرتبہ جناب عبدالرزاق قریشی، سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی۔ قیمت دس روپے۔

(۱) متن دیوان ۲۲۳ صفحوں میں آیا ہے اور مقدمہ ۱۸۲ صفحوں کا ہے، چونکہ دیوان میں ایسے اشعار جو دو سطروں سے کم میں آئے ہوں مقابلۃً بہت کم ہیں، تعداد الفاظ مقدمے میں زیادہ ہو تو عجب نہیں۔ کیمبرج کے ایک معلم انگریزی جو اسلوب بیان پر ایک قابل قدر کتاب کے مصنف ہیں طول بیجا سے کام لینے والوں کے لئے یہ سزا تجویز کرتے ہیں کہ وہ اپنی تحریر ناشر کو بذریعۂ تار اپنے خرچ سے بھیجنے پر مجبور کئے جائیں۔ یہ تو انہونی ہے، لیکن فضول گوئی سے بچنے کی کوئی صورت نکل سکتی تو بہت اچھا ہوتا۔ مقدمۂ مذکور میں غیر ضروری باتوں سے احتراز کیا جاتا تو اس کی ضخامت سو صفحوں سے زیادہ نہ ہوتی۔

(۲) فہرست مآخذ (۱) فہرست میں گارساں دتاسی کی تاریخ شامل ہے، اور اس کے بعض عبارات کا ترجمہ بھی مقدمہ میں ہے۔ قریشی صاحب فرانسیسی سے واقف نہیں، انھوں نے ان عبارات کا کسی سے ترجمہ کرایا ہوگا، اور پوری کتاب ان کی نظر سے نہ گزری ہوگی، لیکن مقدمے کو پڑھنے والے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ اس زبان سے آگاہ ہیں اور انھوں نے یہ کتاب بالاستیعاب دیکھی ہے۔

(۲) فہرست میں تذکرۂ عشقی کے نسخۂ آکسفورڈ کے عکس اور "دو تذکرے" کا ذکر ہے، اور مقدمے کے صفحات ۸۳ و ۲۵۴ میں اس کتاب کے قلمی نسخے کا حوالہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف "دو تذکرے" ان کی نظر سے گزرے ہیں اور یہ تذکرۂ عشقی و تذکرۂ شورش کے نصف اول پر مشتمل ہے۔

حولت کا ترجمہ اس میں نہیں، قریشی صاحب نے عکس سے اس کی نقل منگوائی ہے غلط فہمی اس جگہ بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

(۳) فہرست میں تذکرۂ شورش کا قلمی نسخہ شامل نہیں، لیکن اس کا حوالہ ص ۱۰۰ میں ہے، اس کا حال بجنسہٖ تذکرۂ عشقی کا ہے۔

(۴) تذکرۂ کمال کا نام مجموعۂ انتخاب ہے ص ۲۲۹، صحیح نام مجمع الانتخاب ہے۔

(۵) عیار الشعراء از ذکا مملوکۂ ڈاکٹر مختار الدین احمد ص ۲۲۸ موصوف کے پاس اس کا کوئی قلمی نسخہ نہیں۔

(۶) بعض کتابوں کے حوالے مقدمے میں ہیں لیکن یہ فہرست سے غیر حاضر ہیں، مثلاً تذکرۂ مسرت افزا (مقدمہ ص ۱۰۱)

(۷) غیر معروف کتابوں سے متعلق اتنے معلومات فراہم کرنے چاہئیں کہ ناظرین بطور خود فیصلہ کر سکیں کہ کسی امر خاص میں کس حد تک اس پر اعتماد ہو سکتا ہے، قریشی صاحب اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ حقیقت السورت میں حوالہ مقدمے میں کئی جگہ ہے، لیکن اس کے بارے میں اس سے زیادہ انھوں نے نہیں بتایا کہ اس کے مصنف شیخ بہادر ہیں اور یہ ۱۳۰۵ھ میں بمبئی کے مطبع ثمانی میں چھپی تھی۔

(۳) مقدمے کے کچھ بیانات سے مجھے اختلاف ہے، بعض امور کی طرف قریشی صاحب نے توجہ ہی نہیں کی، یا کی ہے تو محض سرسری طور پر۔ ذیل میں استقصا کی کوشش کے بغیر ایسی باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ گلشن ہند میں شعر ذیل الہام شاگرد عزلت کے نام سے ہے:

اے عندلیب جا کے چمن میں کرے گی کیا یاد خزاں سو سب گل و گلزار جھڑ گئے (ص ۵۵)

گلشن ہند میں اس شاعر کا نام تک نہیں آیا۔ شعر زیر بحث آوارہ کا ہے۔ (تذکرۂ گردیزی)

۲۔ محمد فقیہ درد مند ص ۷۴ و ص ۹۱ درد مند کا مکمل نام محمد فقیہ صاحب ہے۔

۳۔ علی لطف ص ۶۱ لطف کا نام مرزا علی ہے، مرزا نام کا جزو لازم ہے، اس طرح نہیں جیسے

مرزا محمد رفیع سودا کہی ہے۔

(۴) محمد علی کا خطاب علی وردی خاں وہابت جنگ ص ۳۸ چونکہ اور خطاب بھی تھے مہابت جنگ کے بعد وغیرہ لکھنا تھا۔

(۵) "سمجھ میں نہیں آتا کہ علی ابراہیم خاں نے کس بنیاد پر یہ لکھ دیا کہ "با وصف فضیلت اطوار و اخلاق خالی از سبکی و ہرزہ گوئی نبود" ص ۶۰ قریشی صاحب غزل (دیوان ص ۱۳۰) اور واسوخت (ضمیمہ ۲۲) کا ایک (ایک بند) بربنائے 'ابتذال' نکال دیا ہے' اور سب پہیلیاں اسی وجہ سے شامل دیوان نہیں کیں (دیباچہ)۔ حیرت اس پر ہے کہ اس کے باوجود انھیں علی ابراہیم خاں کا قول سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بات بھی عجیب ہے کہ ان کی فارسی عبارت کے لئے انھوں نے لطف کے گلشن ہند کا حوالہ دیا ہے۔ علی ابراہیم خاں جس زمانے میں عزلت مرشد آباد گئے ہیں وہاں موجود تھے اور ان کے بارے میں ان کا بیان یقیناً ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ وہ واقعات کی زیادہ چھان بین نہ کرتے ہوں' اور ان کے عہد کا کوئی دوسرا تذکرہ نگار بھی نہیں کرتا تھا، لیکن' وہ غیر ذمہ دار ہرگز نہ تھے۔ عزلت کا ہزالی کی طرف میلان دیوان مطبوعہ کے اشعار ذیل سے ظاہر ہے، رباعیات ۴، ۵، ۷، ۸۔ اشعار ص ۲۰۸، ۱ ص ۲۱۰، ۲ ص ۱۵۸، ۹ ص ۵۱

جو فرض جانتے نہیں ابن علی کا غم   اب لگ پکڑ رہے ہیں وہ سنت یزیدکی (۱۴۵)

(۶) "شفیق[1] اور حمید اورنگ آبادی عزلت کے ہم عصر تھے اور انھیں بہت قریب سے دیکھا تھا ان کے بیانات کو ابراہیم اور لطف کے بیانات پر ترجیح دی جائے گی" ص ۶۱۔ یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ علی ابراہیم خاں عزلت کے دوران قیام مرشد آباد میں وہیں تھے، ان کے جو تعلقات علی وردی خاں سے تھے، ان کے پیش نظر عزلت کو انھیں قریب سے دیکھنے کے مواقع حاصل تھے لطف نے البتہ عزلت کو کبھی نہ دیکھا ہوگا، لیکن، جیسا کہ خود قریشی صاحب کہتے ہیں، اس کا قول

---

[1] شفیق کو اصطلاحی معنی میں ہم عصر عزلت کہنا درست نہیں، تفاوت عمر بہت تھا۔

علی ابراہیم خاں کے "بیان کی آواز بازگشت" ہے۔ (ص ۶۱) اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قریشی صاحب اسے تسلیم کرتے ہیں کہ عزلت ملامتیہ مشرب رکھتے تھے ص ۴۳ یہ صحیح ہے تو پھر ان سے سنجیدگی کی توقع ہی کیوں ہو۔ علی ابراہیم خاں کو صرف ابراہیم کہنا نامناسب ہے۔

(۷) حمید و شفیق کے جو اقوال جو علی ابراہیم خاں و لطف کے بیانات کے مقابلے میں پیش کیے گئے ہیں علی الترتیب یہ ہیں: "تجنز و اندیشۂ ابتذال اصلاً گرد وپیش او نمیگردد"۔ "در محافل امرا معزز و مکرم اند"۔ ص ۶۱ یہ اقوال اور علی ابراہیم کا جو قول اوپر مقدمے سے نقل ہوا ہے متضاد نہیں۔ قول شفیق میں ابتذال فحش گوئی (ہزل) کے معنی میں (قریشی صاحب کے یہاں یہی معنی ہیں) مستعمل نہیں ہوا، بلکہ اس کا وہ مفہوم ہے جو اس کے معاصر میر و آرزو وغیرہ کے یہاں ہے،

۸۔ عجب دل زلف کے عقرب سے تو کیا | کہ چوٹی ناگنی نیچے پڑی ہے
میرے رونے سے نہ تنہا چاہ ہو گئے آتشیں | یار کے کوچے میں بہتے ہیں کئی نالے پڑے
زاہداں پیر نہ ڈال لال گلال | چاہیے پاس خشوع پر کھ لے

یہ اور کچھ اشعار ص ۱۲۸ میں ایہام کی مثال میں پیش ہوئے ہیں، پہلے اور دوسرے کو اس صفت سے مطلقاً تعلق نہیں (شعر ۲ میں ہو گئے غلط ہے، ہو گئی چاہیے)۔ تیسرے میں ایہام ہے، مگر قریشی صاحب کو اس کے مصرع ۲ میں ابرکھ نہیں اب رکھ لکھنا چاہیے تھا۔ اگر واقعی ابرکھ ہے تو اس میں ایہام نہیں۔

(۹) "واسوخت میں .. اسے (معشوق کو) جلی کٹی بھی سنائی جاتی ہے اور اسے دوسرے معشوق سے دل لگانے کی دھمکی بھی دی جاتی ہے" ص ۱۵۸ عزلت .. کے دیوان میں تو کوئی واسوخت نہیں، لیکن .. بیاض میں ایک واسوخت .. ہے۔ یہ .. واسوخت کے موجودہ طرز یعنی مسدس کی شکل میں نہیں ہے بلکہ ترکیب بند کی شکل میں ہے" ص ۱۵۹، انھیں اعتراف ہے کہ اس نظم میں معشوق کو دھمکی نہیں دی گئی (ص ۱۶۱) یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ پھر انھوں نے

اسے واسوخت کیسے کہا۔ اگر بیاض میں یہ لفظ بطور عنوان درج تھا تو انھیں اس کا صراحۃً ذکر کرنا تھا ــــ یہ صحیح نہیں کہ مسدس کو ترکیب بند نہیں کہتے، مجھے موخرالذکر کی کوئی تعریف ایسی نہیں ملی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ مسدس پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ واضح رہے کہ ایران میں وحشی اس صنف سخن کا موجد ہے اور اس کے یہاں اس قسم کی جو دو نظمیں ہیں ان میں سے ایک مسدس اور دوسری مثمن ہے، اردو میں پہلے پہل مثمن رائج ہوا، چنانچہ آبرو کے واسوخت کے ہر بند میں ۸ مصرعے ہیں۔ ایران میں تو کبھی اس صنف سخن کا کوئی خاص نام ہی نہیں رہا، اردو میں پہلے اس کو سوز و گداز یا محض ترکیب بند کہتے تھے۔

(۱۰) عزلت .. کا مطالعہ وسیع تھا، اساتذہ کا کلام یقیناً .. پیش نظر رہتا .. ہوگا اس کے علاوہ انسانی خیالات میں نیرنگی کے باوجود یکسانی ہوتی ہے اس لئے مضامین میں توارد ہو جاتا ہے" ص ۱۳۱ کلام عزلت سے توارد کی جو مثالیں دی ہیں ان میں یہ اشعار بھی ہیں۔

مقام زندگی سے کوچ کر گئے جلد یار اپنے — وہ منزل پہنچے اور ہم باندھتے رہ گئے ہیں بار اپنے
حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند — تہی پیمانہ ہا کردند و رفتند، حافظ
وہ گلرو کیا مری بلبل اوپر بیداد کرتا ہے — گئے جب بال و پر تب دار کر آزاد کرتا ہے
حسرت آنیست کہ صیاد ما چندانی — در قفس دانست کز راہ چمن از یادم رفت، علی

پیش پا افتادہ مضامین میں توارد اسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ ایک ہوں یا قریب قریب ایک۔ ان اشعار کو توارد کی مثال میں پیش کرنا صحیح نہیں۔ مقام زندگی الخ اور حریفاں الخ میں تو معنوی یکسانی بھی نہیں، حریفاں حافظ نہیں جامی کا شعر ہے، اور اس موقع پر آیا ہے جہاں جامی یہ کہہ رہے ہیں کہ سابقین بہت کچھ کہہ گئے ہیں، اسی سلسلے میں یہ شعر آیا ہے:

ہنوز آں ابر رحمت در فشانست — خم و خمخانہ با مہر و نشانست

(۱۱) قدرت اللہ، شوق دہلی میں کافی عرصہ تک رہے تھے، گمان غالب ہے کہ عزلت

سے ان کی ملاقات ہوئی ہوگی" ص ۳۵، اول تو اس کا ثبوت موجود نہیں کہ شوق دہلی گئے تھے، اور یہ ثابت بھی ہو سکے تو وہ بارہویں صدی ہجری کے عشرۂ ہفتم میں وہاں موجود نہ ہوں گے، اس کے بعد گئے ہوں گے۔ واضح رہے کہ شوق جن کا سال وفات ۱۲۲۴ھ ہے، مصحفی وغیرہ کے ہمعصر ہیں۔

۱۲۔ قریشی صاحب عشقی کا ایک قول نقل کرکے لطف کی عبارت درج کرتے ہیں جس کے متعلق انھوں نے یہ لکھا ہے کہ "غالباً عشقی ہی کے بیان کو صاحب گلشن ہند نے ۔۔ دہرایا ہے" ص ۵۳۔ لطف کا تذکرہ ۱۲۱۵ھ میں لکھا گیا، تذکرۂ عشقی اس کے بہت بعد مکمل ہوا ہے۔" لطف عشقی سے واقف بھی نہ ہوں گے، ان کا تذکرہ دیکھنا تو بڑی بات ہے۔

۱۳۔ موسوی خاں صاحب مشکوٰۃ النبوت نے عزلت کا مذہب امامیہ کا پیرو اور صاحب حقیقت السورت نے انھیں اس مذہب کا مجتہد لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی بنا ان کے والد کے مذہب کے متعلق خافی خاں کا بیان ہو، مگر جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے وہ سنی تھے۔ مشکوٰۃ النبوت میں ہے کہ عزلت کی قبر دائرۂ میر مومن میں ہے، یہ کہنے سے غالباً اس کے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ اس دائرہ میں شیعوں کی قبریں ہیں اس لئے وہاں مدفون ہونا ان کے امامیہ ہونے کا ثبوت ہے لیکن صاحب محبوب الزمن کا قول ہے کہ وہاں سنی بھی دفن ہیں۔ حاکم نے عزلت کو بیلا کے عرس میں دیکھا تھا، امامیہ مذہب والے کو عرس سے واسطہ؟ افضل بیگ قاقشال کا بیان ہے کہ "ملامیتہ مشرب دارد در ریش وبروت تراشیدہ بوضع رندان میباشد" اس مشرب کا آدمی امامیہ مذہب کا پیرو نہیں ہو سکتا۔ دیوان میں اگر اہل سنت کی مدح کے اشعار ہیں، تو "یہ شیعیت کی دلیل نہیں، ایک بیاض میں عزلت کی ایک فارسی رباعی ہے جس سے ان کا سنی ہونا ثابت ہے۔ آخر عمر میں وہ شاہ عبدالشکور گجراتی کے طریقۂ قادریہ میں مرید بھی ہوئے تھے ص ۴۲ تا ۴۴۔ مجھے عزلت کے والد کے مذہب سے بحث نہیں، لیکن جس شاعر کے دیوان میں یہ بیت ملے ہیں اس کو غالی شیعہ سمجھنے میں تامل نہ کروں گا:

ص ۱

جو سو مجھے تو خلیفوں سے ہے روشن کو چۂ جنت ۔۔۔ چراغاں ان سہ کوروں سے ہوا راہ نجات میں

طنزمعرتبکاہے، یہ شعر بھی دیکھیے:

لعن یزید خرستی جو بھونکتے ہیں لوگ — بے شبہ ہیں وہ قوم سگوں میں یزید کی [ص ۱۹]

عزلت کے زمانے میں بعض اکابر علما جو سنی مذہب رکھتے تھے یزید کو برا سمجھنے کے باوجود اس پر لعنت بھیجنے کے روادار نہ تھے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ رویہ مناسب ہے یا نامناسب، کوئی سنی ان لوگوں کے حق میں کسی سنی کے قلم سے ایسا شعر نکل نہیں سکتا۔ اشعار بالا کی روشنی میں اس شعر کو بھی پڑھیے:

عدو تھے مالی اور صیاد گلچیں نے قیامت کی — خدا لعنت کرے تینوں پہ چھوٹا گلستاں ہم سے [ص ۱۹۷]

اب قریشی صاحب کے دلائل پر غور فرمایئے: اگر شیعہ کا ملامتیہ مشرب نہیں ہو سکتا تو قادری کا کب ہو سکتا ہے؟ بیدل کے عرس میں شعر خوانی ہوا کرتی تھی، اور ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک ہوا کرتے تھے ۔ مزید یہ کہ اس قسم کی مجلسیں خود شیعوں کے یہاں بھی ہوا کرتی تھیں، (رجوع باحوال خواجہ باسط)۔ میر حسن باوجود شیعۂ غالی ہونے کے مجالس فقرا میں شریک ہوا کرتے تھے ۔ یہ خیال غلط ہے کہ اس زمانے میں مذہب امامیہ کے پیرووں میں پیری مریدی کا سلسلہ جاری نہ تھا۔ خواجہ جعفر خود شیعہ تھے، لیکن وہ سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید تھے ۔ تذکرۂ طاہر آبادی سے جس کی تکمیل غالباً بارھویں صدی کے اوائل میں ہوئی ہے ایران میں اس کا مروج ہونا ثابت ہے۔ شاد عظیم آبادی نے شیعوں کے تصوف کی نسبت حیات فریاد میں جو کچھ لکھا ہے، اس پر نظر ڈالی جائے — دائرۂ میر مومن میں سنی بہت کم مدفون ہیں۔ عزلت کی قبر کا وہاں ہونا قطعی ثبوت نہ سہی لیکن شیعہ ہونے کے اگر اور ثبوت موجود ہوں تو انھیں تقویت دیتا ہے۔ رباعی جو بیاض میں ہے، دیوان فارسی میں ہے یا نہیں، اس کے بارے میں قریشی صاحب ساکت ہیں، جس بیاض سے انھوں نے یہ رباعی لی ہے وہ چنداں معتبر بھی نہیں، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اس میں عشق کا ایک شعر عزلت سے منسوب کر دیا گیا ہے

---

[۱] کہ بھونکنا چاہیے۔

اگر یہ دیوان میں نہیں تو پھر اس کا قرینہ زیادہ ہے کہ کسی اور کی ہے کہ کسی اور دیوان میں ملے تو میں یہ سمجھوں گا کہ کسی وقت مصلحتاً کہی گئی تھی۔ شاہ عبدالشکور کا مرید ہونا شیعیت کے منافی نہیں، مزید یہ کہ اس کی بنیاد صاحب محبوب الزمن کا قول ہے جو زمانۂ حال کے مصنف ہیں۔ مقدمے کے ص ۱۷ میں ایک عربی عبارت درج ہے جو اس پر مشعر ہے کہ عزلت کے والد سید عبدالشکور کے مرید تھے اگر یہ وہی ہیں جو عزلت کے پیر بتائے گئے ہیں، تو ان کا عزلت کے آخری زمانے میں زندہ ہونا قرین قیاس نہیں۔ قریشی صاحب کو ان کے بارے میں صراحت سے کام لینا تھا کہ کون ہیں اور ان کا سال وفات کیا ہے۔

۱۴۔ ص ۳۶ میں تین شعر ایک بیاض سے ماخوذ ہیں جن کا تعلق نظام الملک سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ان میں نظام الملک کا نام نہیں، اگر بیاض میں بطور عنوان یا کسی اور طرح یہ درج تھا کہ ان کا سروکار نظام الملک سے ہے تو صراحتاً اس کا ذکر کرنا تھا۔

۱۵۔ "صنائع وبدائع کو شعروشاعری میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے" ص ۱۲۴۔ اگر صنائع و بدائع ایک دوسرے سے مختلف نہیں تو ان میں سے ایک حشو ہے، اگر مختلف ہیں تو بدائع سے لفظی تکلفات (مثلاً صنعت منقوطہ وصنعت مہملہ) مراد ہوں گے۔ قریشی نے یہ بات کہاں دیکھی کہ بدائع کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔

۱۶۔ "عزلت کے یہاں بہت سے الفاظ جو اب مؤنث مستعمل ہیں مذکر ملتے ہیں، اور اس کے برعکس بھی۔ عزلت نے قربانی، جنگ، دنیا، چشمک وغیرہ کو مذکر اور جوہر، سفر وغیرہ کو مؤنث استعمال کیا ہے۔ مندرجہ بالا تقریباً تمام الفاظ میر کے زمانے تک اسی طرح استعمال ہوتے تھے۔" ص ۱۴۲۔ قریشی صاحب کو بتانا تھا کہ یہ الفاظ دیوان کے کن صفحوں میں ملتے ہیں، مگر انھیں اس کی ضرورت کا احساس نہیں ہوا۔ انھیں یہ بھی چاہیے تھا کہ "وغیرہ" پر نہ ٹالتے اور ایسے الفاظ کی مکمل فہرست پیش کرتے۔ ان کا یہ قول کہ یہ الفاظ تقریباً سب میر کے زمانے تک اسی طرح مستعمل تھے جس طرح عزلت کے دیوان میں ملتے ہیں، صحیح نہیں، جنگ کے

سوا جو مذکر و مؤنث دونوں آیا ہے۔ میر یا ان کے معاصرین (دکن سے بحث نہیں) کے یہاں کل الفاظ اسی طرح برتے گئے ہیں جس طرح آج کل زبانوں پر ہیں۔ واضح رہے کہ قریشی صاحب کے دیئے ہوئے الفاظ میں سے کچھ دیوان میں دو طرح مستعمل ہیں، مثلاً جوہر کہ مذکر بھی آیا ہے ص ۱۰۵۔ قربانی جو مذکر آیا ہے وہ اس حیوان (بشمول انسان) کے بارے میں ہے جو قربان ہوا ہو، "رخ قاتل یہ ہے آخر نگاہ چشم قربانی" ص ۱۱۰) اس مصرع میں جنس کی بحث نہیں) اس صورت میں مذکر نہیں مستعمل ہونا چاہیئے۔

۱۷۔ قریشی صاحب مسطر کشیدہ، دوشالہ، مادرزاد اور ڈھول کو "غیر فصیح بلکہ ثقیل اور بوجھل" سمجھتے ہیں جن سے "غزل کی لطافت "مجروح" ہو جاتی ہے۔ ص ۱۲۵، لیکن ڈھوری لگن" کی لطافت کے وہ قائل ہیں ص ۱۴۱ — میرا خیال ہے کہ ان کے ناپسندیدہ الفاظ ہر زمانے میں فصیح سمجھے گئے ہیں، اور "ڈھوری لگن" شمالی ہند کے شعرا نے تو کبھی استعمال ہی نہیں کیا، میں خود شعر کہتا تو بھولے سے بھی اسے نہ برتتا۔

۱۸۔ عزلت قادری سلسلے میں مرید تھے اور اس مناسبت سے وحدت وجود کے قائل" ص ۴۴۔ ثبوت میں جو اشعار دیئے ہیں وہ بالکل اس پر مشعر نہیں کہ عزلت وحدت وجود کے قائل تھے۔ نہ معلوم یہ بات قریشی صاحب نے کہاں دیکھی کہ سلسلۂ قادریہ کے صوفیہ وحدت وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔

۱۹۔ مقدمے میں شفیق کا قول نقل ہوا ہے کہ عزلت کا کلیات فارسی ۱۴ ہزار ابیات پر مشتمل تھا، ص ۴۶ و ص ۹۳ اس کے ایک انتخاب کا ذکر کرتے ہیں اور ایک نسخے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کی نسبت انھیں علم نہیں کہ کلیات ہے یا اس کا انتخاب۔ پہلے کے متعلق بعض تفاصیل مقدمے میں ہیں، لیکن وہ صراحتہً یہ نہیں کہتے کہ میری نظر سے گزرا ہے، دوسرے کے بارے میں وہ مقر ہیں کہ میں نے اسے نہیں دیکھا۔ ان کا کام جس نوع کا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ بات حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے کلیات فارسی

مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ۲۴ فارسی شعر نقل کئے ہیں لیکن یہ بتلانے کی ضرورت محسوس نہیں کہ کہاں سے ماخوذ ہیں۔ (ص ۹۴ +)۔ شفیق نے گل رعنا کے اردو سخن کے بعد فارسی اشعار کا انتخاب کیا ہے، یہ اشعار افسوس ہے کہ قریشی صاحب نے نقل نہیں کئے۔

۲۰۔ قریشی صاحب نے مقدمے میں بعض اشعار پر عزلت کے اعتراض درج مقدمے کئے ہیں۔ ص ۵۱ + ۔ مجمع النفائس کے ایک نسخے کے حاشی (نسخۂ خدا بخش) میں جا بجا عزلت کی تحریریں ہیں۔ (یا اس وقت میں نہیں کہہ سکتا کہ نسخۂ مذکور میں یہ عبارتیں خود ان کے قلم کی ہیں یا کاتب نے کسی اور نسخے سے لے کر نقل کر دی ہیں)۔ انھوں نے ملا علی جاوید کے شعر

"یا در رخ تو در دل اندوہگیں ما چوں تیر غمزۂ تو بود دلنشین ما"

میں رخ کی جگہ قد تجویز کیا ہے۔ ممکن ہے ان حاشیوں میں اس قسم کی اور اصطلاحیں بھی ملیں۔

۲۱۔ ایک جگہ عزلت نے لکھا ہے کہ میں روز عرس بیدل ان کے مزار پر پہنچا کل شعرائے دہلی کا مجمع تھا۔ کلیات بیدل (قریب صد ہزار ابیات) حسب معمول نکالا گیا۔ میرے دل میں آیا کہ میں ان کے مزار پر آیا ہوں اور انھیں خبر نہیں۔ اس کے بعد کلیات بطور تفاول کھولا تو داہنی طرف کے صفحے کا پہلا شعر یہ نکلا، سب نے دیکھا:

چہ مقدار خوں در عدم خوردہ باشم   کہ بر خاکم آئی و من مردہ باشم

۲۲۔ مقدمے قوافی کی بحث تشنہ ہے۔ قریشی صاحب کہتے ہیں کہ چند اشعار میں را اور ڑ کا قافیہ آیا ہے، لیکن س وض کا قافیہ نہیں۔ ص ۱۳۷۔ یہ صحیح ہے لیکن عزلت کے یہاں تلک الگ وجگ وغیرہ کا قافیہ آیا ہے ص ۲۰۱، قوا کی ایک مثال ملتی ہے: بندوا قافیۂ گاؤ وغیرہ۔ ص ۳۱۔ ایطائے جلی کی متعدد مثالیں موجود ہیں، از آں جملہ ص ۶۱ میں دلبراں قافیۂ بتاں۔

۲۳۔ ص ۴۷ میں مصرع تجرد خورشید کیا ہے اس کی فلک کو خبر نہیں، کی کی جگہ کے ہونا چاہیئے۔ یہاں کسی کے فلک کو خبر نہیں بطور محاورہ مستعمل ہوا ہے۔

۲۳۔ قریشی صاحب نے متروکات مستعملۂ غزلت کی بحث میں صرف ۶ لفظ دئے ہیں جن ۱۳۸ سطروں میں خاص خاص فارسی ترکیبیں جن سے کلام میں شگفتگی و رعنائی پیدا ہوگئی ہے" جمع کی ہیں ص ۱۳۸ و ص ۱۳۹، اور ص ۱۴۲ میں "خالص ہندوستانی" الفاظ (۱۳) دئے ہیں، مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کون سا لفظ کس صفحے میں ہے۔ ذیل میں مختلف قسم کے مفردات و مرکبات جو مرتب کی فہرستوں اور فرہنگ" سے غیر حاضر ہیں پیش کئے جاتے ہیں :

رشیل ۱۶۳ یہ خسرو کی نثر فارسی میں ملتا ہے، گل ناری ۱۶۶، ششش و پنج حساب ۱۶۴ بیبی ۶۴، شبستان ۵۳، کج دار و مریز ۵۶، برنر برنز کرنا، دید او ردادید، لکانیاں (جمع لکانی) ۸۴، آماده ۸۰، نو طرحی عشق سخنگو ۸۷، رنگیلا (با علان نون) ۲۱۹ (دوسرے مقامات میں نون غنہ کے ساتھ)، بدروشی ۹۲، دھو ۱۰۰، ایمانیاں ۱۰۹، سکرات ۱۱۴، دنگ (کذا) ودوال ۱۲۶، وسعت مشربی (۱۳، ہوئے مستوں پہ گر تیغ زباں زن شیخ خیخی میں جو اپنے نفس پرور ہوتے مردانے (قافیہ) ہوئے ہوتے، ۱۳۲، گپ مارنا ۱۳۸، رفو کار ۱۴۰، مدخولہ ہے مادی ۱۴۳، ھگوے پوش ۱۴۵، کچکول ۱۴۸، نوید وصل تو دے ہے کہ شادی (کذا) مرگ ہوں ۱۵۲، دردا فری، نکتہ وری ۱۵۳، چقماق کسی پر جھاڑنا ۱۵۶، درزن ۱۵۸، لباسی ۱۶۳) گھولے (زیادہ تر اسی طرح، ایک آدھ جگہ بگولا) سا عجائب مہر قماش زخت فقر اپنا کالقا بر میں خاک دشت و سر پھرنے کی طاقی ہے (کذا)، بوسۂ چسپاں ۱۶۹، جواب خنک بُزدولی ۱۷۵، گل کمدن ۱۷۸، خنکخانہ ۱۸۲، طیشی پردانگی دنیا ۲۰۴، ہم تول (قافیہ ڈالواں ڈول) ۲۰۵، مچلکے (۲۱۱)، خماں، چمن رُو ۲۱۲، گرم الفتی ۲۱۳، زنانی وضع ۲۱۴، خوشگاہ، نہری ۲۱۵، چیز (ہیز) ۱۷۶، قابوچی ۱۷۷، پوچی، کندے ناتراشیدے (کذا) ۱۳۱ صندلی برن ۱۳۵، ضعیف نالی، انست ۳۹، خزہ پوشی ۵۷، مشکل آسان (مشکل آسان کرنے والا) ۶۳، نرمی ۹۱، بے صبر و تسکینی ۱۴۴، زہر خندی ۱۴۷، ہندو و مسلمین ۳۸، فرشتی حقہ ۶، خدا جانے (مقابل کافر) ۹، دستخطی احباب ۱۳، میری ۱۶، خاموش صفیری، ہولی یا ۲۳

بو کرنا ۲۸، قینچی ۳۰، قیدستان ۲۶، حیلہ و دستاں، بلبلستان ۴۷، فریاد کش ۹، مغز بجا نہ تھا،
دیوان قضا کی پیش کاری ۱۳، طوف کرنا ۱۴، خونیں نمن ۱۵، صاف ضمیری ۱۶، چشمزاد ۱۹، مرنا
منش، امام حلقہ تسبیح ۳۴، یادزن ۳۹، وحیدی ۳۰، فسرنا ۴۴، کون فروشی ۵۱، روشن
طبع ۵۰، دل وحشت پناہ ۲۵، زنجیرخانہ ۵۳، خطوط کہکب، کفنی ۴۷، چشم پوشی ۴۵،
زلستین ۱۲۳، جورو کریا، سوختن ۱۲، کج اقرار ۱۲۰، کینت ۱۱۴، دو دل ۱۱۳، ترو الا ۱۵،
جھکڑ ۱۴۳، لپٹا لپٹی ۱۷، اکیٹی، جپی، نکٹی، مانگتاں، گریا تو تو دیو (کذا)، یا رنہیں تو تیر ۱۶،
پھوٹ پھوٹ کراس کو نمک نکلا ۱۴، منڈلار ہوں گا ۱۷، بیارا (بروزن دارا = جدا) ۱۸،
مجھ کو گرد نی مارا، تیجا ۲۰، کھل جانا، کوسلا (بروزن مرحبا) ۲۱، انگارے (بروزن نگار
چا ۲۲، ڈھیرا ۲۳، اندھیاری، گلالی، بھاگ جگانا ۲۶، گنا نا ۲۷، سایخ گرعشق کا
تھا صورت شیر بپ پر بھی (کذا)، پے (پہ)، کہا نا، رسولی ۳۱، ہٹ کھنڈا (بروزن درہنگا
پڑا ۳۲، جرنا، حقہ گڑگڑانا، ڈھیر ہیں (کثرت سے ہیں) ۵۰، نکتوڑ ۵۴، ادھورا،
ڈھل پڑنا ۵۶، نکتوڑ ۶۲، کڑوی گالیاں، سیر لوں کا گل کی ہے جیلا دمالی الحفیظ اکذا
۶۴، بنیدھنا (کذا)، جیونا ۶۶، دھندلا، جھاڑ (درخت) ۶۹، ٹیسو کے بندرابن ۷۱،
پان کی بیڑی ۷۲، بھنبھیری، دھمال (بروزن خراب) ۷۳، بھگوی (صفت کفنی) ۷۴، نا
جیتا ۷۶، نین تیرہ ہونا ۷۷، بھنور (بھنورا) ۸۳، ڈول ۸۶، ڈو لیگا ریل میں کنعاں سے
یے تا مصر تام ۹۲، اگن ۱۰۳، پیا پردیس سے مجھ گھر کو دھائے، اک پل میں نین درادے
۹۵، نچاونا، بلا ونا جلاونا ساچار ۹۶، اکریج (کھریچ)، ۲۰۱، بگ بارہ باٹ ۲۲، سات اد
پانچ، عولت کن (عولت کے یہاں) ۲۱۱، کھچڑا ۱۰۰، بادل دھائے ۱۷۹، خوشی سے بنیگتی
کر کلیے، جھلانا؛ سا دن کال پھنکاٹے من کہ ڈسنے کو یہ ناگن، بیٹ تولی دسہرے سے
گہری کر ماری من کی شیشی (شیشے ؟) پر دسہری ۱۸۰، تیل کنھڑ، چھیلا، کنھڑ، دھن کی طرح
بھر بھر سانس ہانپوں، سینا چاہنہ ۱۸۱، ناریاں، جنوں نے آگ کیا دل میں دھکائی ۱۸۱،

بہیں وہی اٹھے ہے جھاڑ جبرتی، گلیا نہر، تھا تک آسودہ نظر نیند میں تو ہو کر ٢٠٤، اگن ١٨٢،
پیا پردیس سے مجھ گھر کو دھائے، من ہرن ٢٠٥، دل ہاری ٢٠٨، پاٹ بھرنا ٢١، دیدڑا،
درد پیڑا، اعزاز دمان ٢١١، عزلت کن (عزلت کے یہاں)، اس خنک مہر گرم الفت
پیاؤ مت ٢١٨، ہو ہجر کی رات سنسناتی ناگن سے پھنکار کیونکر جاوے ١١٢،
١١٣، سبھی میں حق ہے پر عارف میں کیا سیوا (کذا) جھمکا ہے، پکا، دل بیراگی عزلت میں رکھتا
ہے دم، ہستی کر میں اس میاں کے (کی چاہیئے) جیسے بیلی کا متکلا ہے کہ بان تو ایک سوانگی للکھ
یہیوں میں منشا ملتا ہے (کذا) ١١٤، ٹھیگوا ١٩٩، ننگا سیلے (کذا) میں لے عزلت تو جیتا ہوں
اپنی چھاتی کو ١٢٣، نیلا پیلا ہونا ١٣٦، شعلے جھال والے، بگولے سارے میں، اٹکل کہنا ١٣٤،
کڑ ١٣٧، کارواں ہانکنا ١٣٧، ڈیرا ١٣٨، باولا، چلنہار ١٤٠، جیلا دل عاشقوں کا
گل رخوں کے بوٹوں میں ہے (کذا) ١٤٥، ڈھلینڈی مچانا ١٥٠، ٹھینکی ١٥١، نجینتا ١٥٢،
سنگھات (باعلان نون) ١٥٧، تاگا سوئی ١٥٨، ناکے کی درزن، تجھ کو کیوں جھل جھل
چلایئے سگے ناصح ترا کیا لگتا ہے ١٦٤ چیری ١٦٦ ڈھول ١٦٧، گھائل (بر وزن
قاتل)، جوڑنا چالی ١٧٦، برہن ١٧٥، تو رکھ ہر پی کو کامن سات دن رین ١٧٩، بارہ ماسا
بیچ میں چھپیں کا نام نہیں ٩٤، البیلا ٹنا ١٠٥، پہراتا ١١٢، ان سنی ٨٦، دودھارا خنجر ١١٠،
گت ناچنا ٤٩، جوتڑے، بنا (نفی) ٥٠، تاگا ٥١، بھلے ٣٧، کان پکڑنا ٦٢، لجانا ٦٣
ہتھیلی کا پھپولا ١٤٥، سیندور ١٦٤، بجن بکنا ١٨٢، (یہ بحث نامکمل رہ گئی، کبھی اور اس
کا تکملہ لکھا جائے گا)۔

٢٥- ذ = مذکر، ث = مؤنث، دار ذ ٤، ندی کا پور، چنور ذ ٥، نرمیں ٦،
صندل ذ فلیل ث، رقم ہے صاد کا ٧، ریت ث، کیک ذ ١٦، خارستان وتجھڑ ذ ١٧،
رنگ زرد اور سرشک سرخ تو دیکھ کیا خزاں میں بہار ہے میرا ١٩، سرد مہری کا نیول
کے جب پڑا سر ملئے سرد چشم پوشی دل پہ عزلت کے دوشالہ ہو گیا ٢٤، کروں کیا ہے یہی

چاک گریباں دستگاہ اپنا ۲۵، دن پڑے اب جوں شب قدر آرزو کرنا پڑا ۳۸، آنب (آم) ۳۴، لسنت ث ۳۸، میری مراد نہ دی ۵۸، تلاش ذ، یہ شوخیوں سے کرے (کریا) ہیں وہ چشم گلگوں رقص ۶۰، گھونٹ ۶۲، بہار آئی ۸۹، آنکھ بھیرا ی ۱۳۸، منہ پہ زلفیں تھی بکھرا ئے جھنکار ت ۸۴، زہ دامن ث ۱۰۶، گلیا نگیں ۱۰۸، رمز ۱۰۹، یُن ذ، ٹھیس ت ۱۲۰، لگن لگی ہے۔

۲۶۔ مقدمے میں عروض کی بحث مطلقاً نہیں، حالانکہ دیوان کے متعدد اوزان توجہ طلب ہیں اور یہ بات بھی قابل ذکر تھی کہ ان کے یہاں حروف بہت دبتے ہیں۔ اشعار ذیل کو دیکھیے :

(۱) اس کے ہجر کی تیغ کے زخمی کو اے خضر اب نہ دعا کر وجیتا نہیں
لب پہ جب جان آچکا جاؤ تو جاؤ رہے تو رہو جو ہوا سو ہوا جو ہوا سو ہوا

(۲) میں شاہ اقلیم صحرا ہوں شیروں کے نعرے نقیبوں کے شوروں کے مانند
فوج غزالاں ہے میرے جلو میں نکھوے ہیں فیلوں کے توروں کے مانند

(۳) گریباں پھٹ گیا خفا ہونے لگا دل بات کھجائے بس کیا کروں میں
سوا چاک قبا کے علاج نہیں عزلت دو جا جنوں کے خیال اوپر

(۴) مری گرم نگاہی سے وہ عرق افشاں پیا پے ہووے ہے حیا کی قسم
مری مژگاں کا سایہ حسن پیرہن ہے وہ بت کو خبا بخدا کی قسم

۲۷۔ مقدمے میں اس کا ذکر نہیں کہ عزلت نے سودا (ص ۵۱) اور فغاں (ص ۳۰ کے ایک ایک مصرع کی تضمین کی ہے۔

متن دیوان ۳ نسخوں پر مبنی ہے، اغلاط جن کی ظاہرا مرتب کو خبر نہیں موجود ہیں، ذیل میں ان کی نامکمل فہرست دی جاتی ہے :

(۱) میرے نزع کو نہ اوسے کہو ہوا سو ہوا ص ۲۵ = مری نزع کو نہ اس سے الخ۔

(۲) باد چلی ہے لسنت کی ص ۱۵۲، باد کی جگہ باؤ ہوگا۔

(۳) کوئی ص ۱۷۳ = کون

(۴) اس تحسر (خ س ر) کا کئی روز میں انسان بنے گا ص ۱۳، ناموزوں، خسر کی جگہ خرچاہیے

(۵) جیسے ساون میں ہو کانٹے یہ پھیری کا مزا ص ۱۹ گل کا ہر برگ ہے ساون کی پھیری۔
بلبل ص ۷۲ دونوں مصرعوں میں قافیہ بھنبھیری ہے۔

(۶) ہمارا مطلب دل کو تری بلا پوچھے ص ۱۲۱ لفظ اول 'ہمارے' ہوگا۔

(۷) حضرت دل مدظلہ مرشد و اوستاد ہے ص ۴ اوستاد بروزن نوشباد ہے، اس طرح پڑھا جائے تو مصرع ناموزوں ہے، عجلت سے استاد لکھا ہوگا۔

(۸) تیرے لقا ص ۱۲۹ = تری لقا۔

(۹) نگیں کے طرز ص کی چاہیے۔

(۱۰) ہو رہو کتنی دن اوروں کے گلے کا ہار تم ص ۷۸، کتنی کیا بلا ہے؟ کتنے ہوگا۔

(۱۱) ص ۱۲۲ میں مخطط (ہردوظ) آیا ہے، یہ مخطط کی خرابی ہے۔

(۱۲) معنی باریک عجلت کہنے میں آتے نہیں ٹوٹے تھے مضمون نازک ہٹیں سے تقریر کی۔
ص ۱۲۰ ہٹے کی جگہ ہے درکار ہے۔

(۱۳) دیکھو سفیانوں نے یا بی کیا ہاتھ اٹھایا ہے ص ۱۶۵ ناموزوں سفیانوں کے عوض سفیانیوں چاہیئے۔

(۱۴) نہ پوچھو اس کی کیفیت آنکھ کو سرے نے گھیری ہے ص ۱۶۶ بوجھو = پوچھو (۱۵) بلا (دل) ہوا اب ہم سے گیا بادشہ بخیر ص ۴۹ ناموزوں، اس سے قطع نظر، پہلا لفظ دبلاؤں ہوگا۔

(۱۶) اسے عجلت ایکے برس فصل برشگالی سے ص ۱۳۶ برشگالی = برشگانی۔

(۱۷) بے ستوں ص ۱۲۵ = بیستوں۔ اور جگہ بھی بے ستوں۔

(۱۸) یار م اس بزم سے یہ زہر کا نکر (قافیۂ شعر سابق پکڑ) جلسے ص ۱۲۷، نکر = نکڑ۔

(۱۹) چمن سب بن گیا میخانہ اور دوکاں کیا بی (کیا اور بی الگ الگ) کے ص ۱۴۵۔ آخری الفاظ دوکاں کبابی کی' ہیں۔

(۲۰) ڈھلندری بجھن کے دن وہ پیروا جیا تلے ہے ص ۱۵۰' ابتدائی الفاظ ڈھلینڈی بجی

(۲۱) سنجاف (س ن ج ا ف) سرخ بہت سجھے کوئی گرد اس کے داماں کے" ص ۱۳۴' سنجاف بروزن نقاب ایک جگہ اور ۔ صحیح لفظ سجاف بروزن تولنا ہے' اور دونوں جگہ یہی چاہیے ۔ سنجاف بروزن کحاب اردو والوں کا تصرف ہے' اس کی یہاں گنجائش نہیں۔

(۲۲) خصم جو مقراض گلچیں ہیں تیرے اے سرو قد ص ۱۴۷ جو = جوں' تیرے = ترے۔

(۲۳) جس بحر میں یہ پڑتے ہیں باٹ اور ہے ص ۱۵۱ پڑتے = پیرتے ، باٹ = پاٹ ؟

(۲۴) اوس کی جولاں کی ہوا سے گئی ہے برباد (اور) اوس پر ص ۵۹ اور اضافہ' مرتب' لیکن مصرع یہ بموجب بھی ناموزوں اور بموجب بھی۔

(۲۵) جہاں تمھیں کہوے یار عزلت تمھارے دل میں بسے ہے اور
کہاؤ بجد کے انڈے دیتے ہو دیر میں مثل میارک
ص ۶۹ پر ہر دو مصرع ناموزوں

(۲۶) دو ہو مو (دو الگ مو اور ہو ملے ہوئے)

تب ہی تج دے ذوق عیش زندگانی کو
مرنے سے عمر کھجرے کی طرح کھا گئی جوانی کو

ص ۱۰۷۔ دو مو ایک ساتھ اور ہو ان سے الگ ہونا چاہیئے ، کھجرے = کھچڑی۔

(۲۷) ل سنگدلوں سے سینہ صافی   عزلت کیوں ہے
رنگ آیا اسے مٹکا بھی دیکھا یارے جیوں تھا تیوں ہے؟   ص ۱۷۷

حاشیے میں ہے کہ "یہ حقیقت میں قطعہ ہے' کیونکہ اس کا وزن رباعی کے مروجہ اوزان خارج ہے"۔ یہ بیت اول ہے ایک رباعی مستزاد کی۔ مصرع ۱ میں عزلت الخ ۱۹

مصرعہ ۲ میں جیوں الخ اضافے ہیں جو مستزاد میں ہوا کرتے ہیں۔ رنگ غالباً رنگ
اور پارسے پارسے ہے۔ ۲۸۔

(۲۸) قیل مقال قافیہ قیل ص ۱۵۸، قال وقیل چاہیئے۔

(۲۹) سر پہ پڑی ہے مرے اب فکر ٹوٹ ص ۳۷ پر = پہ

(۳۰) عبیرا ۵ = ابیر

(۴) ضمیمہ۔ ضمیمے میں بیاضوں اور تذکروں سے وہ اشعار لئے ہیں جو دیوان میں نہیں
۱۳۷ اشعار غزل کے خواہ غزلیں مکمل ہوں یا نامکمل، ان میں فردیات بھی شامل، واسوخت
مثمن کے ۱۵ بند؛ ایک بند کا ایک شعر جیسا کہ اوپر آچکا ہے، درج نہیں ہوا۔ اغلاط۔

(۱) لیک دلبری عاشق سوں تجھے کام بھی نہیں ص ۲۲۱۔ دلبری غلط، صحیح دلداری

(۲) اچبلا ص ۲۰۰ = اچپلا۔

(۳) تاجاں ہوئی عدول حکمی   تونے کہا تو مر گئے ہم ص ۲۰۵

مصرع ۲ ناموزوں، مصرع ا میں ابتدائی الفاظ یوں ہیں، تاجاں نہ ہوئی
دوسرے مصرع میں کہا کے بعد مر کا اضافہ ضروری ہے۔ یہ شعر عزلت کا نہیں،
شاہ رکن الدین عشق دہلوی کا ہے، اور ان کے دیوان کے کئی نسخوں میں موجود ہے،
تذکروں میں بھی ان کے نام سے ملتا ہے۔

(۴) میں دوا تا آہ کیوں نہ کروں ص ۲۰۷، دوا نا کے بعد 'ہوں' کا اضافہ چاہیئے۔

(۵) لبستار ص ۲۱۰ = لبستار۔

(۵) فرہنگ۔ سو سے کچھ زیادہ الفاظ بعنوان فرہنگ۔ (ص ۲۲۴ تا ۲۲۷) دیئے
ہیں، بعض الفاظ کے معانی الفاظ مثلاً کلف، نہالی کے معانی درج کرنے کی ضرورت نہیں
متعدد الفاظ کے معانی غلط ہیں؛ یا کم از کم جس شعر کی طرف فرہنگ میں اشارہ ہے (فرہنگ
میں حوالۂ صفحہ) اس میں وہ معنی نہیں بیٹھتے:

۱۔ قودخاصے کا ہاتھی ص ۴۴۴۔ فوج غزالاں سے ہے میرے جلو میں گھوڑے ہیں فیلوں کے قودوں کے مانند، ایک جگہ یہ لفظ اور آیا ہے۔ اور اسی طرح۔ یہاں قطار کے معنی میں آیا ہے۔

۲۔ چکارا توی ہیکل توانا ص ۲۰۵ ہوا ہے شیر وچیتا ہے دل میں کیا عزلت رقیب کون چکارا ہے من ہرن کی قسم۔ شعر میں صفت ایہام برتی گئی ہے، چکارا ایک قسم کا ہرن ہے۔

۳۔ نہالی لحاف ص ۵۲ نہالی بستر اور توشک ہے لحاف نہیں۔

۴۔ پکھال کیچڑ ص ۱۳۶ ایک قسم کی مشک ہے۔

۵۔ ملنگ بجھو ص ۱۶۲ ایک قسم کا فقیر ہے۔

۶۔ نرد چوسر کی گوٹیوں کی چال ص ۲۱۰۔ نرد چال نہیں، ایک کھیل کا نام ہے۔

کچن کے معنی پستان اور ادھرن کے ہونٹ لکھے ہیں، یہ دونوں لفظ بطور جمع میں مستعمل ہوئے ہیں اور کچن اور ادھرن دونوں جمع ہیں، قریشی صاحب نے جس طرح لکھا ہے اس سے غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ عزلت نے ہندی نظم میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں، اردو میں نہیں۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے میری یہ تحریک ہے کہ وہ عزلت کی مثنوی راگ مالا بھی شائع کرے اور اس کے ساتھ دیوان عزلت اور اس کے مقدمے کا تکملہ بھی ہو۔ متن کی درستی میں دو اور نسخوں سے جس سے اب تک کام نہیں لیا گیا مدد لی جائے، فضول تنقیدی بحثیں نکال دی جائیں اور زبان کی جامع بحث شامل کی جائے۔

قریشی صاحب پر میں نے بہت سے اعتراضات کئے ہیں، لیکن انھوں نے محنت کی ہے اور ان کا کام آج کل کتابوں کی ترتیب و تصحیح کی جو عام سطح ہے اس سے پست نہیں۔

الرحیم (ماہنامہ)
اڈیٹر : پروفیسر محمد سرور
ناشر : شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر، حیدر آباد (پاکستان)

زیر تبصرہ ماہنامہ جون ۱۹۶۳ء میں جاری ہوا ہے۔ اس کے پروفیسر محمد سرور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا اُردو کے اچھے مصنفوں میں شمار ہوتا ہے، دور ل کے ماہنامہ جامعہ کے مضمون نگاروں اور جامعہ ملیہ کے ممتاز طلبائے قدیم میں سے ہیں، جامعہ میں ایک طویل عرصے تک معلمی کے فرائض انجام دے چکے ہیں اور شاہ ولی اللہ کے فلسفے کی ترویج و اشاعت کے لئے جامعہ میں جب بیت الحکمت کا قیام عمل میں آیا تھا تو آپ ہی اس کے نگراں مقرر ہوئے تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس غرض سے جب پاکستان میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم ہوئی تو اس کے نظام کاروں کی نظر انتخاب پروفیسر سرور صاحب پر پڑی اور انھیں اکیڈمی کی تصنیف و تالیف کا نگراں اور ماہنامہ الرحیم کا مدیر مقرر کیا۔ ہمیں امید ہے کہ موصوف کے تبحر علمی، مولانا عبید اللہ سندھی کی رفاقت اور شاہ ولی اللہ کے فلسفے سے گہری دلچسپی اور واقفیت کی بنا پر اکیڈمی اور ماہنامہ دونوں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔

ماہنامہ الرحیم کے اس وقت چار شمارے پیش نظر ہیں۔ باوجود اس کے کہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفے و حکمت سے واقفیت رکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے، مگر ان شماروں میں فکر ولی اللہی کے مختلف پہلوؤں پر نہایت ٹھوس اور پرمغز مضامین شائع ہوئے ہیں مگر جیسا کہ مدیر محترم نے اگست کے شذرات میں شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے اردو ترجموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی اشاعت کو عام کرنے کے لئے ان کی زبان عام فہم اور ان کا اسلوب آسان ہونا چاہیئے۔ ان مضامین کی زبان اور اصطلاحات کو بھی مزید آسان کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ زیادہ بہتر ہو اگر ان مباحث کو جدید رجحانات و افکار کی روشنی میں اور آجکل کی رائج اصطلاحات میں پیش کیا جائے۔

سالانہ چندہ آٹھ روپے اور ایک پرچہ کی قیمت ۷۵ نئے پیسے ہے۔

مذہبی تعلیم

مذہب ایک قانون اور ضابطے کا پابند ہوتا ہے۔ اس کی اپنی شریعت ہوتی ہے تعلیم نفی
عقائد کا ساتھ نہیں دے سکتی علم کی بنیاد مشاہدے اور تجربے پر ہوتی ہے۔ مذہب، پرستش کا
ہے تعلیم پرستش کی لیکن تعلیم سے مخصوص نظریات کی تائید حاصل کی جاتی رہی ہے۔ مدتوں کلیسا
یہی کام کیا ہے۔ آج بھی یہ صورت پیش آجاتی ہے جب کوئی سماج کلیتاً کسی ایک فلسفۂ حیات
یا مکتبۂ خیال کا مدعی بن بیٹھتا ہے۔ فسطائی نظام ہو یا اشتراکیت، سب ہی اپنا ہی رنگ چڑھا
کی کوشش کرتے ہیں۔ جمہوریت میں تعلیمی ادارے اکثریت کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ یہاں بھی
غیر جانب داری اور رائے عامہ کا نام لے کر ایسے طور طریقے برتے جا سکتے ہیں جو یک طرفہ ہوں
کو خواہ کتنا ہی مدلل اور واقعیت پسند بنا کر کیوں نہ پیش کیا جائے، یہ خطرہ برابر لاحق رہتا ہے
کہ پرستاران مذہب اپنی عقیدت مندی کے مطابق استاد سے اظہار خیال کے طالب ہو
لگیں اور ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس میں جمہوریت اور سائنس کے تقاضے پورا کرنے کے لا
ذہن تعمیر نہ ہو سکے۔ ایک جمہوری تعلیمی نظام بھی عملاً معتقدات کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس
کے اپنے احساسات، مذہبی رسومات، تہذیبی معاملات، بہرحال اپنا اثر رکھتے ہیں۔ پرو
کے ذریعے جان بوجھ کر اثر پذیری کے اصولوں کے تحت دوسروں کو اپنا ہم خیال بنایا جاتا
اپنی ماہیت کے اعتبار سے مخصوص نظریات کی حامل یک طرفہ تعلیم اور پروپیگنڈہ دونوں فلا
کے منافی ہیں لیکن تعلیم محض حصول واقفیت کا نام نہیں ہے۔ اس کا منصب ذہن کی تر
اور شخصیت کی تعمیر ہے۔ تعلیمی آزادی سے مراد ہے نظام تعلیم کا غیر جانب دارانہ رویہ، لیکن
ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ اس رجحان کو اس طور برتا جائے کہ واضح طور پر سماجی احساسات

سکیں تعلیم میں اگر یک رنگی کو دخل نہ ہونا چاہیئے تو بے رنگی بھی کیسے گوارا کی جا سکتی ہے۔ ایک بے اثر اور بے فیض تعلیم کیونکر اپنا منصب پورا کر سکتی ہے۔ اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم کو جائز اور قابل تائید جانبداری کا قائل ہونا چاہیئے۔ اگر ایک طرف بچوں میں تنقید و تبصرہ کا مادہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ کسی ناجائز پروپگینڈے کی زد میں آکر نہ رہ جائیں تو دوسری طرف پروپگینڈے کو اس حد تک مفید بھی خیال کیا جا سکتا ہے جہاں تک کہ وہ جمہوری نظام تعلیم کی ترقی کا سبب بنتا ہے۔ جائز اور قابل تائید جانبداری کا مطلب یہ ہے کہ جو مقاصد ہم اپنے سامنے رکھتے ہیں اور جن ذریعوں کو اپناتے ہیں، ان کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ گویا تعلیم کو بھی تہذیب کی طرح، ان اقدار کو ابھارنا چاہیئے جن کو تجربے کی بنا پر انسانی فلاح و بہبود کا ضامن قرار دیا گیا ہے۔ تعلیم گاہوں میں ان کی آبیاری کے ساتھ ساتھ غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے کی کوشش برابر جاری رہنی چاہیئے۔ استاد کو ہمیشہ اپنا ذہن پوری طرح صاف رکھنے کی ضرورت ہے اور اسے اپنی بات اس طرح کہنی چاہیئے کہ طلبہ اس کے ذاتی خیالات سے باخبر ہو جائیں اور اس پر غور کر سکیں استاد کو جمہوری طور پر رہنمائی کرنے کے لئے ذہنی اور اخلاقی دیانت داری برتنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کیا تعلیم کے ذریعے سماج بدل سکتا ہے؟ رجعت پسندوں کا یہ خیال رہا ہے کہ مدرسے شاذونادر ہی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ تو تقلید اور تتبع ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن روشن خیال اور معتدل نظریے کے حامی اس بات کو نہیں مانتے۔ دراصل تعلیم نے سماجی اقدار کو مستحکم بھی بنایا ہے اور سماج کے بدلنے کا فرض بھی پورا کیا ہے۔ یہ بات دراصل اس پوری تہذیب پر منحصر ہے جس کا ایک جزو تعلیم ہے۔ تعلیم کا اثر اس تقویت پر منحصر ہوتا ہے جو ان تہذیبی عناصر کی بنیاد پر اسے حاصل ہوتی ہے جن سے اس کی شیرازہ بندی ہوئی ہے۔

فطری اخلاقیات کے قائل اپنے آپ کو قوانینِ قدرت کا پابند بناتے ہیں۔ لیکن اس بنا پر یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اقدارِ عالیہ سے قطعی بے نیاز ہیں۔ حقیقتاً ایک غیر مذہبی آدمی مدرسے کو اخلاقی اقدار ہی کا مظہر اور مرکز دیکھنا چاہتا ہے۔ فطری اخلاقیات میں قوانینِ قدرت اور انسانی قدرت اور انسانی تجربے کی بات آتی ہے، وہاں بالخصوص سماجی اور قدرتی فنون کے نتائج کی روشنی میں

معاشرے کے اصول مرتب ہوتے ہیں۔ اخلاق میں وہ افعال شامل کئے جاتے ہیں جنھیں انسان متصدیوں پر لبنے تعلقات کی بنا پر اپنی فلاح وبہبود اور مسرت وعشرت کا ذریعہ سمجھا ہے۔ اس لئے اگر کوئی ادارہ غیر مذہبی عقائد کا علم بردار بنتا ہے، تو وہاں اخلاقی کردار کو اپنے اور اپنے بزرگوں کے عمل کے آئینے میں دیکھ کر سیکھتے ہیں۔ ایک قدیم اور پختہ تہذیب، مختلف عقائد مذاہب اور سیاسی نظریات کا اندر لئے ہوتی ہے۔ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ نوجوانوں کے ذہنی خلفشار کو دور کرکے انھیں مفید مشاغل کی طرف لایا جائے۔ تعلیمی اداروں کو اپنے لئے ایک تخلیقی اور تعمیری مسلک متعین کرنا چاہیے۔ یہ مسلک کیا ہو سکتا ہے؟ اس سلسلے میں متعدد جواب دئے جا سکتے ہیں لیکن ہر ایک نامکمل ہوگا تاوقتیکہ اتنی بات کہی جائے کہ نوجوانوں کو دیس کا وفادار اور انسانیت کا پرستار بنانا چاہیئے۔ اُن کے اندر قوت فکر بڑھانی چاہیئے تاکہ وہ معاملات پر غور کرکے اپنا نتیجہ خود نکال سکیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر تعلیم اپنا منصب پورا کرنے سے قاصر رہے گی۔

ہماری مرکزی حکومت نے ۱۹۵۹ء کے اختتام پر مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے متعلق ایک کمیٹی مقرر کی جس کے صدر شری پرکاش جی تھے۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں موجودہ معاشرت میں انحطاط کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اخلاقی پستی کو دور کرنے کے لئے اقدامات تجویز کئے ہیں۔ اس کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی اور اس کی سفارشات پر عام طور پر عمل کرنے کے لئے کہا گیا لیکن فوراً ہی اس سلسلے میں کوئی خاص کارروائی نہیں کی جا سکی۔ کسی ایک نہج پر پہنچنے کی غرض سے چند ماہ ہوئے مرکزی وزارت تعلیم نے مختلف اداروں سے اس کمیٹی کی مختلف سفارشات کے بارے میں استفسار کیا تاکہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے بارے میں باضابطہ اور متفقہ طور پر کوئی مطمح نظر قائم ہو سکے۔ اس کمیٹی نے شخصی کردار کو بلند کرنے کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے اور اقدار عالیہ برتنے کی تاکید کی ہے۔ ہمارے سماج میں اخلاقی گراوٹ کے مظاہر کی طرف سے تشویش کا اظہار کیا گیا ہے اور انھیں سماجی تعلقات کی ابتری کا ایک اہم سبب بتایا گیا ہے۔ دیس کے مختلف العقائد لوگوں میں آپس کے بُعد کو دور کرنے کی غرض سے مختلف مذاہب کی تعلیم کو ضرا

بچھا گیا ہے تاکہ طلباء سب کی اخلاقی قدروں سے روشناس ہو جائیں۔ اس غرض سے مختلف مذہبی پیشواؤں اور رہنماؤں کے حالاتِ زندگی بتانے کے لئے کہا گیا ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے طلبہ کو صحیح تعلیمی مواد فراہم کرنے کی اشد ضرورت ہے مادری زبان اور تاریخ کی درسی کتابیں اس باب میں خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن صرف کتابوں کی طرف توجہ کرنے سے کام پورا نہیں ہو جائے گا۔ رپورٹ میں یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ مدرسے کا کام شروع کرنے سے قبل طلبہ کا اجتماع کیا جائے اور اخلاقی تعلیم کا ہفتے میں ایک گھنٹہ ضرور رکھا جائے۔ یہ اقدامات ایک علامتی فعل کی حیثیت تو ضرور رکھتے ہیں لیکن کسی طور کافی نہیں کہا جا سکتا۔ اس رپورٹ میں صبح کے وقت طلبہ کے اجتماع میں دھیان گیان کی خاطر کچھ منٹ کی خاموشی کو بھی سراہا گیا ہے کہیں یہ عمل تو محض ایک رسم بن کر رہ جانے کا خطرہ لئے ہوئے ہے۔ اور کچھ مفید نظر نہیں آتا۔ اہم بات تو یہ ہے کہ سارے مدرسے کی فضا، اخلاقی اقدار کی نشو ونما کے لئے سازگار بنائی جائے۔ اساتذہ کا اخلاق اور کردار مدرسے کے اندر بہت کچھ مناسب ماحول بنا سکتا ہے لیکن مدرسہ پھر بھی بچے کی زندگی پر ایک متعینہ اور محدود حد تک ہی اثر ڈالتا ہے۔ سماج کے اثرات مدرسے سے کہیں زائد ہیں۔ جب بچے کے اردگرد ہر جگہ اخلاقی پستی کا دَور دورہ ہو تو اس کے اندر اقدار کا پاس پیدا کرنا دشوار ہے۔ بہرحال جہاں تک مدرسوں کا تعلق ہے وہاں مختلف فرقوں کے اساتذہ کی موجودگی مناسب ہے۔ اقلیتوں کی نمائندگی مدرسے کے عملے میں ضرور ہونی چاہیے کیونکہ اخلاقی تعلیم کا جذباتی ہم آہنگی اور آپس کی مفاہمت سے بڑا قریبی تعلق ہے مختلف مذاہب کی واقفیت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی بھی صحیح معلومات نہایت ضروری ہے عموماً ہمارے طلبہ توہمات اور رسومات کو مذہب سمجھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیئے کہ ہماری جمہوریت سیکولر ہے۔ مدرسے کی تقریبات اور رسومات میں مذہبی رنگ ہرگز پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی طرح ریاستی امور میں مسند نشینی، یوم تاسیس یا کسی افتتاح کے موقع پر کسی خاص مذہبی رسم کو جگہ نہیں دینی چاہیئے۔ اس طرح دوسرے مذہب کے

لوگوں کی دل شکنی ہوتی ہے۔ مذہبی تعلیم کی اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مخصوص خوشحال طبقوں کی نمائندگی کرنے والے مدارس جنھیں 'پبلک سکول' کہا جاتا ہے، طلبہ کے کردار کی تشکیل کے لئے مناسب ماحول پیدا کرتے ہیں اور انھیں دیس کے عام مدرسوں کو اپنے لئے نمونہ بنانا چاہیئے۔ لیکن یہ تجویز ایک غلط انداز ے اور احساس کی دین معلوم ہوتی ہے۔ پبلک سکولوں کو اپنے مادی وسائل کی فراوانی اور طلبہ کے سرپرستوں کی حیثیت کی وجہ سے کچھ دنیاوی اقدار پیدا کرنے کا موقع ضرور حاصل ہو گیا ہے لیکن یہ اقدار دراصل مغربی تہذیب کی سطحی نقالی کی بدولت آئی ہیں۔ دراصل ضرورت یہ ہے کہ ہماری تعلیم، ہماری تہذیب کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہو جس میں سائنسی دنیا کی روح بھی پھونک دی گئی ہو۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ تہذیب کی ٹھوس بنیادیں، عالمگیر ہوتی ہیں۔ آج دنیا کو ایک ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو اپنی اقدار کے اعتبار سے کسی جغرافیائی حدود کے اندر محدود نہ ہو، جہاں آزادانہ طور پر تبادلہ خیال ہو سکے اور جہاں انسان دوستی کا درس دیا جا سکے۔ اخلاقی قدروں کی ترویج، اور کردار کی تشکیل، کہنے سے کچھ ایسے ہی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

'معلّم'

کوائف جامعہ

گوشۂ جگر کا افتتاح

حضرت جگر مرحوم کی کچھ یادگار چیزیں ان کے بے تکلف اور جگری دوست جناب تسکین قریشی صاحب کے پاس تھیں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ان چیزوں کو کسی علمی اور تعلیمی ادارے میں محفوظ کر دیا جائے تو مرحوم کی یاد کو تازہ رکھنے میں بڑی مدد ملے گی اور اگر کوئی صاحب ان پر کام کرنا چاہیں گے تو ان کو اکٹھا مواد مل جائے گا۔ حضرت جگر کا جامعہ ملیہ سے بڑا گہرا اور پائدار تعلق رہا ہے۔ "شعلۂ طور" کو مکتبہ جامعہ نے جس اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا اس وقت غالباً کسی اور کا کلام اس قدر دیدہ زیب اور خوبصورت شائع نہیں ہوا تھا۔ اس لئے جناب تسکین نے امیر جامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب سے "گوشۂ جگر" کے قیام کی خواہش ظاہر کی ان دونوں بزرگوں نے اس تجویز کو بڑی خوشی سے منظور کیا اور حضرت جگر کی تیسری برسی کے دن، ۹ ستمبر ۱۹۶۳ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اس کا افتتاح فرمایا۔ افتتاح کی کارروائی تلاوت قرآن حکیم سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد شیخ الجامعہ صاحب نے گوشۂ جگر کے قیام کا اعلان فرمایا۔ اس کے بعد جناب تسکین قریشی صاحب نے ایک مختصر تقریر کے بعد امیر جامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خدمت میں حسب ذیل چیزیں پیش کیں:۔

۱۔ مسودہ غزلیات شعلۂ طور و آتش گل (جمع کردہ قیسی فاروقی)

۲۔ بیاض غزلیات (مع انڈکس مرتبہ تسکین قریشی صاحب) ۱۱ عدد

۳۔ ڈائری، ۲ عدد

۴۔ نوٹ بک (یادداشت، جس میں پتے بھی درج ہیں۔

۵۔ مسودہ آتش گل (مرتبہ تسکین قریشی صاحب)

۶۔ آتش گل مطبوعہ پاکستان (مع ہندوستانی ایڈیشن)

۷۔ مسودہ مکتوبات جگر (مرتبہ قیسی فاروقی) غیر مطبوعہ

۸۔ اصل خطوط جگر بنام تسکین قریشی صاحب (جو مکاتیب جگر کے نام سے شائع ہو چکے ہیں)

ان کے علاوہ مرحوم کی پان کی ڈبیہ، عینک، سیاسنامے اور کچھ کتابیں ہیں جو مرحوم کو پیش کی گئی تھیں۔

اس کے بعد مرحوم کے چند ریکارڈ سنائے گئے، پھر جناب ابوالکاظم قیصر زیدی صاحب، استاد جامعہ کالج اور جناب رشید نعمانی صاحب، استاد آرٹس انسٹی ٹیوٹ نے مرحوم کی شخصیت اور شاعری پر مضمون پڑھ کر سنائے۔ آخر میں صدر جلسہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے مختصر سی تقریر کی۔ یہ تقریر اور دونوں مضامین، انشاء اللہ جامعہ کے اگلی اشاعت میں شائع کئے جائیں گے۔

اس مختصر تقریب میں جامعہ کے استادوں اور طالب علموں کے علاوہ میرٹھ کے کچھ معززین نے، جو حضرت تسکین کے ساتھ تشریف لائے تھے اور دلی کے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔

یوم اساتذہ

۵ ستمبر کو جامعہ میں یوم اساتذہ منایا گیا۔ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ جامعہ کے تمام تعلیمی اداروں کے نمائندوں نے تقریریں کیں، جن میں استادوں کی ذمہ داریوں، ان کی معاشی اور سماجی حالت، ان کے حقوق اور فرائض اور ملک کی تعلیمی حالت پر روشنی ڈالی گئی۔ آخر میں صدر جلسہ نے اس دن کی اہمیت اور خصوصیت کو بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ آج راشٹرپتی ڈاکٹر رادھا کرشنن کا یوم

ہے۔ موصوف کا کسی سیاسی عمل سے کبھی بھی تعلق نہیں رہا ہے، اگر آج ہماری ریاست کے سب سے بڑے عہدہ دار ہیں، اس لئے کہ ایک معلّم کی حیثیت سے خلوص اور دیانتداری کے ساتھ ملک کی خدمت کی ہے۔ آپ نے ملک کی تعلیمی حالت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں شبہ نہیں ہمارے یہاں تعلیمی حالت اچھی نہیں ہے، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی کے بعد اس میں کافی سدھار ہوا ہے اور اس نے اچھی خاصی ترقی کی ہے۔

پچھلے برسوں میں رسالہ جامعہ کے حسب ذیل خاص نمبر شائع ہوئے ہیں:۔

۱۔ ٹیگور نمبر	قیمت پچاس نئے پیسے
۲۔ جگر نمبر	" " " "
۳۔ مولانا ابو الکلام آزاد نمبر	" ایک روپیہ
۴۔ ۱۹۶۱ء کے اردو ادب کا جائزہ	" ایک روپیہ
۵۔ ۱۹۶۲ء " "	" " ایک روپیہ

پتہ:۔ ماہنامہ جامعہ
جامعہ نگر، نئی دہلی نمبر ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

جامعہ

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

جگر مرحوم کو خراجِ عقیدت

ڈاکٹر ذاکر حسین

جنابِ شیخ الجامعہ[لہ]۔ شکر گزار ہوں کہ اس صحبت میں شرکت کے لئے آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ شکر گزار ہوں کہ ایک موقع آپ نے اور دیا کہ ایک رنگیں نوا شاعر، ایک خوش خو، خوش خیال و خوش خصال انسان، ایک پیکرِ محبت و شرافت، ایک مرد غیور و خوددار، ایک مجسمۂ خلوص و استغنا، ایک عزیز دوست اور کرم فرما، حضرت علی سکندر جگر مرادآبادی مرحوم و مغفور کی یاد پر عقیدت کے دو پھول چڑھا سکوں۔

اس کارخانۂ ہستی کا دستور ہے کہ جو آتا ہے جاتا بھی ہے ضرور، جیا آتا ہے اور بلا استثنا جاتا ہے مگر آدمی کی بھول کا کچھ عجیب حال ہے کہ جب بھی یہ یقینی حادثہ پیش آتا ہے تو ایک دھکا سا لگتا ہے، مگر پھر بھول ہونے لگتی ہے، مگر حادثہ کا ایک نقش ذہن پہ رہتا ہے جو طرح طرح سے بار بار اُبھر آتا ہے جگر صاحب جب دنیا سے رخصت ہوئے تو ایسا ہی دھکا پہنچا اور سخت دھکا۔ اور یہ شعر یاد کرکے بھی دل کا دکھ کم نہ ہوا کہ

قریبِ منزلِ آخر ہے الفراق جگرؔ
سفر تمام ہوا نیند آ بھی جاتی ہے

یا اس خیال سے کہ

جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

لہ گوشۂ جگر کے افتتاح کے موقع پر ۹ ستمبر ۶۳ء کو یہ صدارتی خطبہ پڑھا گیا تھا۔

آج جو آپ نے مجھے بلایا تو وہ حادثہ کی یاد پھر تازہ ہوگئی، مگر آج کچھ ایسا لگا کہ جگر صاحب تو زندہ ہیں، زندوں سے زیادہ زندہ۔ اور ان کا یہ شعر یاد آیا۔

دل کو سکون روح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

جو موت دوست کا پیام بن کر آتی ہے وہ موت زندگی پر ہنس سکتی ہے کہ وہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتی ہے، ایک نئی زندگی کا پیام، ایک نئی زندگی کا دروازہ، حال اور مستقبل کی حد فاصل نہیں ان کا دریچۂ وصل۔ مرنے والے کو زندگی ہی میں اس کا یقین تھا:

مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہیے بہانا

وہ اسی بشارت وصل کا بہانہ تھا۔ خدا ایسے شاعر دلنواز اور عاشق پاک طینت کو اپنی بخششوں سے نوازے۔ وہ تو ہم سے رخصت ہو کر روح کائنات سے پیوستہ ہو چکا، لیکن اس نے اپنی روح کی تڑپ، اپنی نظر کی پاکی، اپنے دل کی گرمی کے انمول خزانے اپنے کلام میں محفوظ کر کے ہمارے لئے چھوڑ دئے ہیں اور اپنی محبت، اپنے خلوص، اپنی مروت کی یادوں سے ہمارے دلوں کو سجا گیا ہے۔ ان سے کام لینا ہمارا کام ہے۔ جگر تو زندہ جاوید ہیں، لیکن ہمیں بھی اس جاودانی زندگی میں شریک ہونا چاہیے۔ اس مرکز علم و ادب میں اس جگر گوشہ کی ترتیب اسی کا سامان ہے۔ میں کارکنان جامعہ کو مبارکباد دیتا ہوں اور جناب تسکین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کے تعاون سے یہ گوشہ جامعہ ملیہ میں مرتب ہو رہا ہے جس جامعہ سے اس کام میں شاہد ہوں، جگر صاحب کو بہت گہرا تعلق خاطر تھا۔

جگر مرحوم کا سلوک خوردوں کے ساتھ

جناب سید ابوالکاظم قیصر زیدی

("گوشۂ جگر" کے افتتاح کے موقع پر یہ مضمون پڑھا گیا)

ضابطۂ اخلاق کا ایک ادنیٰ سا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی مریضانہ کیفیت میں مبتلا ہو جائے جس میں متعدی اثرات ہوں تو مریض خود ہی اس کا اہتمام کرتا ہے کہ جن کو وہ عزیز رکھتا ہے ان سے دور رہ کر بے تعلق ہو کر، ان کو اس مریضانہ کیفیت سے بچاتا ہے۔ میری کم علمی اور ادبی بے بضاعتی نے مجھے گمنامی کی اس ہی منزل میں پہنچا دیا ہے جس میں یہ مریضانہ کیفیت موجود ہے اور میں اپنے کسی محترم عزیز اور ذی شرف کرم فرما کے ساتھ ایسا ذکر کرتے ہوئے اس ہی لئے ڈرتا ہوں کہ میری گمنامی کی آلودگی کہیں اس کے دامن کو بھی نہ چھو جائے۔ مگر جگر مرحوم جس شرف کے مالک تھے اس کے بارے میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ان کا شرف ان تمام غیر معروف وابستگیوں کے تذکرے سے بڑھتا ہی جائے گا۔ ہاں اس کا اندیشہ ضرور ہے کہ ذکر کرنے والے کو گمنامی کی جو سعادت میسر ہے۔ وہ کم ہو جائے گی۔ میں جگر مرحوم سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے ملا اور پھر جب تک موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان کو ہم سے چھین نہیں لیا ملاقات کا یہ شرف بار بار ملا۔

مدتوں زیست بناتی ہے حقائق کے طلسم
موت اک آن میں افسانہ بنا دیتی ہے

اس مدت مدید میں ادبی سفر میں شریک کارواں رہا اور کبھی مادی سفر کی رفاقت بھی میسر ہوئی۔ پہلی ملاقات قرول باغ کے ایک غیر معروف گوشہ میں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت جگر اس عالم میں ہیں جس میں تعارف اور ملاقات محض بے معنی ہوتی ہے مگر ان کے کلام کے مطالعہ کی بدولت یہ بھی جانتا تھا کہ میں جگر سے جب بھی ملوں گا ان کو ایک سرمستی کے عالم میں پاؤں گا، ایک ایسی مدہوشی کے عالم میں جو کبھی بے خبری کی حدوں کو نہیں چھوتی ہے سرشاری کی ایک ایسی کیفیت میں جس پر صد جہانِ عقل و ہوش کو نچھاور کیا جا سکتا ہے۔ میں

حاضر ہوا محمود علی خاں صاحب (جامعی) کے مستقر کے ایک مختصر سے کمرے میں، رسمی سلام کا جواب جس انداز
سے پایا وہ بہت مایوس کن تھا — جگر مرحوم منگلور ضلع سہارنپور کے ایک بزرگ حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ
سے نسبت ارادت رکھتے تھے، میں ان ہی کے آستاں سے آیا تھا، میں نے اپنا نام بتلاتے ہوئے اس قریہ
کا نام بھی لے دیا اور میں جو چاہتا تھا وہی ہوا- جام مے کی سرشاری، شہر محبوب کا نام سن کر ایک اور الہامی
کیفیت میں بدل گئی اور دوسرے ہی لمحہ میرے ہاتھوں کو ان کے لرزتے ہوئے ہونٹ مس کر رہے تھے کیونکہ
ان کے شیخ کے آستانہ کو میں ان سے چھو آیا تھا- وہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور میرے نام کی ترکیب میں کچھ شاعرانہ
جھلک پاکر مجھ سے کچھ اشعار پڑھنے کی فرمائش کی. میری جواں عمری کی شوخیٔ اندیشہ دیکھیئے کہ میں اپنے لئے
دو اشعار پیش کر بیٹھا جو نہ صرف یہ کہ جگر مرحوم کی معروف زمین میں تھے بلکہ ایک مصرع بھی جو کانوں میں موجود
میرے بیان کو سچ ہی مان لیجئے کہ میں نے جب یہ اشعار کہے تھے تو جگر کی غزل میری نظر سے نہیں گزری تھی
نغمہ میرے کانوں میں نہیں گونجا تھا. میرے اشعار یہ تھے

دل کی دنیا تباہ ہوتی ہے — اے تغافل سے دیکھنے والے
ایک وہ بھی نگاہ ہوتی ہے — جو مسرت کے پھول برسا دے

اور اس جرأت کا نتیجہ کسی مذمت میں مبتلا ہونا نہ تھا بلکہ میں اپنا دوسرا قطعہ اس مسرت کے جذبہ سے پیش کر رہا تھا
پہلے قطعہ کو شرف پسندیدگی عطا ہوا ہے اور پھر بیس سال سے نا بمدت میں یہ ہوا کہ جس مشاعرے میں جگر مرحوم موجود
اس میں بجائے اس کے کہ یہ خوف پیدا ہو کہ خسرو ادب کے اس آفتاب کے مقابل ہمارے ٹمٹماتے چراغ اپنا وقار کھو دیں گے
یقین اور اعتماد پیدا ہو جاتا کہ سامعین سے خراج تحسین اس لئے پائیں گے کہ جگر اپنی خصوصی نوازش کو کام میں لاتے ہوئے
فرمائش کے طور پر کوئی اشارہ ضرور کریں گے اور ان کا یہ اشارہ ناموافق فضا کو بھی سازگار بنا دے گا اور اس طرح
آفتاب کی پوری تابناکی میں یہ چراغ بے نور نہ ہو سکے ——— میں نے خوردوں کے ساتھ جگر مرحوم کی دلنوازی کے
سلوک کو دیکھا ہے جو ان کو عزت و شرف عطا کرتی تھی اور صاحبانِ عز و جاہ سے وہ بے پروا سلوک بھی دیکھا ہے جو غیر
شعوری طور پر درجات کے فرق کو مٹا دیتی ہے. میں نے جگر کی مدہوشی میں ہوش کی تمام حسین کروٹیں دیکھی ہیں. ان کی کرم فرمائی اور شفقت
کی یادوں کی بدولت اس لمحہ میں بھی یہ محسوس کر رہا ہوں کہ

قدم قدم مری ہمت بڑھائی جاتی ہے — نفس نفس تری آہٹ سی پائی جاتی ہے (جگر)

ملا محمد صوفی مازندرانی

ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی

بانکی پور کی فہرست[1] میں لکھا ہوا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے "محمد صوفی" نام کے کئی شاعروں کا ذکر کیا ہے اور ایک کو دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر کے ایک کے شعر کو دوسرے کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مؤلف صحف ابراہیم نے صوفی مازندرانی، صوفی شیرازی، صوفی کرمانی، صوفی اردستانی، صوفی آملی اور صوفی ہمدانی چھ ہمنام شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ آتشکدہ میں صوفی اصفہانی نام کے ایک شاعر کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ صوفی کشمیری نام کے بھی ایک شاعر گزرے ہیں۔ مجمع النفائس میں ان صوفی کو شیراز کا بتایا گیا ہے۔ نیز اس کے مؤلف کو نہیں معلوم کہ صوفی شیرازی اور صوفی کرمانی دونوں ایک ہی ہیں یا الگ الگ۔ البتہ تقی واحدی نے صرف صوفی مازندرانی اور صوفی استراجاری دو شاعروں کا نام دیا ہے۔

ملا محمد صوفی متخلص بہ محمد صوفی مازندران کے شہر آمل میں پیدا ہوئے۔ مگر غالباً بچپنے ہی میں شیراز جا کر رہنے لگے تھے۔ وہ صرف شاعر اور صوفی ہی نہ تھے بلکہ سیاح بھی تھے۔ پہلے انھوں نے پورے ایران کا دورہ کیا اور اس کے بعد شہنشاہ اکبر[2] کے زمانے میں اپنے وطن سے ہندوستان آئے اور یہاں آکر گجرات کے شہر احمد آباد میں سکونت اختیار کی۔ گجرات سے صوفی کئی دفعہ حج کے لیے گئے اور غالباً یہیں سے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی جاتے رہتے تھے۔ اور دنوں کشمیر میں بھی رہے تھے بلکہ بعض تذکرہ نویسوں کے کہنے کے مطابق تو انھوں نے کسی زمانہ میں اسے اپنا وطن بھی بنا لیا تھا۔ ہند میں رہ کر ان کو اپنا وطن اور دوست و احباب برابر یاد آتے رہے جو ایک فطری چیز ہے۔

؎۱ ج ۳، ص ۶۰

؎۲ ۹۶۳ — ۱۰۱۴ ہجری، ۱۵۵۶ — ۱۶۰۵ عیسوی

روز روشن میں لکھا ہوا ہے کہ "محمد آلی اگرچہ صوفی مشرب اور درویش وضع تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ درشت گو، کم اختلاط اور بدمزاج بھی تھے۔"[۱] غالباً اسی تند طبعی اور درشت گوئی کی وجہ سے ہندوستان میں بہت سے لوگ ان کے دشمن ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض کی صوفی نے ہجو بھی کی ہے۔ صوفی پر آزاد خیال، دہریہ اور لامذہب ہونے کا بھی الزام لگایا گیا تھا کم از کم شروع شروع میں کافی شراب کے ضرور عادی رہے ہوں گے۔

شب شنبہ شراب باید خورد　　می چوں آفتاب باید خورد
گوشۂ خلوتی ببـاید جست　　با محمد شراب باید خورد

آپ اپنے زمانہ کے بڑے معزز شاعروں میں سے تھے۔ اقبال نامہ جہانگیری میں صرف دس شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ ہفت اقلیم میں لکھا ہوا ہے کہ "شعر در غایت جودت و ہمواری دارد۔"

صوفی کے آثار میں سب سے زیادہ اہم "بتخانہ"[۲] ہے جس میں ایک سو چھبیس شاعروں کے دیوانوں سے انتخابات دیئے گئے ہیں۔ مؤلف بتخانہ لکھتا ہے: "مولانا نے فرمایا کہ جس کو میری شعر فہمی کا امتحان کرنا ہو، وہ میرے انتخاب کو دیکھے کہ میں نے کس طرح قدما کے اشعار سے ساٹھ ہزار شعروں کا انتخاب کیا اور اس کا نام بتخانہ رکھا ہے.... میں نے خود وہ بتخانہ دیکھا ہے۔"[۳] میں نے اس کتاب کا نام میخانہ و بتخانہ" رکھا ہے۔ بتخانہ ۱۰۱۰ ہجری/ ۲-۱۶۰۱ عیسوی میں حسن بیگ خاں کی مدد سے جو ۱۰۰۷ ہجری، ۹۹-۱۵۹۸ عیسوی میں گجرات کے بخشی بنا کر بھیجے گئے تھے تالیف ہوا مگر اس کے بعد ۱۰۲۱ھ / ۱۳-۱۶۱۲ء میں عبد اللطیف بن عبد اللہ عباسی گجراتی[۴] نے اس میں اضافے کئے" یعنی خلاصۂ احوال شعرا"

---

[۱] ص ۶۱۵۔ [۲] نسخۂ خطی شمارہ ۳۶۶، بوڈلین لائبریری۔ [۳] ص ۳۴۷۔

[۴] عبد اللطیف گجراتی لشکر خانی پہلے لشکر خاں کے پاس رہے۔ اس کے بعد انھیں شاہجہاں کے دربار سے دیوانی تن کا عہدہ، عقیدت خاں کا خطاب اور ہزاری چار سو سوار کا منصب ملا۔ آخر میں حاسدوں کی وجہ سے شاہی ملازمت سے ہٹنا پڑا۔ آپ نے مثنوی مولوی روم پر بڑی اچھی شرح لکھی ہے۔

کے علاوہ شعرا کے مختصر حالات لکھے اور ایک مقدمہ کا اضافہ کیا۔

تذکرہ کے بعد ساقی نامہ کی باری آتی ہے جو ۱۰۰۰ ہجری، ۹۲-۱۵۹۱ عیسوی میں تصنیف ہوا۔ اور جس کی تذکرہ نویسوں نے بڑی تعریف کی ہے۔ مؤلف عرفات عاشقین لکھتا ہے: "ان کا ساقی نامہ بڑا مشہور ہوا"۔ اور صاحب میخانہ کہتا ہے: "مولانا نے فرمایا... جو شخص کو میری شاعری کا درجہ معلوم کرنا ہو وہ میرے ساقی نامہ کو دیکھے کہ کیسا کہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا کا کہنا بالکل صحیح ہے"۔ میخانہ میں پورا ساقی نامہ دیا ہوا ہے جس سے کچھ اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

بدہ ساقی آن می کہ جوش آورد ۔۔۔ زبان و زمین و درخروش آورد
جہان آن چنانست در عہد ما ۔۔۔ کہ تن بی سر و خاک شد بی کدھا
نہ بر جای خویش اندر خیر و شر ۔۔۔ کہ زیر پا کفش بالای سر
نہ میخانہ معمور نہ خانقاہ ۔۔۔ نہ جزمی ز طاعت نہ خطا ز گناہ
چنان خوار و زارم درین روزگار ۔۔۔ کہ گوئی مرا نیست پروردگار

دیوان محمد صوفی کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں سب سے پہلے قصیدے ہیں۔ اس کے بعد غزلوں کی باری آتی ہے۔ تیسرے نمبر ساقی نامہ ہے۔ سب سے آخر میں رباعیاں ہیں۔

مجموعۂ ملا صوفی کے نام سے ایک قلمی نسخہ نیشنل میوزیم نئی دہلی میں موجود ہے جو بہت خوبصورت اور زرافشاں ہے۔ یہ نسخہ غالباً کشکول ہے اور خود صوفی کا کشکول ہے۔ نیز اس میں نثر و نظم اور عربی فارسی دونوں کا انتخاب ہے۔ نظم میں اوحدی، سنائی، عراقی، مولوی، معنوی، میرحسین سادات، سعدی، ابوالعلا، قاضی صفی الدین علی، ابوبکر الخارزمی، حضرت عائشہ، عز الدین محمود الکاسی، قطران، لامعی گرگانی، منوچہری، جنید، خواجہ افضل، قطران بن منصور، خیام، قاضی میرحسین میبدی، عطار، عطائی، شاہ قاسم انوار، فخر فخر فیاض ربتی، نظامی، شافعی، ابن فارض، شیخ محمد مغربی

لہ فہرست ص ۔ ۲ہ ص ۳۴۷ ۔ ۳ہ ۸ ۔ ۴ہ ۲۱۸ بیت
۵ہ نمبر ۳۰۱ ۔ ۶ہ نمبر ۵۶۰،۱۴۳/۷

قطب محی وغیرہ کے اشعار کا انتخاب ہے۔ نیز نثر و نظم میں عین القضات، مرصاد العباد، کیمیائے سعادت، اصطلاحات صوفیہ، نفحات، رسالہ اخوان الصفا، شرح گلشن راز، رسالہ شق القمر خواجہ صاین الدین علی ترکہ سپاہانی، شرح سعید الدین فرغانی، ترجمہ عقبات امام عراقی، نفحات ابوبکر واسطی، مثنوی، فتوحات، مقامات حریری، شرح میمنہ خارضہ، تاویلات، قاموس، اخلاق جلالی، اخلاق ناصری، مجموعہ شیخ امین الدین کازرونی، شرح تعرف، ملل و نحل، زخیرۃ الملوک سید علی ہمدانی، تاج المآثر، تفسیر سورہ یوسف از خواجہ معین الدین چشتی، تفسیر یوسف از ملا معین خوسی، لوائح، نفحات خواجہ ابوالوفا خوارزمی جیسی کتابوں اور قطب محی، خواجہ افضل، قاضی میر حبین میبدی، حاتم اصم، غزالی، سید علی ہمدانی، حجۃ الاسلام، حرمی، خواجہ معین الدین، ابوالحسن الرودی، شیخ ابوالعباس، القصاب الآملی محمد المعروف بابن الفقادی وغیرہ جیسے مصنفوں کے آثار سے انتخاب کئے گئے ہیں۔

اس کشکول کے آخر میں خود صوفی کا کچھ کلام بھی ہے۔ اصل نظم شروع ہونے سے پہلے نثر میں ایک تمہید ہے۔ اس تمہید کے بعد سب سے پہلے قصیدوں[1] کی باری آتی ہے جن میں سے کچھ پیغمبر محمدؐ کی مدح میں ہیں۔ ایک قصیدہ میں ابوالقاسم نام کے ایک شاعر کا ذکر ہے جنھوں نے صوفی کو اپنا قصیدہ بھیجا تھا اور جو غالباً صدر کے عہدہ پر فائز تھے۔ ایک قصیدہ میں صوفی نے اپنی شاعرانہ عظمت پر فخر اور ہند میں پڑے رہنے پر افسوس ظاہر کیا ہے:۔

در فصاحت چو امرءالقیسم	در بلاغت چنانکہ سحبانم
گر تناسخ رواست من بندہ	روح مسعود سعد سلمانم
اگرای باد بگذری بعراق	باز گو حال من بیارانم
در زمین سیاہ ہند کنون	ہمچو یوسف بچاہ کنعانم

ایک قصیدہ بہت ہی دلچسپ ہے جس میں پہلے تو ایک نصرا نامی شخص کی ہجو کی گئی ہے:۔

بظاہر صورتش ہندی لباس است	بمعنی سیرتش ایران شعار است

---

[1] عدد، ۳۶۰ شعر۔

پھر گجرات کے معشوقوں اور خاص کر ہندو حسینوں کی توصیف کرکے ایک شہیدی نام کے آدمی کا ذکر کیا ہے جو کسی کے عشق میں پڑ کر بدحال ہو گیا تھا :-

گجرات آرزو با خود میبر دل | کہ آنجا دلربا بیش از شمار است
شہیدی را شنیدی حال چون شد | کہ آن قصہ محل اعتبار است

آخر میں سورت کے باوفا لوگوں کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ کیوں انھوں نے اسے اپنا مسکن بنایا تھا :-

مقرمن از آن شد شہر سورت | کہ دانستم کہ این دار القرار است
جمال اینجا ندارد باوفا جنگ | صباحت با ملاحت نیز یار است

آخر میں غزلوں[۱] کی باری آتی ہے جن کا آغاز بانکی پور والے دیوان کے شعر سے ہوتا ہے۔ حافظ[۲] کا ہر غزل گو مداح ہے اور صوفی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں :-

رفتن بطرف میکدہ پاسا زم آرزوست | دیوان حافظ شیراز م آرزوست

نیز ان کو اپنی شاعری پر ناز ہے :-

نقش است نظم بندہ محمد بحون دل | بر صفحۂ زمانہ بس این یادگار ما

صوفی بڑے پختہ مگر کم گو شاعر تھے۔ ان کے اشعار زیادہ تر رواں اور سلیس ہیں۔ نیز بعض اشعار بہت بلند اور قابل ذکر ہیں :-

نمی دانم من این ارض و سما را | نہ خود را می شناسم نی خدا را
مطرب بگو کہ پردۂ این متقی شکست | ساقی بدہ کہ توبۂ این پارسا شکست
تا فلک خاک این زمینم کرد | با مہ و مشتری قرینم کرد
بیا تا ساکن میخانہ باشیم | حریف ساغر و پیمانہ باشیم

مؤلف بتخانہ کے قول کے مطابق صوفی کے اس دیوان میں جو اس وقت لوگوں میں رائج تھا

---

[۱] ۲۱۷ شعر۔ [۲] وفات : ۷۹۱ ہجری ، ۱۳۸۹ عیسوی۔

پندرہ سو شعر تھے لیکن اس کے علاوہ تین ہزار متفرق شعر بھی تھے تقی اوحدی نے بھی ان کے اشعار کو
پندرہ سو کے لگ بھگ بتایا ہے۔

فہرست مآخذ

ملا محمد صوفی مازندرانی : مجموعۂ ملا محمد صوفی، نسخۂ خطی شمارہ ۵۶-۱۲۳/۷، نیشنل میوزیم، نئی دہلی
محمد صالح کنبو : شاہجہاں نامہ، مجلس ترقی ادب، لاہور
مرزا محمد علی کاتب : تذکرۂ کاتب، نسخۂ خطی شمارہ ۲۳۲۰، رضا لائبریری، رام پور۔
احمد علی ہاشمی : مخزن الغرائب، نسخۂ خطی شمارہ ۷۱۳، خدا بخش لائبریری، بانکی پور
غلام علی آزاد : ید بیضا، نسخۂ خطی شمارہ ۶۹۱، خدا بخش لائبریری، بانکی پور
سراج الدین علی خان آرزو : مجمع النفائس، نسخۂ خطی شمارہ ۶۹۶، خدا بخش لائبریری، بانکی پور
لطف علی بیگ آذر : آتشکدۂ آذر، مطبع فتح الکریم (۱۲۹۹ ہجری)
تقی اوحدی : عرفات عاشقین، نسخۂ خطی شمارہ ۵۳۲۴، کتاب خانہ ملک، تہران
ملا عبد النبی فخر الزمانی قزوینی : میخانہ، کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۲۶ء
: تذکرۃ الشعرا، نسخۂ خطی ۲۳۹۱ (مصنف نامعلوم)، رضا لائبریری، رامپور
مولوی مظفر حسین صبا : روز روشن، مطبع شاہجہانی بھوپال
معتمد خاں : اقبال نامۂ جہانگیری، کلکتہ، ۱۸۶۵ء
امین احمد رازی : ہفت اقلیم، نسخۂ خطی شمارہ ۸۹۸، نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی
رضا قلی خاں ہدایت : مجمع الفصحا، مطبع میر باقر، ۱۲۹۵ ہجری

Abdul Muqtadir : Catalogue of Arabic and Persian Manuscripts in the Oriental Public Library at Bankipur, Baptist Mission Press, Calcutta.

Thomas William Beale : The Oriental Biographical Dictionary, Calcutta, 1881.

غزل

جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی

انساں سے ہیں بلند شجر بولتے نہیں
دیتے ہیں سایہ اور ثمر بولتے نہیں

ہو جاتے ہیں جو اہلِ خبر بولتے نہیں
سب کچھ وہ جانتے ہیں مگر بولتے نہیں

آنکھوں سے کام لیتے ہیں اکثر زبان کا
دیکھا یہی کہ اہلِ نظر بولتے نہیں

آثارِ صبحِ نو تو ہویدا ہیں ہر طرف
لیکن یہ کیوں طیورِ سحر بولتے نہیں

لاف و گزاف بے عملی کی دلیل ہے
ہوتے ہیں کام کے جو بشر بولتے نہیں

کرنیں نہ کہیے ان کو ضیائیں ہیں نور کی
یہ کیا کہا کہ شمس و قمر بولتے نہیں

کھل جائیں مفلسوں کی زبانیں تو کیا عجب
جب مفلسوں سے صاحبِ زر بولتے نہیں

کوئی بھی منہ لگے تو نہیں کھولتے ہیں منہ
ہر بزم میں تو اہلِ ہنر بولتے نہیں

بے مائیگیٔ امنؔ کا کھلتا نہ کچھ بھرم
محفل میں بیٹھے رہتے اگر بولتے نہیں

جگر کی شخصیت کے چند پہلو

جناب نواب سید شمس الحسن

داغ جگر کی اشاعت کے بعد میری موجودگی میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے میرے والد مرحوم شمس العلماء نواب سید علی حسن صاحب مرحوم سے جگر صاحب کے رنگ تغزل کی تعریف ان الفاظ میں کی کہ انھیں اس جدید شاعر سے ملنے اور ان کی زبان سے ان کا کلام سننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اور بعد کو سید صاحب موصوف نے جب انھیں "داغ جگر" کا ایک نسخہ لا کر دیا تو یہ اشتیاق ملاقات اور بھی بڑھ گیا۔ حالانکہ والد مرحوم آج کل کے شعرا سے کچھ زیادہ حسن ظن نہیں رکھتے تھے اور ہمیشہ مجھے یہ تاکید فرماتے رہتے تھے کہ صحیح مذاقِ شاعری پیدا کرنا ہے تو قدیم اساتذہ کے دیوان دیکھا کرو۔ اتفاق سے اس زمانہ میں جگر صاحب کا لکھنؤ آنا ہو گیا اور میرے ایک کرم فرما وصل بلگرامی مرحوم نے مجھے سب سے پہلے نیاز فتح پوری صاحب کے یہاں ایک مختصر اور مخصوص ادبی صحبت میں جگر صاحب سے ملنے اور ان کے کلام سننے کا موقع فراہم کر دیا۔ جگر صاحب کے دلکش کلام کو ان کے مخصوص انداز میں سن کر کچھ ایسا گہرا اثر ہوا کہ میں نے وہیں وصل صاحب سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ جگر صاحب کو دوسرے ہی روز ضرور میرے غریب خانہ "بھوپال ہاؤس" میں لائیں گے۔ میں مضطرب تھا کہ والد مرحوم سے ان سے جلد سے جلد تعارف کرا دوں اگرچہ جگر صاحب ایک رند مشرب اور میرے والد مرحوم بے حد ثقہ آدمی تھے، ایسی حالت میں مجھے شاید اس تعارف کی جسارت نہ ہوتی اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ انھیں جگر صاحب سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے اور علامہ سید سلیمان مرحوم ان کا غائبانہ تعارف بہت اچھے الفاظ میں کرا چکے ہیں۔ بہرحال حسب وعدہ وصل صاحب جگر صاحب کو لے کر دوسرے ہی دن میرے یہاں پہنچ گئے۔ گھر کے چھوٹے بڑے اس نئے شاعر کو سننے کے لئے جمع ہو گئے۔ جگر صاحب ہلکے سُروں میں تھے۔

عجب چہرہ پھر تو ہو گیا تھا جس پر دفعتاً چھا گیا ایک سکر کی حالت طاری تھی محسوس ہوتا تھا کہ در و دیوار سے شعلے پھوٹ رہے ہیں۔ ہر ایک کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے وہ مسحور ہو غزل ختم ہونے پر مجھے سنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جگر صاحب کا ایک ایک شعر رنگین ترین بنا ہوا تھا۔ پہلے جگر صاحب نے اپنی پہلی آمد پر جب پیلی بادامی میں کئی غزلیں سنائیں لیکن میں بھی مجبور ہوں اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو یہ غزل سب سے پہلے سنائی۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
خراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی ابل رہی ہے
چھلک رہی ہے، اچھل رہی ہے پیے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں
شباب رنگیں جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں
تمام رعنائیوں کے مظہر تمام رنگینیوں کے منظر
سنبھل سنبھل کر سمٹ سمٹ کر سب ایک مرکز پہ آ رہے ہیں
وہ روئے رنگیں وہ موجِ تبسم کہ جیسے دامانِ گل پہ شبنم
یہ گرمیِ حسن کا ہے عالم عرق عرق میں نہا رہے ہیں
یہ مست بلبل بہک رہی ہے قریبِ عارض چہک رہی ہے
گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے وہ دستِ رنگیں بڑھا رہے ہیں
یہ موجِ دریا یہ ریگِ صحرا یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں
بہار رنگ و شباب ہی کیا ستارہ و ماہتاب ہی کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں

خوشی سے لبریز شخص جہت ہے زباں پہ فقط تہنیت ہے
وقت وہ ہے جگر کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

جب یہ اشعار اپنے مست انداز میں سنا رہے تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے تمام فضا اسی رنگ میں ڈھل گئی ہے اور ہم میں سے ہر ایک کی روح ان کے نغموں میں تحلیل ہو گئی ہے۔ جگر صاحب کی اس پہلی ہی ملاقات نے والد مرحوم اور مجھے ان کا ایسا شیفتہ بنا دیا کہ جگر صاحب کچھ ہی دنوں کے بعد "بھوپال ہاؤس" ہی کے ہو کر رہ گئے۔ زاہداں خشک والد صاحب اور جگر صاحب کے ایسے قریبی روابط اور تعلقات کو دیکھ کر حیران تھے، بظاہر ہیں نگاہیں اس معنوی اشتراک کو نہ دیکھ سکیں جو ان دونوں کے اندر غیر مرئی طور پر موجود تھا۔ غرض کہ جس قدر زمانہ گزرتا گیا ہم لوگوں کے تعلقات جگر صاحب سے وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے۔ یہ موقع مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تعلقات کی نوعیت اور وسعت پر روشنی ڈال دی جائے تاکہ جگر صاحب کی زندگی کا ہر پہلو نمایاں ہو جائے۔ جگر صاحب کسی بڑی سی بڑی شخصیت سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے اور انھوں نے کسی کی امارت اور وجاہت ظاہری کے سامنے کبھی سر تسلیم خم نہیں کیا، یہاں تک کہ حیدرآباد، ٹونک اور بھوپال ایسی ریاستوں میں بھی انھوں نے اپنی آزادی اور خودداری کی شان کو بدرجۂ کمال برقرار رکھا۔ وہ اگر جھکے تو اسی کے سامنے جس میں انھوں نے علم و تقویٰ، بے پناہ خلوص اور کردار کی بلندی پائی اور اس معیار کو قائم رکھنے میں انھوں نے امیر غریب کی تفریق بھی روا نہ رکھی۔ میرے والد محترم کے متعلق ان کے تاثرات کا اندازہ ان کے خطوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ جگر صاحب مجھے اپنے خط مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۲ء میں لکھتے ہیں۔

"عزیز شمس۔ السلام علیکم۔ احساسات کا جواب احساسات ہی ہوا کرتے ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اس سے زیادہ کچھ کہوں تمھیں معلوم ہے کہ جناب نواب صاحب کے ساتھ مجھے کس قدر نسبت قربی حاصل ہے یقین کرو تم سے زیادہ میں نواب صاحب کے احساسات پاکیزہ کا رازدار ہوں۔ ہاں تم نے بہت ہی مرغوب کن مسئلہ پیش کیا ہے، میں اسے چھیڑنا نہیں چاہتا۔ گنہگار ہوں اور اللہ تعالیٰ کا فضل احسان ہے کہ خود کو گنہگار سمجھتا ہوں۔ میاں میں جبر کا قائل ہوں اور صورت جبر کا۔ لیکن اپنے گناہوں کو اپنے

[illegible] شلیخہ [illegible]

[illegible] جانتا ہوں — میں وہ ہوں تو نے ظالم جس کی آنکھ کی

میرے ایک بہت [illegible] اور عزیز دوست بھوپال آئے ہوئے ہیں۔ کاش تم یہاں ہوتے۔ میں اس حد تک ان [illegible] کر سکتا جس حد تک تم نے کیا ہے تاہم [illegible] مجھ کو ایک بہت لطف کا محسوس کرتا رہتا ہوں۔ [illegible] سن لو آہ۔

مثلاً کہیں آپ پچھتایئے گا۔ کبھی کوئی محسوس فرمایئے گا

نواب صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ تم نے میرا کوئی مصرع سن لیا ہے۔ میں نے کہہ دیا انشاء اللہ جلد اس کی بھی [illegible] جواب کا منتظر۔ بہت مخلص جگر"

ایک صاحب [illegible] صاحب ہیڈ ماسٹر مسلم اسکول بجنور نے والد صاحب مرحوم کے نام لکھا تھا اس سے جگر صاحب کے ان تاثرات کا اندازہ ہوتا ہے جو وہ ان کے متعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے خط مورخہ ۳ مئی ۱۹۳۶ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت جگر کے بارے میں کیا عرض کروں۔ مجھے جہاں تک اندازہ ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ میرا اندازہ قطعی صحیح ہے وہ یہ کہ حضرت جگر کو ہندوستان بھر میں صرف دو ہستیوں سے لگاؤ ہے الفت ہے عشق ہے۔ اس تعلق کو خواہ کسی لفظ سے تعبیر کیا جائے وہ صرف ان ہی دو بزرگوں سے ہے۔ باقی اوروں سے ان کی محض شناسائی ہے۔ ایک جناب والا سے اور دوسرے جناب اصغر سے۔ میں اس کیفیت قلبی کا اندازہ نہیں کر سکتا جو ان پر آپ کے تذکرے کے وقت گزرتی ہے۔ وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور بعض وقت ان [illegible]۔ وہ ان کلفتوں اور اذیتوں کا احساس کر کے جو ان سے آپ کو پہنچتی ہیں تقریباً بدیدہ ہو جاتے ہیں۔ پھر فوراً ہی جھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نواب صاحب قبلہ کو جو اذیتیں میں نے دی ہیں مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا اس لئے کہ ان کو مجھ سے بہت زیادہ محبت ہے۔ آپ خود اندازہ کریں ان الفاظ میں کون کون کیفیات قلبی مضمر ہیں"۔

ترک شراب کے سلسلے میں جگر صاحب اپنے سوانح حیات میں لکھتے ہیں:-

"شمس العلماء نواب علی حسن خاں صاحب مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ ان کی دو باتیں مجھے کبھی نہیں بھولتیں۔ جب شعرائے لکھنؤ کے بارے میں آزادانہ رائے کا اظہار کرتا تھا اس لئے کہ شعرا میں گروہ بندی سے مجھے نفرت ہے۔ ایک دن بہت شفقت سے مجھ سے فرمایا کہ جگر تمہیں جو کچھ کہنا ہو بھوپال ہاؤس میں کہا کرو۔ باہر کچھ نہ کہا کرو یہاں قتل تک ہو جاتے ہیں۔ ایک اور بات کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہے۔ میں بھوپال ہاؤس میں بہت بیمار تھا۔ ایک دن میرے پاس تشریف لائے اور بہت گلو گیر لہجے میں فرمایا جگر میرے بڑھاپے پر رحم کرو اور شراب ترک کر دو۔ مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اس زمانہ ہی میں میں نے ترک کر دی تھی۔"

یہ حقیقت ہے کہ میرے والد مرحوم کو جگر صاحب سے والہانہ محبت تھی اور جب تک جگر صاحب بھوپال ہاؤس سے باہر رہتے وہ بیتاب رہا کرتے تھے۔ جگر صاحب بھی ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ والد مرحوم نے مرض الموت میں ایک دن فرمایا کہ جب میں پلنگ پر لیٹا ہوں جگر صاحب کے اشعار بے ساختہ یاد آنے لگتے ہیں۔ اسی حالت میں کچھ دیر وہ جگر صاحب کے یہ اشعار بہت لطف کے ساتھ پڑھتے رہے۔

اسے حال و قال سے واسطہ نہ غرض مقام و قیام سے — جسے کوئی نسبت خاص ہو ترے حسن برق خرام سے
مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے — کبھی آ کے منظر عام پر کبھی ہٹ کے منظر عام سے
مجھے یوں نہ خاک میں تو ملا میں اگرچہ ہوں ترا نقش پا — ترے جلوے جلوے کی ہے بقا مرے عشق نام بنام سے
تری چشم مست نے کیا کہوں کہ نظر نظر ہے فسوں فسوں — یہ تمام ہوش یہ سب جنوں اسی ایک گردش جام سے
مجھے چاہیے وہی ساقیا جو برس چلے جو چھلک چلے — ترے حسن شیشہ بدست سے تری چشم بادہ بجام سے

میرے والد مرحوم کا انتقال نومبر ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ چاند کے حساب سے یہ رمضان المبارک کا زمانہ تھا۔ اس وقت بدقسمتی سے جگر صاحب دورے پر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد جب وہ بھوپال ہاؤس پہنچے اس وقت ان کا جو حال تھا وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ جگر صاحب باتیں کرتے کرتے اس صوفہ کی کرسی سے لپٹ گئے جس پر عموماً والد مرحوم ہال میں بیٹھا کرتے تھے اور انہوں نے زار و قطار رونا شروع کیا۔ دیر تک ان کی حالت یہی

[illegible] بالم چلے گئے۔ اس طرح جب ان کے انتقال کو دو تین برس گذر گئے تھے میں نے اپنے چند اشعار [illegible] جگر صاحب کو دکھلائے۔ ایک شعر پر بہتر کا نشان لگا کر میری بیاض پر انھوں نے فوری طور پر لکھ دیا تھا "بستہ ذواب صاحب یاد آ گئے"۔ یہ صفحہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے [illegible] مرحوم نے [illegible] کلام انھیں بغرض نقد و تبصرہ دیا تھا۔ بدقسمتی سے وہ آج تک شائع نہیں ہو سکا۔

اس موقع پر اگر میں اپنے تذکرہ میں اپنے ذاتی تعلقات کو جو جگر صاحب کے ساتھ رہے مختصراً بیان کروں تو نامناسب نہ ہوگا۔ یہ ابتدا ہی میں بتا چکا ہوں کہ میری ملاقات جگر صاحب سے ۲۹ء میں کہاں اور کیسے ہوئی۔ جتنا وقت گذرتا گیا تعلقات میں اضافہ ہی ہوتا رہا، یہاں تک کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ جگر صاحب [illegible] کوئی الگ فرد ہیں۔ انھوں نے شعلۂ طور کی طبع اول میں جہاں اپنے چند [illegible] احباب مثلاً محمد [illegible] خاں صاحب [illegible] جلیل قدوائی صاحب وغیرہ کے متعلق اپنے دلی احساسات کا اظہار کیا تھا وہاں میرے متعلق بھی چند مخلصانہ اور ہمت افزا جملے تحریر فرمائے تھے۔ افسوس ہے کہ شعلۂ طور کا وہ پہلا اڈیشن میرے پاس موجود نہیں اور باوجود تلاش کہیں سے دستیاب نہ ہو سکا۔ بہرحال جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے اس عبارت میں جو مجھ سے متعلق تھی اس میں انھوں نے میرے شاعرانہ ذوق اور مشق سخن کا حوالہ دیتے ہوئے یہ مصرع لکھا تھا: "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"۔ جگر صاحب کی یہ دعا قبول ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو مگر انھوں نے مجھے قابل اعتنا سمجھا باعث ممنونیت ہے۔ جگر صاحب سے میرے تعلقات میں کبھی فرق نہیں پیدا ہوا اور شروع سے ایک سطح پر رہے۔ ان تعلقات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مجھے ان کے ذریعہ ادبی حلقے سے متعارف ہونے کا موقع ملا اور بعض اہم ادبی شخصیتوں سے قرب کا موقع ملا اور میرا گھر علمی مرکز کے ساتھ ساتھ ایک ادبی مرکز بن گیا۔

جگر صاحب نہ صرف خلوص کے پیکر تھے بلکہ بہت وضعدار بھی۔ ان کے قدردانوں کی کمی نہ تھی۔ بڑے بڑے صاحب حیثیت حضرات کی تمنا تھی کہ جگر صاحب ان کے مہمان ہو جائیں لیکن انھوں نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ گونڈہ آئیں تو بھوپال ہاؤس کے سوا کہیں قیام کریں۔ جب کبھی بھوپال جاتے تو میرے چھوٹے

بہنوئی سید مرتضیٰ علی مرحوم کی یہاں قیام کرتے ۔ میرے بھانجے شاہ تاج الدین نے بتایا کہ جب [illegible] [illegible] معلوم ہوا کہ جگر صاحب آرہے ہیں چنانچہ ہم لوگ اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں ریاست کے سربرآوردہ حضرات کا ہجوم تھا۔ ان لوگوں نے کسی رئیس کی یہاں ان کے قیام کا انتظام کیا تھا جب جگر صاحب ریل سے اترے تو ان کی نگاہ جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ سب کو چھوڑ کر بڑی شفقت کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جگر صاحب سے کہا کہ آپ میرے یہاں ٹھہرنا پسند کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ یقیناً میں تمہارے ہی یہاں ٹھہروں گا۔ جب استقبال کرنے والے حضرات نے ان کی متعینہ قیام گاہ پر چلنا چاہا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں شاہ تاج الدین سلمہ کے یہاں ٹھہروں گا۔ بھوپال ہاؤس کے کسی فرد خاندان کے ہوتے ہوئے اور کہیں نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے تو بھوپال ہاؤس کا کتا بھی عزیز ہے۔ انھوں نے اپنی وضعداری کو اس حد تک نبھایا کہ تقسیم کے بعد باوجود اس کے کہ میں پاکستان ہجرت کر کے چلا آیا اور بھوپال ہاؤس سوائے ایک حصہ مکان کے جس میں میرے برادر بزرگ نواب سید امیر حسن صاحب مرحوم بے سروسامانی اور پریشان حالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ شرنارتھیوں کا مسکن بن گیا تھا۔ جگر صاحب وہیں قیام کرتے رہے۔ اس وضعداری کی داستان میرے کرم فرما سید صدیق حسن صاحب آئی سی ایس کے الفاظ میں سن لیجئے۔ وہ اپنے مضمون بعنوان جگر، تحریر فرماتے ہیں۔

• جگر لکھنؤ آتے تو بھوپال ہاؤس میں ٹھہرا کرتے۔ ملک کے بٹوارے کے بعد بھوپال ہاؤس کے زیادہ تر افراد پاکستان چلے گئے اور اس کا بڑا حصہ سرکاری قبضہ میں آگیا۔ صرف ایک چھوٹی سی جگہ پسماندگان کے حصہ میں رہ گئی۔ کوئی تین سال کا ذکر ہے مجھے معلوم ہوا کہ جگر لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ بیمار ہیں اور بھوپال ہاؤس میں ٹھہرے ہیں۔ میں خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بھی آپ کی دوستی کا شرف رکھتا ہوں۔ غریب خانہ پر ٹھہریئے۔ کہنے لگے۔ میں اس گھر میں نہ جانے کب سے ٹھہرتا چلا آیا ہوں۔ یہاں سے چلا جاؤں گا تو ان حضرات کی دل شکنی ہوگی اور یہ میں کسی قیمت پر گوارہ نہیں کر سکتا۔ چونکہ ان کی طبیعت ان دنوں ناساز تھی میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ آرام و سکون سے رہیں۔ ان کو آمادہ کرنے کے لئے نہ جانے کتنی دلیلیں پیش کی گئیں، کس کس طرح سمجھایا گیا مگر وہ نہ مانے بالآخر اس پر راضی ہوئے کہ آئندہ جب آئیں گے

[illegible] صاحب کے یہاں یا میرے یہاں ٹھہرتے تھے :

[illegible] کے قیام کے بعد وہ سلسلۂ مشاعرہ کراچی آئے تو میرے یہاں قیام کیا۔ جگر صاحب مرحوم کو [illegible] میں رہتا ہوں۔ انھیں میرے حالات کا شدید احساس تھا۔ میں اس کرب کو بیان نہیں کر سکتا جس کا اظہار وہ اشارات اور کنایات میں کیا کرتے تھے۔ اتفاق سے جب میری بڑی لڑکی کا عقد ۱۹۵۹ء میں ہوا تو وہ یہاں آئے ہوئے تھے۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے تقریب میں شرکت کی بلکہ خود [illegible] ایک صاحب کو ساتھ لے کر بازار سے [illegible] گئے، اور جو بہت بہترین قیمتی چاندی کا سیٹ مل سکتا تھا لا کر بطور تحفہ لڑکی کے لئے دیا جو آج تک اس نے بطور یادگار کے کلیجے سے لگا رکھا ہے۔ بہرحال جب پندرہ بیس برس کی وہ لطیف اور دلنواز صحبتیں جو مجھے دوران قیام لکھنؤ میں میسر آئیں یاد کرتا ہوں تو خود جگر صاحب کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔

ذوقِ صحبت سازِ شوق جلوہ ساماں داشتم
یاد ایامے کہ منزل منزل جاناں داشتم

مختصر یہ کہ اصغر صاحب مرحوم و مغفور کے بعد جگر صاحب کا گہرا تعلق ہم لوگوں سے رہا۔ اصغر صاحب مرحوم اور والد مرحوم کی یہ انتہائی خواہش رہی کہ جگر صاحب رندی سے توبہ کرلیں۔ اس کوشش میں میری حقیر جد و جہد بھی شامل رہی۔ جگر صاحب جب حالت نشہ میں ہوتے تو وہ ان بزرگوں کے سامنے آنے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے۔ جس عہد کا ذکر کر رہا ہوں وہ جگر صاحب کے رندی کے شباب کا زمانہ تھا۔

جگر صاحب باہمہ رندی و مستی ایک مذہبی دل و دماغ کے انسان تھے اور انتہائی نشہ کی حالت میں بھی ان کی یہ خصوصیت جھلکتی رہتی تھی۔ انھوں نے اپنی رندی کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ وہ نشہ میں زار زار روتے یہاں تک کہ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا اور چلا اٹھتے تھے کہ "میرا خدا کیوں مجھ کو جلا نہیں دیتا"۔ ان کی شاعرانہ زندگی سے یہ صاف نظر آتا تھا کہ ان کی رندی "اضطراری تھی اختیاری نہ تھی"۔ ان کی زندگی پر بیک وقت دو اثرات کارفرما تھے۔ ایک تو ان کی عارفانہ افتاد طبیعت نیز وہ نسبت روحانی جو انھیں شاہ عبد الغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست اور اصغر صاحب گونڈوی کی ذات بابرکات سے بدرجہ کمال حاصل تھی۔ دوسرے وہ نازک علائق

جو کارساز حقیقی نے ان کی فطرت کو ودیعت کیے تھے۔ ان احساسات کے فروغ میں ان کے خاندانی
تباہی [illegible] ناکامیوں کو بہت دخل رہا اور وہ ایک صبر آزما کش مکش کے مصیبت کدے
مقصود ہے کہ انہیں اصغر صاحب نہ مل جاتے تو حالات جگر صاحب کو نہ جانے کہاں سے کہاں لے
جاتے۔ اصغر صاحب کو جگر صاحب سے والہانہ محبت تھی اور جگر صاحب کے دل میں اصغر صاحب کے
لئے بے پناہ عقیدت۔ جگر صاحب کی تعمیر شخصیت میں اصغر صاحب کی زندگی کا بہت بڑا حصہ ہے۔
ان اثرات کا احاطہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اصغر صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔
اصغر صاحب ایک بہت بڑے شاعر تو تھے ہی اور شاعری میں بھی ایک منفرد رنگ کے مالک لیکن
اس کے علاوہ وہ اپنے اندر بڑی روحانی عظمتیں رکھتے تھے۔ اصغر صاحب ایک صوفی باصفا تھے اگرچہ
انہوں نے اپنی روحانیت کو کبھی نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ عام نگاہوں سے خود کو چھپاتے رہے
بقول جگر صاحب۔

بقید ظرف مئے زندگی کا جوش رہا   کسی جبیں سے نہ ٹپکی کسی جبیں میں رہی

اصغر صاحب کی مجھ پر بے حد شفقت تھی اور آج تک ان کی شخصیت کے گہرے اثرات میرے
دل پر ہیں۔ بہرحال یہ موقع ان تفصیلات کا نہیں۔ مجھے جو بات لکھنا ہے وہ یہ کہ جگر صاحب کی
زندگی پر اصغر صاحب کی غیر معمولی شخصیت مکمل طور پر اثر انداز تھی۔ چنانچہ جگر صاحب۔ کہتے ہیں۔

نگاہ حضرت اصغر کی ہے ودیعت خاص   قرار بن کے جگر کے دل حزیں میں رہی

حریم حسن معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر   جو بیٹھو با ادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہو کر

یہ اشعار غمازی کر رہے ہیں کہ جگر صاحب کی نظر میں اصغر صاحب کا کیا مقام تھا۔ ایک بار خود جگر صاحب
نے یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ ایک صاحب جو مجھے اور اصغر صاحب کو خوب جانتے اور پہچانتے تھے
انہیں کئی دفعہ مجھے دیکھ کر اصغر صاحب کا شبہ ہوا اور وہ فرق محسوس نہ کر سکے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ
جگر صاحب اور اصغر صاحب کی شکل و صورت میں بین فرق تھا۔ شاید یہی واقعہ اس شعر کا محرک ہوا
جو جگر صاحب نے کہا ہے۔

[illegible] نگاہیں اٹھی جاتی ہیں   مری ہستی بھی کیا تیرا ہی عالم ہوتی جاتی ہے

یہ انتہائی اہل ہیں اس کی معنوی نسبت کا نتیجہ تھا جو انھیں اصغر صاحب کے ساتھ بدرجہ اتم حاصل تھی۔ اس بنا پر بعض ناواقف حضرات سمجھتے ہیں کہ جگر صاحب شاعری میں بھی اصغر صاحب کے شاگرد تھے۔ حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ

"سب ہیں ایک بادہ بے کیف کے پینے والے"

اصغر صاحب کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ یاد آگیا جس سے اصغر صاحب اور جگر صاحب کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔

اصغر صاحب لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور تھوڑے ہی فاصلہ پر میرے مکان سے ان کے عزیز دوست شفیق الدین صاحب مرحوم وکیل کا مکان تھا یہاں اصغر صاحب ٹھیرے ہوئے تھے۔ جگر صاحب عالم ہوش میں تھے مجھ سے کہنے لگے کہ اصغر صاحب آئے ہوئے ہیں۔ آیئے مل کر آئیں۔ چنانچہ میں اور جگر صاحب ٹہلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ تھوڑی دیر کے قیام کے بعد اصغر صاحب خود ہی میرے والد مرحوم سے ملاقات کے خیال سے واپسی میں ہم لوگوں کے ساتھ بھوپال ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ اثنائے راہ میں جگر صاحب نے یکایک اصغر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں کہا کہ اصغر صاحب کیا بات ہے میں اتنی دعائیں کرتا ہوں۔ آخر خدا میری دعا کیوں نہیں سنتا اور میری شراب کیوں چھوٹ نہیں جاتی"۔ اصغر صاحب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "یہ بات صحیح نہیں۔ تم دل کے ایک گوشہ سے دعا کرتے ہو۔ مکمل دعا کرو تو مکمل قبولیت بھی ہو۔ مکمل دعا یہ ہے کہ تم سر سے پاؤں تک دعا بن جاؤ۔ ناقص دعا کرتے ہو تو مکمل قبولیت کی توقع کیوں کرتے ہو"۔ خود بقول جگر صاحب۔

خام مجھو طلب و شوق کا اعجاز جگر   ہر نفس عشق میں جب تک نہ رگ جاں ہو جائے

جگر صاحب کے کردار کے متعلق اگر کچھ کہنا ہو تو یہ بڑے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جگر صاحب نے انسانی قدروں کا ہمیشہ احترام کیا۔ خوش اخلاقی، دردمندی، انکسار اور وضعداری ان سے کبھی جدا نہیں ہوئیں۔ نشہ میں بھی انھوں نے بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا ہر وقت

لحاظ رکھا۔ تعلقات میں بھی ان کی شاعری کی طرح آمد ہی آمد تھی آورد نہ تھی۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور ان کی خوش اخلاقی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ہر ایک سے اس طرح ملتے تھے کہ اسے یہ محسوس نہ ہو کہ وہ اس کو کسی دوسرے سے کم سمجھتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ باہمہ رندی انھوں نے ایسی محفلوں میں جہاں مردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع ہو کبھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی۔ وہ عورتوں کے معاملہ میں بہت محتاط تھے اور ایسی محفلوں سے بہت گھبراتے تھے جہاں خواتین کا اجتماع ہو۔ وہ اپنی افتاد طبیعت کے لحاظ سے قدامت پسند تھے اور عورتوں مردوں کے اختلاط کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے، اگرچہ بادل ناخواستہ ایسی محفلوں میں شرکت کر لیا کرتے تھے۔ عورتوں کی بے پردگی کا جب ذکر آجاتا تو وہ بہت دلچسپ بات کہا کرتے تھے کہ "ان ظالموں کو خبر نہیں۔ نگاہیں حسن کو چیر لیتی ہیں۔" جگر صاحب کی رندی کا جب زمانہ یاد آتا ہے تو سینکڑوں واقعات نظر کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔

جگر صاحب کے وہ احباب جنھیں نہ صرف ان کی شاعری سے محبت تھی بلکہ ان کی ذات سے بھی، ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ انھیں شغل شراب سے کیسے باز رکھا جائے۔ نئی نئی تدبیریں کرتے، مگر ناکام رہتے۔ یہ میرا ذاتی تاثر ہے کہ انھیں جب بھی طلب ہوتی تو غیب سے ایسا سامان ہوتا کہ جیسے قدرت ہی ان کو پلانے پر تلی ہوئی ہے۔ اگر ہم انھیں باتوں میں یا کسی اور تفریحی مشغلہ میں لگا دیتے تو خلاف توقع کوئی نہ کوئی ایسے "مہربان" آن ٹپکتے جو پورے یقین دلانے کے بعد ان کو لے جاتے اور ان کا کلام سننے کے معاوضہ میں شراب پلا کر جائے مقام پر چھوڑ جاتے۔ اکثر یہ اہتمام کیا جاتا کہ ان کے پاس کوئی روپیہ پیسہ نہ پہنچنے پائے مگر تہی دستی کے باوجود ان کی مطلوبہ چیز ان کو مل جاتی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ دن کا کافی وقت گذر چکا تھا اور کوئی "مہربان قسم کے صاحب" ان سے ملنے نہیں آئے تھے اور ان کی جیب بھی خالی تھی۔ ہم لوگ مطمئن تھے کہ آج کا دن تو خیریت سے کٹ جائے گا۔ پھر بھی انھیں چوکنا تھیں کہ وہ خود کہیں باہر نہ چلے جائیں۔ لیکن کیا دیکھتے ہیں کہ جگر صاحب تھوڑے ہی وقفہ کے بعد مست چلے آرہے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ آتشیں سیال کہاں سے مل گئی۔ پھاٹک کے باہر گئے نہیں جیب میں پیسہ تھا نہیں، پتہ

لگایا تو معلوم ہوا کہ جگر صاحب مکان کی فصیل پھلانگ کر میخانے پہنچے، اور وہاں ان کے کسی مہربان نے پہلے سے شراب خانہ میں روپیہ جمع کرا دیئے تھے کہ جگر صاحب آئیں تو انھیں ٹھرا دے دیا جائے وہ جب پی کر آتے تو عجیب انداز ہوتا تھا۔ شیروانی کا ندھے پر ایک طرف لٹکی ہوئی، ایک جیب شیروانی سے باہر اور دوسری جیب سے ایک بڑی بوتل پنیے دروں نیچے بروں سر لٹکائے جھانکتی نظر آتی۔ ٹوپی ترچھی لگائے اس میں سے پریشان بال ادھر ادھر بے ترتیبی کے ساتھ نکلے ہوئے۔ لب پر ندامت کے ساتھ فاتحانہ تبسم۔ آتے اور قدرے فاصلہ پر کھڑے ہو کر غور سے دیکھتے اور بے ساختہ کہہ اٹھتے۔ "شمس صاحب میں پی آیا"۔ ایک دن اسی حالت نشہ میں قرآن پاک کی یہ آیت شریف "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ" زور زور سے پڑھنا شروع کی اور بے تحاشا رونا شروع کر دیا۔ جب "حَرِيصٌ عَلَيْكُم" کا لفظ آتا تو چیخ چیخ اٹھتے۔ یہ تو خیر ان کی عام عادت تھی کہ جام اٹھانے سے پہلے بسم اللہ کہتے جگر صاحب کی رندی کیونکہ "اضطراری" تھی اس لئے انھوں نے اعتدال یا خاص اہتمام مے نوشی کو ہمیشہ اپنے مسلک رندی کے خلاف سمجھا۔ ان کا نظریۂ رندی یہ تھا کہ "بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے"۔ اور بقول ریاض خیر آبادی مرحوم وہ اس کے قائل تھے "جیسی پائی شراب پی لی"۔ بعض وقت ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ثاقب لکھنوی مرحوم کا یہ شعر یاد آ جاتا تھا۔

افراط مے کشی نے کیا مجھ کو جز و مے ساقی نے میری روح کو کھینچا شراب میں

جگر صاحب کی رندی کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ جب کثرت مے نوشی کی وجہ سے ان پر زوردار حملہ درد کا ہوتا تھا تو اس وقت بھی وہ ہراساں نہ ہوتے بلکہ ان میں ایک عجیب قسم کی خود اعتمادی جھلکتی نظر آتی تھی ایک دفعہ متواتر کئی روز تک مسلسل پینے کی وجہ سے ان کے سینے میں شدید درد کا دورہ پڑا اور ایسی حالت ہو گئی کہ مجھے رات ان پر گزرنی مشکل معلوم ہوتی تھی۔ میں تمام شب ان کے پاس رہا اور دعا کرتا رہا۔ اس وقت ان کے احساسات کی نزاکت کا یہ عالم تھا کہ ایک صاحب بغرض عیادت تھوڑے وقفہ کے لئے آ گئے تھے انھوں نے یہ دیکھ کر کہ جگر صاحب آنکھ بند کئے ہوئے ہیں۔ ایک رسالہ اٹھایا اور انھوں نے رسالہ کا ایک ورق الٹا تو اس کی خفیف صدا سے بھی دل پر چوٹ لگی اور بے ساختہ بول اٹھے کہ خدا کے واسطے اس کو رکھ دیجئے۔

اتنی شب میں انھوں نے عالمِ کرب میں بڑی معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہا کہ شمس صاحب میں بغیر توبہ کے مروں گا نہیں آپ اطمینان رکھیں۔" انھوں نے جس اعتماد اور یقین کے ساتھ ایسے حالات میں یہ فقرہ ادا کیا وہ آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ اور یہ کتنا سچا فقرہ تھا جو انھوں نے کہا تھا۔ اکثر یہ ہوا کہ جب وہ شراب منگاتے اور وہ بھی ٹھرّے قسم کی تو ہم لوگ کسی نوکر سے کہدیتے کہ اس میں پانی ملادو تاکہ کچھ تو اس کی تیزی کا اثر کم ہو جائے لیکن وہ منہ لگاتے ہی پہچان جاتے۔ سخت برہم ہوتے اور بے ساختہ کہتے کہ یہ شراب کے ساتھ شرک ہے۔" ایک اور واقعہ جو کراچی پولیس کے انسپکٹر عزیزی محمد علیم خاں نے بیان کیا قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب وہ لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھے اور ان کا آنا جانا بھوپال ؤہی میں تھا ان دنوں میں ایک بار وہاں گیا تو گھر کے اور لڑکوں کے ساتھ وہ بھی جگر صاحب کے پاس گئے۔ جگر صاحب مست و سرشار چارپائی پر گھر کے صحن میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں قاری احمد علی صاحب (ابن علیجی محمد اصطفیٰ خاں صاحب مرحوم) ان سے ملنے آگئے۔ جگر صاحب نے اسی عالمِ مستی میں ان سے قرآن شریف کی کوئی آیت سنانے کی فرمائش کی۔ قاری احمد علی صاحب نے یہ دیکھ کر کہ جگر صاحب دوسرے عالم میں ہیں خوش اسلوبی سے یہ فرمائش ٹالنا چاہی مگر جگر صاحب بری طرح مصر ہوئے تو انھوں نے سورہ رحمٰن کی تلاوت شروع کردی۔ بس آیاتِ قرانی کا سننا تھا کہ جگر صاحب تڑپ کر پلنگ سے اتر کر زمین پر سربسجدہ ہو گئے اور ہچکیوں سے رونے لگے۔ ختمِ تلاوت کے بعد بھی دیر تک سجدہ ہی میں پڑے رہے جب سر اٹھایا تو آنکھیں روتے روتے سرخ تھیں اس کے بعد انھوں نے قاری احمد علی صاحب سے کہا کہ جو میں کہہ رہا ہوں لکھ لو۔ انھوں نے کہا کہ فرمایئے۔ میں لکھ لوں گا۔ جگر صاحب نے کہا کہ نہیں ابھی قلم نکالو اور کاغذ پر لکھو۔ چنانچہ انھوں نے کاغذ اور قلم نکالا تو جگر صاحب نے کہا کہ لکھو۔

"جو شے حاصل ہو جائے وہ بت ہے اور جو نہ ملے وہ خدا ہے۔"

بہرحال جب وہ پیتے تو کئی کئی روز متواتر پیتے رہتے۔ بہ مشکل کسی وقت ان کے منہ میں غذا جاتی ایسے وقت میں قدیم ملازم "اللہ رکھو" جس کی وہ اکثر چھپ کر وقت بے وقت اعانت کرتے رہتے تھے جگر صاحب کو بڑی خوشامد سے میز پر بٹھاتا تو وہ اس کو بھی زبردستی اپنے ساتھ میز پر بٹھاتے وہ ان کو

نوالہ بنا بنا کر کھلاتا تو کبھی جگر صاحب خود اس کو کھلانے لگتے۔ اس دور میں جبکہ انھیں خود شراب کے لئے ہر وقت پیسہ کی ضرورت ہوتی اگر کوئی پریشان حال آجاتا خواہ ان کا جاننے والا ہو یا نہ ہو تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا بہت خاموشی سے دے دیتے اور خود ان کے پاس نہ ہوتا تو دلوا دیتے۔ ایسے وقت اضطراب اور دردمندی کی وہ ایسی تصویر بن جاتے جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی بارہا ایسا بھی ہوا کہ ان سے کہا گیا کہ یہ شخص جو سوالی ہے۔ آپ کی مروت اور شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کی مدد کہاں تک درست ہے۔ مگر وہ یہی کہتے کہ جو کچھ بھی ہو میں اس کی دل شکنی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ ایک تلخ اور تکلیف دہ حقیقت ہے کہ حالت رندی میں لوگوں نے ان کے ساتھ "دوستی" اور "قدردانی" کے پردہ میں بہت ظلم کئے ناجائز فوائد اٹھائے اور طرح طرح سے انھیں نقصانات پہنچائے واقعی اس دنیا میں سچے دوست کتنے نایاب ہیں۔ وہ تو یہ کہیئے کہ ان کا حافظہ بہت قوی تھا ورنہ بہت سا کلام ضائع ہو چکا ہوتا کیونکہ اکثر ان کی بیاضیں بھی یار لوگ اڑا دیا کرتے تھے۔ اگرچہ زیادہ حصہ کلام ان کا دستبرد سے بچ گیا۔ پھر بھی بہت سا ابتدائی کلام ان کا ضائع ہو گیا چنانچہ جگر صاحب اپنی خود نوشت میں تحریر کرتے ہیں کہ "میری زندگی کا ہر ہر شعبہ سخت پریشان اور کج مج واقعہ ہوا ہے۔ خدا جانے کس قدر سرمایۂ کلام ضائع ہو گیا اور کس قدر اغیار نے فائدہ اٹھایا"۔ اس کے علاوہ وہ لکھتے ہیں کہ "شعر و ادب کے متعلق نثر میں متعدد طویل و مختصر مضامین جو میرے ذاتی تفکر و تدبر کا نتیجہ تھے افسوس کہ ضائع ہو گئے" بہرحال جگر صاحب کی مروت اور نزاکت احساس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے۔ جو انھوں نے خود مجھے سنایا تھا کہ کسی شہر میں (نام یاد نہیں) ایک مشاعرہ تھا۔ میں اس وقت تک اتنا روشناس نہیں ہوا تھا جتنا اب ہوں۔ میں مشاعرہ میں موجود تھا۔ ایک صاحب نے جو مجھ سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھے انھوں نے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ میری ہی ایک غزل اپنی کہہ کر سنانا شروع کر دی۔ میں ان کا منہ دیکھنے لگا لیکن میں نے نہ اس وقت اور نہ ختم مشاعرہ کے بعد ان سے ایک لفظ اس کے بارے میں کہا کہ مبادا انھیں تکلیف ہو اور میری وجہ سے ندامت"۔ جگر صاحب موجودہ معاشرہ کا یہ رنگ دیکھتے تو ان کے احساسات پر بہت چوٹ لگتی۔ وہ اپنے کو عالم مستی میں اور بھی ڈبو دیتے۔

حرم و دیر میں رند دل کا ٹھکانا ہی نہ تھا　　وہ تو یہ کہیے اماں مل گئی میخانے میں　(جگر)

جگر صاحب کے اخلاقی کردار کی بلندی بہت کم چند ہی لوگوں میں دیکھی ہے۔ انھوں نے گناہ کو گناہ سمجھا اور اپنی خوبیوں پر کبھی ناز نہیں کیا۔ وہ ہر تصنع اور تکلف سے بالا تھے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی مقبولیت کے باوجود اپنی انفرادیت کی آڑ میں اپنے ہم عصر شعرا سے کبھی نفرت نہیں کی اور نہ ان کی تحقیر بلکہ ہمیشہ ان کی یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ ہر طرح ان کی دلجوئی اور ہمت افزائی کریں۔ طبیعت میں مزاح تھا اس لئے کبھی بے تکلف دوستوں میں کوئی بات ایسی کہہ دیں وہ الگ بات ہے ورنہ کبھی کسی شاعر کی ذرا سی تحقیر برداشت نہیں کر سکتے تھے ان کی یہ روش اپنے دوستوں کے ساتھ ہی نہ تھی بلکہ ان لوگوں کے ساتھ بھی تھی جو ان سے ادبی چشمک رکھتے تھے۔ اور ان کی مقبولیت دیکھ کر جی ہی جی میں کڑھتے رہتے تھے۔

جگر صاحب کے دورِ رندی میں ایسے وقفے بھی آتے رہتے (اگرچہ وہ دیرپا نہ ہوتے تھے) جب وہ ترک مے نوشی کرتے۔ ان کے ایسے ہی وقت کی وہ مشہور عام غزل مسلسل ہے جو "شکست توبہ" کے نام سے موسوم ہے۔ غزل کی رنگینی کے ساتھ اس میں تسلسل سے ترک توبہ کی نفسیاتی کیفیات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے جس سے جگر صاحب کی شخصیت اور تاثرات رندی کے ارتقائی منازل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

مقام توبہ پہ مستقل طور پر پہنچنے سے پہلے ہی ان کے اشعار میں ایسے آثار ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رندانہ زندگی کے ناخوشگوار اثرات کو شدت سے محسوس کرنے لگے ہیں اور وہ کسی تازہ تغیر کے منتظر ہیں۔

ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف باصرار　　وہ جرعہ بھی زہراب ہے معلوم نہیں کیوں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر　　میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

یہ پوری غزل ان کے ذہنی انقلاب کی نشان دہی کر رہی ہے۔ اگرچہ اس وقت ان کا شعور بتلانے سے قاصر ہی کیوں نہ رہا ہو کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ مگر جگر صاحب کا دورِ رندی اصغر صاحب کے انتقال کے بعد ختم ہو گیا۔ اور اصغر صاحب کا یہ قول پورا ہو کر رہا کہ "جگر چاہے جہاں پھرتے رہو تمھیں لوٹ کر

یہیں آ تا پڑے گا" یہ جملہ ایسا صحیح اور جامع تھا کہ ایک طرف وہ "تجدید ملاقات" پر منتہی ہوا اور دوسری طرف ترکِ زندگی پر۔ جگر صاحب اپنی منزلِ اصلی کی طرف ایسے واپس ہوئے کہ پھر قدم نہ ہٹے۔

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں (جگر)

اٹھا چکا ہے بہت نازِ بادہ و ساغر
شکستِ نشہ سے اب لذتِ شراب اٹھا (")

جگر وہی جگر تھے۔ مگر ایک نئے لباس میں۔ شورش وہی تھی مگر اک موجِ تہ نشین کی صورت میں، بیخودی وہی تھی مگر خودی کے ہوش کے ساتھ۔ پہلے وہ زندگی کو خراج دے رہے تھے۔ اب زندگی ان کو خراج دے رہی تھی۔ پہلے سوسائٹی ان کا احتساب کر رہی تھی اب وہ سوسائٹی کا احتساب کر رہے تھے۔

ضمیر اور کردار کی ہم آہنگی، ظاہر و باطن کی یک رنگی، مافی الضمیر کا بے لاگ اظہار یہ ہمہ جہتی صداقت جگر کے کیرکٹر کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات کو منافقت کے پردے میں چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی، جو محسوس کیا وہ بانگ دہل کہا اور جو کہا وہ ان کے اندرونی احساس کا صحیح اور سچا اظہار تھا۔ (سید صدیق حسن مرحوم)

اپنے سے بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کا لحاظ کرنے میں جگر اپنی نظیر آپ تھے، کسی بزرگ کے سامنے گھنٹوں سر جھکائے مودب بیٹھے رہنا انھیں ہرگز گراں نہ گزرتا تھا اپنے سے کسی بہت ہی چھوٹے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو جانا اور آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرنا ان کا خاص شیوہ تھا، بچوں سے گھل مل کر باتیں کرنا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ جذب و کیفیت کے انسان تھے اور معمولی سے معمولی واقعہ سے بھی بہت جلد متاثر ہو جاتے اور اس حالت میں ان کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگتی اور وہ اکثر سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیتے۔

(وجاہت علی سندیلوی)

پریم چند کے کچھ نسوانی کردار

محترمہ صالحہ عابد حسین

منشی پریم چند ہمارے ان اِنے گِنے ادیبوں میں ہیں جن کا اردو ادب ہمیشہ مرہونِ منت رہیگا اور جن کی دلکش و دلگداز تخلیقات ادب کا بیش بہا سرمایہ اور صاحبانِ ذوق کے لئے سرمۂ نگاہ رہیگی۔

پریم چند کے اصلیت سے بھرپور زندگی کے مرقعے، ان کا دلنشیں اندازِ بیان، نبضِ حیات پران کی گرفت، انسانی جذبات کے اتار چڑھاؤ کی تصویر کشی ان کے فن کی خصوصیات ہیں اور ہم سب سے بڑھ کر ان کا بے پایاں خلوص جوان کے ہر ہر فن پارے میں جاری وساری ہے کہ ادب میں دوسرے فنی کمالات کتنے ہی موجود ہوں اگر اس میں خلوص نہیں تو وہ ایسا حسین جسم ہے جو روح سے خالی ہو۔

پریم چند کی مقبولیت کا ایک بڑا راز ان کی سیرت نگاری کی قدرت میں چھپا ہوا ہے۔ ان کے کردار سادگی و پرکاری کے نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ فن کے اعلیٰ معیار پر پورے نہ اترتے ہوں (جیسا کہ بعض نقادانِ فن فرماتے ہیں) لیکن زندگی کی کسوٹی پر ضرور پورے اترتے ہیں۔ زندہ انسانوں کی طرح ان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کمزوریاں بھی، ان میں گرنے کی صلاحیت بھی ہے اور ابھرنے اور سنورنے کی بھی (پریم چند کا انسان کی بنیادی نیکی اور شرافت پر ایمان ہے اور اس لئے ان کے کردار اکثر گر کر بھی ابھرتے نظر آتے ہیں)، یہ ایسے جیتے جاگتے انسان ہیں جن کے ساتھ ہم ہنس بھی سکتے ہیں اور رو بھی سکتے ہیں۔ جن کی خوشی میں خوش اور دکھ میں دکھی ہوتے ہیں۔ ناول میں کردار نگاری سب سے مشکل کام ہے۔ قصے کے افراد کے اخلاق تہذیبی ماحول، عمر، علم، تجربہ، ذہنی معیار کے مطابق اس کی سیرت کی تشکیل کرنا، اس کے رہن سہن، بول چال سوچنے کا انداز، کام کرنے کے طریقے ایسے ہی دکھانا جو اصلی زندگی میں ایسی صورت میں (کم و بیش) نظر آتے ہیں۔ بڑا کٹھن مرحلہ ہے فن کار کا قلم ذرا سا اس پل صراط سے ڈگا اور اس کا بھرم کھلا۔ پریم چند کی کردار نگاری

ہیں اسی معیار پر بڑی حد تک پوری اترتی نظر آتی ہے۔ بلکہ اکثر ان کے یہ جیتے جاگتے کردار، زندگی کے بے رنگ اور سپاٹ انسانوں سے زیادہ دلکش اور متاثر کرنے والے ہوتے ہیں کہ فن کار نے ان بے رنگ تصویروں میں اپنے جگر کے لہو سے اکثر بڑے سندر اور شوخ رنگ بھر کر ان میں عجیب حسن پیدا کر دیا ہے۔

پریم چند نے ادب کو بہت سے بھرپور حسین کردار دیے ہیں جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ پریم چند نے مردوں سے بھی زیادہ پر اثر اور دل کش کردار عورتوں کے پیش کیے ہیں۔

ایک بار میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ادب میں جب تک عورت ادیب نے اپنی جگہ نہیں بنائی تھی اردو ادب میں عورت کی بڑی بھونڈی اور غیر فطری تصویر کشی ہوتی رہی۔ ہاں حالی اور پریم چند دو منفرد فن کار ہیں جنھوں نے عورت کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے اور سچائی اور عقیدت کے ساتھ اسے ادب میں جگہ دینے کی کامیاب کوشش کی۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہر شاعر و ادیب نے عورت کو بُرا ہی دکھایا ہے۔ نہیں اسے حسن کی مورتی، خوبیوں کی دیوی، جنت کی حور، پرستان کی پری بھی بنایا گیا ہے اور شیطان و بدترین خلائق بھی دکھایا گیا ہے (اگرچہ آخر الذکر کے روپ میں زیادہ پیش کیا گیا ہے) مگر اس کا اصلی روپ دیکھنے، اس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنے، اس کے جذبات و احساسات کو سمجھنے اور اس کی اصلی کمزوریوں یا خوبیوں کو پرکھنے کی یا تو کوشش نہیں کی گئی یا پھر سمجھ نہ پائے۔

نثری ادب میں صرف پریم چند کو یہ شرف حاصل ہے جس نے عورت کو خلوص سے سمجھنے کی کوشش کی اور محبت و احترام کے جذبات اس کی طرف سے اپنے دل میں محسوس کر کے سچائی سے اپنے فن پاروں میں اس کی سیرت و اخلاق کی نقشہ کشی کی ہے۔

پریم چند کے دل میں عورت کا سچا احترام ہے۔ وہ اُسے سماج میں اس کے شایانِ شان مقام دینا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت مرد کی نفس پرستی کا آلہ اور کام جوئیوں کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ خود انسانیت کا ایک حسین مظہر ہے۔ بے شک وہ عورت کو گھر کی جان سمجھتے ہیں۔ اس کا جہ دنیا کا سب سے بلند درجہ جانتے ہیں اور گھر کی جنت تعمیر کرنا عورت کے اولین فرائض میں گردانتے

ہیں لیکن ساتھ ہی وہ اسے انسانیت کا خادم، سماج کا ایک مفید فرد بھی کہتے ہیں بعض لوگوں کا کہنا کہ پریم چند کی آئیڈیل عورت مشرقی سادہ لوح عورت ہے جس کی دنیا صرف گھر اور بچوں تک محدود ہو لیکن میرے خیال میں یہ بات درست نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ پریم چند دیا، تیاگ، پریم، عفت و عصمت کو عورت کی جان سمجھتے ہیں مگر وہ اس میں خودداری، خود اعتمادی، استقلال بھی دیکھنا چاہتے ہیں جو مردوں کے دوش بدوش کارزارِ حیات میں اپنا حصہ ادا کر سکتی ہے اور دیس و قوم کی خاطر قربانیاں کرنے کا حوصلہ رکھتی اور آزادی و سچائی کی جدوجہد میں اپنا پورا حصہ ادا کرتی ہے ـــ مگر اس عورت کا جلوہ آپ میرے لفظوں میں کیوں ..... خود پریم چند کے کرداروں میں دیکھئے نا۔

پریم چند نے متعدد ناول لکھے ہیں۔ کچھ ابتدائی مشق کے زمانے کے ہیں۔ کچھ جذباتی اور رومانی دور کی تخلیق ہیں، کچھ ایسے ہیں جن میں فن کار کا فن پختہ ہو کر پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ ہر بڑے فن کار کی طرح پریم چند کا فن بھی بتدریج ترقی کر کے نقطۂ عروج پر پہنچا ہے۔ ان کے ناولوں کے کرداروں میں ظاہر ہے کہ یہ فرق نظر آتا ہے۔ ہر کردار اس جیتے جاگتے انسان کو نہیں پہنچ سکتا جو ان کے بعد کے ناولوں میں جلوہ گر ہوا ہے لیکن ان کے ناولوں کے جتنے کرداروں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے کچھ نہ کچھ اثر ہمارے ذہن پر ہر ایک ہی چھوڑ جاتا ہے۔ ہاں ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کو بھلانا چاہیں بھی تو نہیں بھلا سکتے۔

پریم چند کے نسوانی کرداروں میں ہمیں ہر طبقے اور سماج کی عورت ملتی ہے۔ ان میں رانیاں بھی ہیں اور ٹھکرانیاں اور راجپوتنیاں بھی اور کہارنیاں، مہترانیاں، مامائیں، کاچھنیں، مزدورنیں بھی، شہر کی تتلیاں بھی اور گاؤں کی ناریاں بھی، محنت کش کسان عورتیں بھی اور عیش و نمود پر جان دینے والی مغرب پرست لیڈیاں بھی علم و عقل کی پتلیاں بھی اور ایثار و قربانی کی دیویاں بھی۔ اپنی آبرو پر جان نچھاور کر دینے والی سیتا ساوتریاں بھی اور اپنی لاج بیچنے والی کوٹھے والیاں بھی لیکن ان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مٹی کا مادھو، کاٹھ کی پتلی یا چینی کی گڑیا نہیں۔ ہر چہرے پر آپ زندگی کی کشمکش کی پرچھائیاں دیکھ سکتے ہیں، ہر سینے میں عورت کے دل کی دھڑکن سن سکتے ہیں۔

ہوا کہ حقیقت کی روح جھانکتی پاسکتے ہیں۔

پریم چند نے بہت سے ناول لکھے ہیں۔ بیوہ، غبن، گوشۂ عافیت، پردۂ مجاز، بازارِ حسن میدانِ عمل، گئودان وغیرہ۔ یہ سب کے سب کسی نہ کسی لحاظ سے مقصدی ناول کہے جاسکتے ہیں۔ ان میں سماجی خرابیوں کا پردہ چاک کیا گیا، معاشی اور اقتصادی ناانصافیوں کا پول کھولا گیا ہے، سیاسی کھیل فریب دکھائے گئے ہیں اور آزادی کی جد وجہد کی کہانیاں سنائی گئی ہیں، مزدور اور مل مالک، کسان اور زمیندار، حاکم اور محکوم کی کشمکش پیش کی گئی ہے۔ غرض زندگی میں جو کچھ بھی پریم چند نے دیکھا اور محسوس کیا سب کو اپنے فن میں قید کر لیا ہے۔

ان میں صرف چار ناولوں کی کچھ نسوانی کرداروں سے میں اس وقت آپ کا تعارف کرانا چاہتی ہوں۔

چوگانِ ہستی کی ہیروئن صوفیا کا کردار اگرچہ ایک خاص انداز کا ہے اور اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتا ہے مگر اس کی سب سے جاندار اور متاثر کرنے والی ہستی ہیرو کی ماں رانی جھانوی کی ہے جو پرانی راجپوتنیوں کا سا عزم وحوصلہ رکھتی ہے۔ اس کے دل میں قوم کا درد، دیس کی محبت اور آزادی کی تمنا خون بن کر دوڑتی ہے اور اپنے اکلوتے بیٹے ونے کو وہ سچا دیش پریمی، جنگ آزادی کا سپاہی جفاکش اور قوم پرور انسان بنانے کے لیے خود عیش وآرام کو تج کر سخت محنت وریاضت کی زندگی بسر کرتی ہے اور بیٹے کے دل میں وہی لگن پیدا کر دیتی ہے جو خود اس میں ہے۔ اس کے سینے میں بھی ماں کا دل ہے اور بیٹے سے گہری محبت ہے مگر مقصد کی محبت اس سے بھی بڑھ کر ہے کمزوریوں سے بھی وہ بھی مبرا نہیں، دوسری عورتوں کے مقابلے میں وہ تنگ دلی اور رشک کا شکار ہو جاتی ہے مگر یہ وقتی کمزوری ہے جن پر قابو بھی پا سکتی ہے۔ وہ صوفیا کو اپنی بہو بنانے پر کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو آمادہ کر لیتی ہے مگر جب ونے کو اس کی الفت میں وطن کی سیوا سے منہ موڑتے دیکھتی ہے تو بیٹے کی جان کی دشمن بن جاتی ہے لیکن آخر میں جب ونے غیرت کے جوش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے تو جھانوی انتہائی صدمے کے باوجود بیٹے کی خودداری اور غیرت کے جذبہ پر فخر وناز محسوس

کرتی، بڑے حوصلے سے غم کو جھیلتی اور مردہ بیٹے کا سر اپنے زانو پر رکھ کر قوم کے نوجوانوں سے یہ کہتی نظر آتی ہے: جاؤ اس دونے کی طرح قربان ہونا سیکھو" اصل میں رانی جھانسی آزادی کے ان لاکھوں پروانوں کی ماؤں کی نمائندہ کہی جا سکتی ہے جنھوں نے اپنے کلیجے کے ٹکڑے بڑے حوصلے کے ساتھ دیس کی آزادی پر قربان کر دئے۔

بازارِ حُسن میں پریم چند نے ایک ایسی لڑکی کی دردناک کہانی سنائی ہے جو سماج اور رواج کی بھینٹ چڑھ کر اپنی آبرو کا سودا کرنے لگتی ہے۔ سُمن ناز و نعم میں پلی حسینہ تھی جس کا ایماندار باپ بیٹی کی شادی اچھی طرح کرنے کی تمنا میں زندگی میں پہلی بار رشوت لیتا ہے اور پکڑا جاتا ہے۔ مذہبیت لڑکے والے سُمن سے نسبت چھٹا لیتے ہیں اور سُمن کا ماحول اسے ایک ایسے شخص سے بیاہ دیتا ہے جو کسی طرح اس کے قابل نہ تھا۔ سُمن اس ادھیڑ، مفلس، جاہل اور اکھڑ مزاج پتی سے نباہ کی بہت کوشش کرتی ہے۔ شوق اور ارمان کی عمر اور دنیا بھر کی ترغیبوں کے باوجود وہ زندگی کی کٹھنائیوں اور بے کیفیتوں کو جھیلتی ہے۔ شوہر بھی ابتدا میں اس کا بہت چونچلا کرتا ہے مگر کم آمدنی اور بیوی کا بے پناہ حُسن اُسے شکی بنا دیتا ہے اور پھر سُمن کی بے زاری اور سرکشی آپے سے باہر کر دیتی ہے۔ سُمن شوہر کے غیر ہمدردانہ رویہ سے دل برداشتہ ہو جاتی ہے۔ اور دوسروں کی پر آسائش زندگی، اس کا دامن کھینچتی ہے۔ اور اس زمانے میں اس کی ملاقات پڑوس میں رہنے والی طوائف بھولی بائی سے ہو جاتی ہے جو ہر طرح اس سے ہمدردی اور دلداری کرتی ہے۔ سُمن دیکھتی ہے کہ وہ مسرور اور خوش حال زندگی گزارتی ہے۔ اور شہر بھر کے رئیس اور معزز لوگ اس کے گھر آتے اور اس کی (بظاہر) عزت کرتے ہیں۔ ایک دن اپنی سہیلی کے ہاں سے دیر میں آنے پر اس کا پتی اس کی بے عزتی کرتا اور گھر سے نکال دیتا ہے تو خود دار سُمن کے دل پر سخت چرکا لگتا ہے اور کہیں پناہ نہ پا کر بھولی بائی کے دام میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ حالات سے مجبور ہو کر وہ کوٹھے پر بیٹھنے کی ذلیل حرکت تو کر بیٹھتی ہے لیکن پھر بھی یہ خود پرست، عیش پسند، مغرور حسینہ جس کے پاؤں پر سارا شہر ناک رگڑنے لگتا ہے اپنی لاج بچاتی اور ناچ گا کر پیسہ کماتی ہے، ذلت و بدنامی کی کٹھالی میں تپ کر اس کی سیرت کا میل کچیل

چھٹ جاتا ہے کہ وہ دوسری عورت بن گئی ہے اور موقع ملتے ہی وہ اس زندگی پر لعنت کر کے سیوا کی زندگی اپنا لیتی ہے۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس عورت سے قاری کو ذرا دیر کے لئے نفرت نہیں ہوتی بلکہ اس کی ہمدردیاں اس کے ساتھ رہتی ہیں ہاں نفرت اور غصہ پیدا ہوتا ہے اس سماج اور ان رواجوں پر جو معصوم لڑکیوں کو اس نرک میں گرنے پر مجبور کرتا ہے۔

میدانِ عمل میں پریم چند نے آزادی کی جدوجہد اور دیس کے جاں باز سپاہیوں کی زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں۔ ان میں سماج سے، رواج سے، حکومت کے پٹھوؤں سے، سرمایہ داروں سے ٹکر لینے والے مجاہدوں کی داستانیں بڑے پر اثر انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ ساتھ ہی گھریلو زندگی کی جیسی حقیقی اور دل کش جھلکیاں ہمیں اس ناول میں نظر آتی ہیں اور کہیں نہیں ملتیں۔ عورتوں کے کردار بھی زیادہ واضح، مضبوط اور جاندار ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی ایک منفرد شان رکھتا ہے اس میں ایک نہیں چار چار ایسے نسوانی کردار موجود ہیں جن کے بارے میں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ان میں سے سب سے دل کش شخصیت کونسی ہے۔

امرکانت کی بیوی سکھدا کا حوصلہ، جواں مردی اور نڈرتا دلوں کو مرعوب کر لیتی ہے ابتدا میں وہ ایک آرام طلب، عیش پسند، خود پرست اور سخت دل نازنین کے روپ میں نظر آتی ہے جو اپنے دیس کی مفلسی، غلامی، جہالت اور پست حالی سے بے خبر اور بے نیاز اپنے شیشے کے محل میں بیٹھی ہے۔ شوہر کو کاروبار اور گھرداری کے چکر میں پھنسا کر دیس کی خدمت کے "فضول" کام سے روکنا چاہتی ہے اور ابتدا میں کامیابی بھی ہوتی ہے۔ مگر امرکا آزاد دل اور دیس کی محبت کا گہرا جذبہ یہ بندھن توڑنے پر اُسے مجبور کر دیتا ہے اور وہ اُسے چھوڑ کر چل دیتا ہے اور پھر یہی سکھدا زندگی کی ٹھوس اور تلخ حقیقتوں سے دوچار ہو کر امر سے بھی زیادہ معیار پرست بن جاتی ہے۔ اس میں ظلم و ناانصافی سے ٹکرانے کا عزم بیدار ہو جاتا ہے اور غریبوں، مصیبت ماروں کی سیوا میں اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتی۔ وہ اپنے زر پرست سخت دل خسر سے ٹکر لیتی ہے مگر اس کی خدمت اور عزت کرنا بھی اپنا فرض جانتی ہے اور بڈھے سمرکانت جو

بیٹی گھر سے نکال سکتے ہیں بہو کے سامنے جھک جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سکھدا نئے زمانے کی وہ خوددار اور انا دخیال عورت ہے جو اپنی ذلت کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی رقیب سکینہ سے فراخدلی سے مل سکتی ہے مگر اپنے بے وفا شوہر کو معاف نہیں کر سکتی جس نے اس کی خودداری کو ٹھوکر ماری اور بے وفائی کی ہے۔ سکھدا کے روپ میں ہمیں نئے ہندوستان کی عورت کا جلوہ نظر آتا ہے جس کا اوپری خول بدل گیا ہے مگر روح ہندوستانی ہی ہے جس کا آدرش سیوا اور قربانی تھا اور ہے۔

اور پھر اس ناول میں امر کی چھوٹی سی کمزور سی بہن نینا ہے۔ بھائی بھاوج پر جان دینے والی باپ کے حکم پر خود کو بھینٹ چڑھا دینے والی، ایثار و تیاگ، صبر و رضا کی دیوی نینا جو پتی کے ظلم و ہوس کا شکار بن کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیتی ہے۔ پڑھنے والے کو اس کا دردناک روپ اس سماج اور طبقے سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جہاں نینا جیسی معصوم ہرنیاں منی رام جیسے بھیڑیوں کا شکار بنتی ہیں۔

منی کا کردار بھی نینا کی طرح ضمنی ہے مگر آدھے کے قریب ناول پر چھایا رہتا ہے۔ یہ دیہاتی گنوار عورت دو گوروں کی ہوس کا شکار بننے کے بعد صدمے سے پاگل ہو جاتی ہے اور اسی حالت میں انتقام کے طور پر دو اور گوروں کا خون کر ڈالتی ہے اور ٹریجیڈی یہ ہے کہ اس کے ہوش و حواس واپس آجاتے ہیں۔ وہ اپنے اس کارنامے کی بدولت شہر بھر کی ہیروئن بن جاتی ہے، عدالت سے باعزت بری ہونے اور عوام سے خراج عقیدت پانے کے باوجود شرم و درد کا احساس اس کے دل سے نہیں مٹ پاتا۔ وہ اپنے ننھے بچے تک کو پیار نہیں کرتی کہ اس کا باعفت دل اپنے ملوث ہاتھوں سے اس معصوم کو چھونے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ اپنے شوہر کو جو دل و جان سے اسے پھر اپنا لینے پر تیار ہے ترک کر دیتی ہے مگر جب اس غم میں شوہر اور بچہ دونوں دنیا چھوڑ جاتے ہیں تو وہ غم سے پاگل ہو کر دریا میں کود جاتی ہے اور پھر ایک چمار نوجوان کے ہاتھوں بچ کر، اچھوتوں میں رہ کر اچھوتوں کی سی زندگی اپنا کر زندگی کی ڈور پھر سے پکڑ لیتی ہے۔ وہ دوسروں کی سیوا میں اپنے دل کا درد ڈبو دیتی ہے۔ اور اس طرح زندگی میں لطف اور معنی پیدا کرتی ہے۔ وہ امر کی طرف مائل ضرور ہوتی ہے مگر اس میں نفسانی خواہشات نہیں چاہ ہے

اس کا یہ جذبہ فطری خواہش ہے۔ معیاری کرداروں کے مقابلے میں منی ہمیں زیادہ ٹھوس اور اصلی معلوم ہوتی ہے۔ وہ غم جاناں کو غم دوراں میں ڈبونے اور زندگی کی کٹھنائیوں کو ہنس کھیل کر جھیلنے کے سلیقے سے پایاں رکھتی ہے جو عین انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ آخر میں وہ بھی جدوجہد آزادی میں حصہ لیتی ہے اور اس طرح پریم چند اس کا مقام اور اونچا کر دیتے ہیں۔ بظاہر یہ بے جوڑ سی بات لگتی ہے لیکن اگر ہم اس زمانے کے حالات پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ آزادی اور حقوق کی لڑائی میں ہر طبقے، ہر حیثیت، ہر درجے کے لوگوں نے اپنا اپنا حصہ ادا کیا تھا، یہ وقت کا تقاضا تھا اور کوئی بھی حساس ذہن اس سے بچ نہیں سکتا تھا تو ہمیں یہ بات بالکل قرین قیاس لگتی ہے کہ منی اور سکینہ، اس کی بوڑھی دادی، اور سکھدا کی ماں سب ہی اس لڑائی میں شامل ہو سکتی ہیں۔

میدان عمل کا ایک اور اہم نسوانی کردار امر کی محبوبہ سکینہ کا ہے جس کی شخصیت کی شیرینی، نرمی محبت کی گہرائی، سادگی، معصومیت، اخلاص کی وجہ سے اس میں ایک عجیب کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ غریب یتیم لڑکی جو اپنی دادی کا اور اپنا پیٹ سلائی کے سہارے بھرتی ہے ایک بے کیف بنجر، کٹھن زندگی گزار رہی ہے کہ یکایک امر اس کی زندگی میں محبت کی جوت بن کر آ جاتا ہے۔ اور وہ دل و جان سے اس کی پرستش کرنے لگتی ہے۔ امر کی محبت کو وہ جس سادگی اور اعتماد سے قبول کر لیتی ہے اس کی سادہ دلی اور معصوم فطرت کی غمازی کرتا ہے۔ ایک موقع پر وہ سکھدا سے بڑی صفائی سے اعتراف کرتی نظر آتی ہے۔

"مجھے مردوں کو دیکھنے اور پرکھنے کے کافی موقعے ملے ہیں ـــــ سب ہی نے مجھے تفریح کی جنس سمجھا اور میری عزت سے اپنی ہوس پوری کرنی چاہی...... اگر کسی نے مجھے عزت اور اعتماد کی نظر سے دیکھا تو وہ بابوجی تھے...... یہ ان کا خلوص تھا جس نے میرے دل پر اپنا گہرا نقش جما لیا...... انھوں نے مجھے نکاح کی دعوت دی میں نے اسے منظور کر لیا..... اب جب تک وہ خود اس دعوت کو رد نہ کریں میں ان کی پابند ہوں......"

اس عزت اور اعتماد نے اس کے دل میں امر کی پرستش کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور جیسا کہ اس نے کہا تھا جب تک خود امر نے اپنے طرز عمل سے نکاح کی دعوت کو رد نہیں کیا سکینہ امر کا خیال سینے سے

لگائے زندگی کی کشمکش کو جھیلتی رہی لیکن جیسے ہی اس کو یہ اندازہ ہوا کہ اب وہ نہیں سکھرا امر کی محبوبہ بن چکی ہے دونوں میاں بیوی ایک خیال، ایک رائے، ایک دل ہو گئے ہیں وہ نہایت خاموشی اور شرافت سے اس کے راستے سے ہٹ جاتی ہے اور اپنے ایک دوسرے چاہنے والے کے نکاح کا پیام قبول کر لیتی ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اس سے سکینہ کی محبت اور کردار پر حرف آتا ہے۔ لیکن میں تو ایسا نہیں سمجھتی اس سے وہ اور زیادہ فطری بن جاتا ہے۔ ہمیں عام ہندوستانی گھروں میں محبت کی یہ بلند قسم (جس میں ازدواجی زندگی کسی اور کے ساتھ بسر کرنے کے باوجود محبوب کی پرستش دل کی گہرائیوں میں کی جاتی ہے) اکثر نظر آتی ہے۔

لیکن پریم چند کی کردار نگاری پورے عروج پر ان کے آخری اور بہترین ناول گئودان میں نظر آتی ہے۔ اس کے نسوانی کردار بھی اتنے بھرپور اور زندگی سے قریب ہیں جن پر اصلیت کا دھوکا ہی نہیں یقین سا ہونے لگتا ہے خاص کر دھنیا کا کردار یہ ناول دیہاتی اور شہری زندگی کے گوناگوں مرقعوں کا مجموعہ ہے۔ عورتیں بھی دونوں قسم کی ہیں جن میں مالتی، گوبندی اور دھنیا خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

مالتی مغربی تہذیب کی ساختہ پرداختہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ سوسائٹی کی تتلی، عیش و عشرت کی دلدادہ فیشن و نمائش کی پرستار لیڈی ڈاکٹر ہے جس پر شہر کی اونچی سوسائٹی کے مرد فدا نظر آتے ہیں۔ لیکن ہر پھول پر بیٹھنے والی یہ تتلی جب سچی محبت کی آنچ میں تپتی ہے تو اس کے چھپے جوہر ابھر کر سامنے آتے ہیں اور ایثار و خدمت کے سوتے اس کے دل میں پھوٹنے لگتے ہیں۔ ایک بار وہ اپنے مالی کے چیچک میں مبتلا بچے کی اس پیار، اس لگن، اس جانکاہی سے خدمت کرتی ہے جو خود اس کی ماں کے بس کی بات بھی نہ تھی وہ صرف بچے ہی کو موت کے منہ سے نہیں کھینچ لیتی بلکہ اپنے محبوب کا (جو اس سے بدگمان رہتا ہے) دل بھی جیت لیتی ہے۔ مگر اس کی شادی کی درخواست اس خوف سے قبول نہیں کرتی کہ مہتا کی آدرش عورت سیوا اور تیاگ کی مورتی ہے اور مالتی کو اندیشہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو شوہر کی شخصیت میں ضم نہیں کر سکے گی۔ ناول میں مالتی کی شخصیت دھیرے دھیرے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ابتدا میں اس کا روپ سوسائٹی گرلز کا سا ہے جس سے نفرت سی پیدا ہوتی ہے لیکن

بھالی مہتا کی محبت اور اس کی غیر محسوس اصلاحی کوششوں سے اثر قبول کرتی ہے اور جب اپنے دیس کے غریب اور مفلوک الحال لوگوں کو دیکھتی ہے تو روپیہ کمانے کی ہوس چھوڑ کر اپنے مقدس پیشے سے غریبوں کی سیوا کا کام لینے لگتی ہے۔ مہتا کے دل میں گوبندی کی عقیدت دیکھ کر وہ اس سے جلتی ہے کسی اور لڑکی کی طرف ذرا سا اسے مائل دیکھتی ہے تو رشک سے تپنے لگتی ہے (اسے پریم چند نے عورت کی اس کمزوری کو خوب سمجھا اور ہر جگہ دکھایا ہے) مگر اس کے آدرشوں سے گھبراتی اور عورت کو ماند بنا دیکھنے کو برا سمجھتی ہے پھر بھی غیر شعوری طور پر وہ مہتا کے رنگ میں رنگی چلی جاتی ہے۔ ایسا ٹائپ اصل زندگی میں بہت کم یاب ہے مگر ایسا نایاب بھی نہیں۔ ایسی فیشن زدہ مغرب پرست عورتیں جو اوپری چمک دمک سے چوندھیا جائیں سنبھلنے اور اپنے کو پہچاننے کے بعد اپنے اصلی جوہروں کو ابھارتی حقیقی زندگی میں اکا دکا ہی سہی دیکھی جا سکتی ہیں۔

گوبندی ایک لکھ پتی بزنس مین کی بیوی ہے۔ نازک احساسات، دردمند دل رکھنے والی خوش بیان شاعرہ جو نام و نمود سے گھبراتی، شہرت سے بھاگتی اور گھر اور بچوں کی سیوا اور پتی کی خدمت زندگی کا مقصد سمجھتی ہے۔ وہ اپنے بدزبان، منہ پھٹ، آوارہ مزاج شوہر کی جاں نثار اور وفادار بیوی ہے جو اس کا ہر ستم چپ چاپ سہہ لیتی ہے لیکن مالتی سے سخت رقابت رکھتی ہے۔ شوہر کو بھلانے بجھانے کے فرض کو اس کی گالی اور مار کے با وجود ادا کرتی رہتی ہے۔ ایک بار وہ اپنی تذلیل نہ سہہ کر صدمے اور غصے کی حالت میں گھر سے نکل جاتی ہے مگر رستے میں اسے مہتا ملتا ہے جو گوبندی سے بہت عقیدت رکھتا اور اسے عورت کا سب سے اعلیٰ نمونہ سمجھتا ہے۔ وہ اسے اسی انداز سے سراہتا ہے: "وہ ایک لکھ پتی کی بیوی ہے عیش و عشرت کو تچھ سمجھتی ہے، جو بے رخی اور بے عزتی سہ کر بھی اپنے فرض سے منہ نہیں موڑتی، جو ما دیت کی قربان گاہ پر خود کو چڑھاتی رہتی ہے، جس کے لئے ایثار ہی سب سے بڑا حق ہے۔ جو اس قابل ہے کہ اس کی مورت بنا کر پوجی جائے ..." اور پھر کہتا ہے "بھگوان نے بڑی ناانصافی کی کہ اس جیسی دوسری عورت نہیں بنائی۔" تو گوبندی بڑے درد کے ساتھ کہتی ہے "نہیں مہتا جی یہ آپ کا خیال ہے۔ ایسی عورتیں آپ کو جگہ جگہ ملیں گی۔" اور اس ایک جملے میں وہ ہندی عورت کی بے بسی اور تباہ حالی کی تصویر

کھینچ دیتی ہے۔ بالکل بظاہر رہتا کی تحریک مگر دراصل اپنے دل کی لگن سے مجبور ہو کر پھر اسی زندگی کو اپنا لیتی ہے جہاں ذلت ہے ظلم ہے، دکھ ہے! اور پھر جب کنتا دیوالیہ ہو کر پاگل سا ہو جاتا ہے تو گوبندی ہی کی بھی رفاقت و محبت اسے تباہی سے بچاتی ہے۔

آج کی دنیا میں ایثار و تیاگ کی ایسی مورتیاں جو ستم اور ظلم سہتی، ذلتیں اٹھاتیں اور کٹھور و بد باطن مردوں کو ناانصافی اور ظلم کے موقع فراہم کرتی ہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھی جائیں گی لیکن گوبندی ہندی عورت کا وہ درد ناک روپ ہے جو بقول خود گوبندی کے اب بھی جگہ جگہ مل سکتی ہیں۔

اور دھنیا تو اردو ادب کے ان گنے چنے کرداروں میں سے ہے جو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ کسی عورت میں جتنی ظاہری حسن و خوبی کی صفات ہو سکتی ہیں ان سے دھنیا عاری ہے حسن جوانی، خوش ادائی، خوش گفتاری کسی کی بھی تو مالک نہیں محنت کی ماری، مفلسی اور دکھوں کی ستائی حاکموں اور زمینداروں کے ظلم و جور کا شکار، سوکھی ماری بال بچوں والی ادھیڑ عمر کی دھنیا! ایسی عورت سے ناول میں کیا زندگی میں لوگوں کو دلچسپی شاید ہی ہوتی ہو۔ یہ فن کار کے موقلم کا جادو ہے جس نے اس عورت میں ایسے پُرکشش رنگ بھرے ہیں جو حساس دلوں اور سوچنے والے ذہنوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ یہ نہ کسی مہذب سوسائٹی بناوٹی تہذیب کی تتلی کا نمائشی حسن ہے نہ دیو گھر ہر چیز کو مرد کی آنکھ سے دیکھنے والی مرد کے دماغ سے سوچنے والی ہر ظلم و ستم سر جھکا کر سہنے والی دیوی کا جلوہ۔ دھنیا نہ مالتی ہے نہ گوبندی۔ بلکہ اس ہندوستانی عورت کا پُروقار اور پُرکشش روپ ہے جس کی آنکھوں میں ہندی عورت کی اصلی روح جھانکتی ہے۔

دھنیا کسان عورت کی طرح اپنے مردوں کے ساتھ کندھے سے کندھا جوڑ کر محنت کرتی ہے اور ساتھ ہی گھرداری کے سارے فرائض انجام دیتی اور کنبے کا بوجھ اٹھاتی ہے۔ وہ ہوری سے محبت بھی کرتی ہے اور لڑتی جھگڑتی بھی ہے مصیبت میں گلے گلے اس کا ساتھ دیتی ہے اور کمزوریوں پر اسے پھٹکارتی ہے۔ وہ ظلم و ستم کے وقت اس کی سپر بن جاتی ہے لیکن جب وہ اس پر زیادتی اور سختی کرے تو شمشیر برہنہ ہو جاتی ہے۔ وہ ہوری کی رفیقِ حیات اور شریکِ حیات سچے معنوں میں ہے مگر اس کا سایہ نہیں بلکہ اپنی ایک الگ شخصیت رکھتی ہے۔ ہوری متحمل مزاج، غم خوار، ظلم و حق تلفی پر صابر و شاکر

سہنے والے قسمت کا قائل، صدیوں کا کچلا ہوا کسان ہے جس کو اگر کبھی کبھار غصہ آتا بھی ہے تو صرف اپنی بیوی پر۔ دھنیا اس کے برعکس تیز مزاج، زبان دراز، نڈر، صاف گو عورت ہے جو نہ مالکوں سے ڈرتی ہے نہ کارندوں سے۔ گو کبھی دھنیا ہوری کے ہاتھ سے پٹ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ صدیوں سے اس کے دیس میں سماج نے مرد کو یہ حق دے رکھا ہے لیکن وہ اس سے دبتی نہیں۔ ہوری کے ہاتھوں کے ہتھیار کو وہ اپنی زبان کے دھاردار آلے سے کند کرنے کا گر جانتی ہے پھر بھی دونوں میں وہ گہرا پریم، وہ اٹل وشواس، وہ ہم آہنگی ہے جو صرف ایسی ہی ازدواجی زندگی کی دین ہوا کرتا ہے جہاں میاں بیوی ایک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔

دھنیا میں تنگ دلی بھی ہے وسعتِ قلب بھی، ممتا بھی اور غصہ بھی۔ وہ اپنے دیوروں کی احسان ناشناسی پر برگشتہ ہے مگر مصیبت پڑنے میں ان کی مدد کرتی ہے بیٹے پر جان دیتی ہے مگر بہو کے کہنے میں دیکھ کر اسی بیٹے سے جلنے لگتی ہے۔ جس بہو کو غصے میں دروازے سے دھتکارتی ہے پریشانی میں اسے چھاتی سے لگانے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ حالات سے مجبور ہو کر بیٹی کو ایک بڈھے سے بیاہنے پر رضامند ہو جاتی ہے مگر اس کا دل خون روتا رہتا ہے۔

دھنیا کا کردار دکھاتے وقت پریم چند عورت کے دل اور جذبات کے نازک ترین مقامات پر پہنچے نظر آتے ہیں۔ ادھیڑ دھنیا جو وقت سے پہلے بوڑھی ہو چکی ہے جوانوں سے زیادہ گہرا جذبۂ الفت دل میں نہاں رکھتی ہے۔ ہوری کو بے ہوش ہوتا دیکھ کر دھنیا اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے۔

" دھنیا اکھ کا گٹھا پٹک کر پاگلوں کی طرح دوڑی ہوئی ہوری کے پاس گئی اور اس کا سر اپنی جانگھ پر رکھ کر زور زور سے چلانے لگی۔ تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو — ہائے رام اب میں کس کی ہو کر رہوں گی۔ — کون مجھے دھنیا کہہ کر پکارے گا..... " لیکن ہوری کے ہوش آنے پر جب اس کا دوست دھنیا کو چھیڑتا ہے تو دھنیا نوجوان لڑکیوں کی طرح جھینپ جاتی ہے "

پریم چند کے ناولوں کے کرداروں کو پوری طرح سمجھنے کے لئے خود ان کے ناولوں کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت ہیں پریم چند ملک کے ان ادیبوں میں ہیں جو کل بھی مقبول تھا، آج بھی ہے اور مستقبل میں بھی پسند کیا جائے گا۔

(اس مضمون کا کچھ حصہ آل انڈیا ریڈیو، اردو مجلس سے نشر ہوا ہے)

کیا جمہوریت کا تجربہ ہندوستان میں کامیاب ہوا؟

ڈاکٹر سید عابد حسین

مشرقی دنیا میں جمہوری حکومت سب سے پہلے جاپان میں قائم ہوئی۔ اس وقت سے آج تک بہت سی جمہوری ریاستیں بنیں اور بگڑیں اور یہ بننے بگڑنے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ جاپان کے بعد مشرق میں ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں جمہوری حکومت کا نظام سترہ سال سے برابر قائم ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی قائم رہے گا۔

آیئے پہلے یہ سوچیں کہ جمہوریت میں کیا کیا باتیں ہونی ضروری ہیں۔ جب اس کا اطمینان ہو جائے گا کہ یہ باتیں سچ مچ ہمارے ہاں موجود ہیں تب ہی ہم یہ کہہ سکیں گے کہ ہم جمہوریت کے تجربے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد پھر ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہوگا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ جمہوریت کی دیوی ہمارے دیس میں رس بس گئی مگر دوسرے کئی دیسوں میں ابھی تک اکھڑی اکھڑی سی رہتی ہے۔

جمہوریت کی ایک بڑی مشہور تعریف ہے، عوام کی حکومت عوام کے ہاتھوں عوام کے فائدے کے لئے۔ پہلے پہل ایسا لگتا ہے کہ آخر ان شرطوں کی کیا ضرورت ہے صرف عوام کی حکومت کہہ دینا کافی ہے۔ بات یہ ہے اس کا دعویٰ تو آج کل قریب قریب سبھی ملک کرتے ہیں کہ ان کے ہاں عوام کی حکومت ہے۔ ان میں وہ دیس شامل ہیں۔ جہاں حکومت کے چناؤ کا حق ہر بالغ مرد اور عورت کو نہیں بلکہ تھوڑے سے اپنے گنے آدمیوں کو ہے، اور وہ بھی جن میں حکومت کے لئے صرف ایک پارٹی کے لوگ چنے جا سکتے ہیں۔ اس لئے یہ شرط لگانی پڑی کہ حکومت فقط نام کے لئے عوام کی نہ ہو بلکہ سچ مچ ان کے ہاتھوں میں ہو یعنی ان میں سے صرف چند آدمی نہیں بلکہ سب بالغ مرد عورت جسے اپنا بھلا برا سمجھتے ہیں جس خیال اور جس پارٹی کے لوگوں کو چاہیں اپنے اوپر حکومت کرنے کے لئے چن سکیں۔ اسی طرح ایسے دیس بھی

ہے یہاں حکومت تو عوام کی چنی ہوئی ہوتی ہے مگر رئیسوں، جاگیرداروں، دھن والوں کو غریبوں سے کہیں زیادہ حقوق حاصل ہوتے ہیں گویا حکومت انہیں پیسے والوں کے فائدے کے لئے چلائی جاتی ہے۔ اس لئے یہ شرط لگانا بھی ضروری ہو گیا کہ حکومت عوام کے فائدے کے لئے ہو۔ معلوم ہوا تینوں ہی شرطیں ضروری ہیں اور جس نے حکومت کی یہ تعریف کی ہے اس نے بڑی پتے کی بات کہی ہے۔

اچھا تو اب یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا ہندوستانی جمہوریت کی ان تینوں شرطوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں حکومت عوام کی ہے۔ اس لئے کہ اسے عوام نے چنا ہے، اور وہ بھی تھوڑے سے پیسے والے لوگوں نے نہیں بلکہ دیس کے سارے بالغ مردوں اور عورتوں نے جن میں جھونپڑیوں میں رہنے والے غریب بھی شامل ہیں۔ چنانچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ گویا حکومت کا کاروبار بھی عوام کے ہاتھوں میں ہے۔ اب رہی تیسری شرط کہ عوام کے فائدے کے لئے ہو تو آپ ہندوستان کا آئین یا سمودھان اٹھا کر دیکھئے۔ شروع ہی میں موٹے حرفوں میں لکھا نظر آئے گا کہ یہاں سب کے ساتھ انصاف ہوگا۔ سیاسی، سماجی اور معاشی انصاف۔ اور یہ صرف کاغذ پر لکھی ہوئی بات نہیں بلکہ واقعی یہ کوشش ہو رہی ہے کہ اونچ نیچ، غریبی اور امیری کے فرق کو مٹایا جائے۔ غرض اس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں جمہوری راج کا جو نقشہ ۱۵ سال پہلے بنایا گیا تھا وہ کوئی خام کی چیز نہ تھی بلکہ سولہ آنے یا سو نئے پیسے کھرا مال تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس نقشے کے مطابق حکومت چلانے کا تجربہ کامیاب بھی ہوا یا نہیں۔ جس شخص نے پچھلے تین جنرل الیکشن دیکھے ہیں کہ کس طرح کشمیر سے کنیا کماری تک میں کہیں کروڑ مردوں عورتوں نے عام طور پر بغیر کسی جھگڑے ٹنٹے کے کئی پارٹیوں میں سے، جن کے پروگرام ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے، آزادی سے اپنی اپنی پسند کی پارٹی کے امیدواروں کے ڈبوں میں ووٹ ڈالے جو یہ دیکھ رہا ہے کہ پارلیمنٹ میں اور ریاستوں کی اسمبلیوں میں مخالف پارٹی کے لوگ دل کھول کر حکومت پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں اور بے دھڑک دیس کی بھلائی کے سجھاؤ

دیتے ہیں۔ حکومت کو ہر بات سننی پڑتی ہے اور جو من لگتی ہو وہ ماننی پڑتی ہے اور پھر اپنے دیس کا ان دلیسوں سے مقابلہ کرتا ہے۔ جہاں آئے دن فوجی انقلاب ہوتے رہتے ہیں۔ آئین بنتے اور منسوخ ہوتے ہیں، حکومت کے نکتہ چینیوں کی زبان بند کردی جاتی ہے، اور اخباروں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، وہ تو پکار پکار کر کہے گا کہ ہندوستان میں جمہوریت کامیابی سے چل رہی ہے

اب سوال یہ کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جمہوریت کے پودے نے ہندوستان کی زمین میں اتنی آسانی سے جڑ پکڑ لی پر بہت سے مشرقی بلکہ بعض مغربی ملکوں میں ابھی تک جمنے نہیں پایا؟ اس کا جواب کچھ ایسا مشکل نہیں۔ ذرا دھیان سے سنئے تو اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔ یہ چیز جسے ہم جمہوریت کہتے ہیں ایک لحاظ سے تو بہت پرانی ہے۔ ابتدائی شکل میں اُن دنوں میں بھی پائی جاتی تھی جب انسان قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے، مگر جمہوری زندگی کا یہ ڈھانچہ جو آج کل یوروپ اور امریکہ کے بہت سے ملکوں میں پایا جاتا ہے، پچھلی چند صدیوں میں دھیرے دھیرے بنا ہے۔ یہ کئی اجزاء سے مرکب ہے جن میں جمہوریت کے علاوہ علمی اندازِ نظر، سیکولرزم اور قومیت بھی شامل ہے اور ان میں سے کوئی جُز واکیلا نہیں پنپ سکتا۔ سب مل کر ہی ایک جمہوری سماج بنا سکتے ہیں۔ علمی اندازِ نظر سے مُراد ہے زندگی اور کائنات کو سمجھنے کے لئے وہموں اور ڈھکوسلوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے مشاہدے تجزیے اور عقل سے کام لینا۔ سکولرزم کے معنی ہیں سماج کی تنظیم اور حکومت کے نظام کی بنا کسی ایک مذہب کے عقیدے پر رکھنے کے بجائے ان عقلی اور اخلاقی اصولوں پر رکھنا جن کو سبھی مذہبوں کے پیرو مانتے ہیں۔ اور قومیت اس احساس کو کہتے ہیں کہ ایک ملک کے رہنے والے چاہے الگ مذہبوں اور نسلوں کے ہوں اور الگ الگ زبانیں بولتے ہوں، لیکن ہم وطن ہونے کے ناتے سب ایک ہیں اور سب کو ملک کی سلامتی اور ترقی کے لئے ایک دل ایک جان ہو کر کام کرنا چاہیئے۔ جب یہ تینوں چیزیں موجود ہوں تب جا کر ہی جمہوریت کی روح پیدا ہو سکتی ہے جس کی بدولت ہم انسان کی عقل اور نیکی پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہ صحیح

بات سمجھانے سے سمجھ جائے گا۔ زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں اور زندگی کے جتنے مسئلے ہیں سب کا حل آپس میں بحث کرنے سے نکل آتا ہے۔

اُن ملکوں میں، جہاں جمہوریت کا تجربہ ناکام رہا، ان تینوں چیزوں کی کمی تھی، مگر ہندوستان میں ان کی داغ بیل اب سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ کوئی چار سو سال ہوئے اکبر بادشاہ، ہر بات کی چھان بین عقل اور تجربے سے کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس زمانے کے فلسفیوں میں اس بات پر بحث ہوا کرتی تھی کہ بچے میں بولنے کی صلاحیت خلقی ہوتی ہے یا وہ دوسروں کے ساتھ رہ کر اور ان کی بات چیت سُن کر بولنا سیکھتے ہیں۔ اکبر نے اس کا فیصلہ کرنے کے لئے یہ تجربہ کیا کہ بچوں کو شروع میں اس طرح الگ تھلگ رکھا کہ وہ کسی کو بات چیت کرتے نہ سُن سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیانے ہو کر بھی انھیں بولنا نہ آیا۔ بس جانوروں کی طرح بے معنی آوازیں نکالتے تھے۔ اس طرح اس مسئلے کے بارے میں یقینی معلومات حاصل ہو گئی۔ یہ اور بات ہے کہ ان بیچارے بچوں کو بعد میں بولنا سکھانے میں بڑی مشکل پیش آئی ہوگی۔ اکبر ہی کے سر اس کا سہرا بھی ہے کہ اس نے سیکولر ریاست کی روایت کو جو دراصل ہندوستان میں مدت سے چلی آ رہی تھی، نئے سرے سے زندہ کیا۔ اس کی پالیسی جیسا کہ اُس نے خود کہا ہے، یہ تھی "ہر مذہب کے لوگوں کو خدا نے ہمارے سپرد کیا ہے ہمیں ان کے ساتھ محبت کا سلوک لازم ہے، ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ خدا کی رحمت ہر مذہب کے شاملِ حال ہے اور دل وجان سے کوشش کرنا چاہیئے کہ صُلحِ کُل کے سدا بہار باغ کا لطف اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں سب انسانوں کو بھید بھاؤ کے بغیر بخشتا ہے بادشاہوں کو بھی جو خدا کا سایہ کہلاتے ہیں، یہ اصول نہ چھوڑنا چاہیئے"۔ اب رہی قومیت، سو یہ مذہبی بنیاد پر ہندوستان میں، مدتوں سے معبود تھی، مگر سکولر بنیاد پر اسے اکبر ہی نے قائم کیا۔

آج کل کی جمہوریت کی لازمی شرطیں، ایک ابتدائی شکل میں اگر ہمیں ہندوستان میں اب سے چار سو سال پہلے دکھائی دیتی ہیں تو خود جمہوریت کا ایک ابتدائی ڈھانچہ تین ساڑھے تین ہزار سال پہلے ویدوں کے زمانے میں نظر آتا ہے جب ہر بستی میں سبھا اور سمتی ہوتی تھیں

اور سارے معاملے آپس کے صلاح مشورے سے طے ہو جاتے تھے۔

پھر یہ بھی ہے کہ انگریزوں کی حکومت میں کم سے کم ڈیڑھ سو سال سے ہندوستانیوں کو جمہوریت کی ٹریننگ مل رہی تھی۔ اگرچہ اصل حکومت انگریز سرکار کے ہاتھ میں تھی اور ہمیں صرف پرچھائیں سے کھیلنے کا موقعہ ملتا تھا مگر پھر بھی کھیل ہی کھیل میں ہم نے جمہوریت کے طور طریقے سیکھ لیے تھے۔

غرض جمہوریت ہندوستان کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی کہ وہ اس کے برتنے میں گھبراتا، الجھتا، ٹھوکریں کھاتا۔ اس نے جمہوریت کے نئے تجربے کو پوری سوجھ بوجھ کے بل پر اس تیاری سے چلایا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔

ممکن ہے ہم میں سے کچھ لوگ ان جھگڑوں کو دیکھ کر جو مختلف پارٹیوں میں اور ہر پارٹی کے مختلف دلوں میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں، اور اس لعن طعن کو سن کر جو لوگ ایک دوسرے پر زور شور سے کرتے رہتے ہیں، اس وہم میں پڑ گئے ہوں کہ کہیں جمہوریت کا تجربہ ہمارے دیس میں ناکام تو نہیں ہو رہا ہے۔ مگر انھیں اطمینان رکھنا چاہیئے کہ یہ روگ تو جمہوریت کے ساتھ ہر جگہ لگے ہوتے ہیں مگر ان کا علاج خود جمہوریت ہی کے اندر موجود ہے۔ وہی جنتا جو ہر چناؤ کے بعد پانچ سال تک سوتی یا اونگھتی دکھائی دیتی ہے در اصل ہر پارٹی اور ہر نیتا کی حرکتوں کو دیکھتی رہتی ہے اور وقت آنے پر سب کے کَل نکال کر سیدھا کر دیتی ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو، دہلی)

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

دیوانِ حافظ مترجم

از مولانا قاضی سجاد حسین

سائز ۲۰×۲۶، حجم ۴۲۴ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ و جلد بہت عمدہ قیمت مجلد دس روپیہ غیر مجلد آٹھ روپیہ۔ ناشر:- سب رنگ کتاب گھر۔ دہلی ۶

دیوانِ حافظ کو فارسی ادب و شاعری میں جو اہمیت حاصل ہے وہ تو ہے ہی لیکن اردو ادب پر بھی اس کا بہت گہرا اور پائدار اثر پڑا ہے۔ مگر اب جبکہ ہندوستان میں فارسی کی تعلیم کا رواج پہلے کی طرح عام نہیں رہا اور نئی نسل کے ادیب و شاعر فارسی ادب سے بڑی حد تک بے بہرہ اور لاعلم ہوتے ہیں۔ جناب قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی نے دیوانِ حافظ کا ترجمہ کر کے اردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ ترجمہ صاف، سادہ اور بامحاورہ ہے اور حسب ضرورت حاشیہ میں تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر دو شعر کا ترجمہ اور تشریح ملاحظہ ہو۔

ببیں ہلالِ محرم بخواہ ساغرِ راح　　　　که ماہِ امن و امانست و سالِ صلح و صلاح

محرم کا چاند دیکھ! شراب کا ساغر مانگ　　　　اس لئے کہ امن و امان کا مہینہ ہے اور صلح و نیکی کا سال ہے

تشریح:- ماہ محرم ان چار مہینوں میں سے ہے جن میں قتال حرام ہے۔

دلا تو فارغی از کارِ خویش و می ترسم　　　　کہ کس درت نکشاید چو گم کنی مفتاح

اے دل تو اپنے کام سے بے فکر ہے اور مجھے ڈر ہے　　　　کہ جب تو کنجی گم کر دے گا تو کوئی تیرا دروازہ نہ کھولے گا

تشریح:- جو شخص خود اپنی فکر نہیں کرتا کوئی دوسرا بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔

شروع میں جناب سعید انصاری صاحب، استاد جامعہ ملیہ کے قلم سے مختصر پیش لفظ ہے جس میں خواجہ میر (؟) کی تعلیم، شعر و شاعری اور ان کے کلام کی خوبی پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے بڑا اچھا ہوتا اگر اس مختصر پیش لفظ کے بجائے مبسوط اور جامع مقدمہ ہوتا ہے، جس میں تفصیل سے دیوان حافظ اور اس کے مصنف کے مقام کو اجاگر کیا جاتا۔

اردو املا کا آسان طریقہ

از عبدالغفار مدہولی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۴۴ صفحات، تاریخ اشاعت ۲۹ جنوری ۱۹۶۳ء قیمت ۷۵ نئے پیسے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔

مدہولی صاحب جامعہ ملیہ میں کوئی چالیس سال سے تعلیم دے رہے ہیں، ایک طویل عرصے تک مدرسہ ابتدائی میں پڑھاتے رہے اور اب کچھ عرصے سے استادوں کے مدرسہ میں ان طالب علموں کو جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، اردو لکھنا پڑھنا سکھا رہے ہیں۔ موصوف کو شروع سے اپنے موضوع سے غیر معمولی دلچسپی اور گہرا لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے اپنے چالیس سالہ تجربہ کی بنا پر اس مختصر کتاب میں املا کے وہ آسان طریقے تبلائے ہیں، جن کو اختیار کرکے بڑی آسانی سے اردو زبان سکھائی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کے ۲۴ صفحوں میں ان طالب علموں کی تحریروں کے نمونے دئے گئے ہیں، جن کی مادری زبان ہندی تھی اور جنھوں نے مختصر مدت میں اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔

ہمالہ پکارتا ہے

از کشن دت طوفان

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۹۵ صفحات، غیر مجلد، قیمت ڈیڑھ روپے

تاریخ طباعت: جنوری ۱۹۶۳ء ناشر: مکتبہ قصر اردو، اردو بازار۔ دہلی ۶

چین کے حملے کے بعد اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے نظریاتی اختلافات کو پس پشت ڈال کر حملہ آور کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ اس سلسلے میں شعرا کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، پیش نظر

کا مجموعہ ہے۔ ایک کرب بے کشی دست طوفان ایک نوجوان شاعر ہیں۔ اس لئے ان کی طبیعت میں جوش ہے، غم و غصہ میں تیکھا پن ہے اور جذبات میں شدت۔ اس لئے خیالات و جذبات کے اظہار میں کہیں کہیں آداب شاعری کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے، مگر اس معاملے میں ان کو مجبور سمجھنا چاہیئے کیونکہ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے۔

اس مجموعہ کا پیش لفظ جناب گوپی ناتھ امن نے لکھا ہے، جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ بدقسمتی سے گذشتہ چوتھائی صدی سے اردو شاعری کا رنگ سرخ ہونے لگا تھا اور اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وطن کے راگ بہت کم ہو گئے تھے۔ قومی شاعری ایک طرح پر معرض زوال میں آگئی۔۔۔۔ اردو ایک طرح پر قومی زندگی سے کٹ گئی۔۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو اردو جیسی پیاری اور میٹھی زبان کا زوال پسند نہیں اس لئے ایک ایسا موقع آگیا جسے سرخ شاعری اور سرخ افسانہ گوئی کا زوال سمجھنا چاہیئے۔۔ پھر وطن کے نغمے گائے جا رہے ہیں، پھر وطنیت ہماری زبان میں زندہ ہوئی، ایشیا ایک ہے کی جگہ ہندوستان ایک ہے کا نعرہ سنا جانے لگا۔"

اور ہندوستان جاگ اٹھا مرتبہ: عبدالقوی دسنوی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۰۴ صفحات، قیمت درج نہیں۔ تاریخ طباعت: فروری ۶۳ء

ناشر: شعبۂ اردو، سیفیہ ڈگری کالج۔ بھوپال (ایم پی)۔

اس کتاب میں ان نظموں کا انتخاب دیا گیا ہے، جن میں چین کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے اہل ملک کے جذبات کو ابھارا گیا ہے۔ ان نظموں میں چین کی بے وفائی اور دغا بازی کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

جس نے ہم سے کبھی پیمان وفا باندھا تھا
آج ہم سے وہی آمادۂ پیکار ہوا

جس کو ہم موجب سکون راحت جاں سمجھے تھے
وہ ستم کیش ہوا، درپئے آزار ہوا

(ایم اے شاد)

اس کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ ہندوستان نے حق و صداقت کی حمایت اور امن کی حفاظت کے لیے تلوار اٹھائی ہے:

ہم نے شمشیر اٹھائی ہے صداقت کے لئے
امن و تہذیب و شرافت کی حفاظت کے لئے
سر کبف آج ہیں ہم ہند کی عظمت کے لئے (روش صدیقی)

اور اس عزم محکم کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ

اپنی سرحد سے اے چین! ہٹا دیں گے تجھے
عزم و ہمت کے یہ طوفان بہا دیں گے تجھے (روش صدیقی)

کتاب کے مرتب جناب عبدالقوی دسنوی صاحب نے شروع میں "جاگو اور جگاؤ" کے عنوان سے حملۂ چین پر ایک تاریخی نظر ڈالی ہے۔

شاد عارفی (انتخاب غزل)

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۳۲ صفحات، تاریخ طباعت، اکتوبر ۱۹۶۲ء ناشر: نیا خواب پرانی تحصیل بلیو (یوپی)

پندرہ روزہ "نیا خواب" نے رام پور کے شاعروں کے تعارف اور انتخاب کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتابچہ اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں شاد عارفی کی غزلوں کا مختصر انتخاب ہے، جس کے بارے میں عابد رضا بیدار نے، جو غالباً اس کتابچہ کے مرتب ہیں، لکھا ہے کہ "یہ انتخاب شاعر کا پورا نمائندہ انتخاب نہیں ہے، اس میں نظمیں تو شامل ہی نہیں ہیں جو شاد عارفی کی شاعری کی آدھی ضخامت ہے، اس رنگ تغزل کی نمائندگی بھی نہیں ہے جب آتش جوان تھا۔ اس انتخاب میں غزل کے اس رنگ کو پیش کیا گیا ہے جس پر صرف شاد عارفی کا ٹھپہ ہے" آخر میں شاعر کے خود نوشت حالات زندگی ہیں اور ان کی شاعری و فن کے متعلق چند ادیبوں اور نقادوں کی رائیں ہیں۔

قطعوں میں عام طور پر بڑی تلخی، جارحانہ تنقید اور زہرخند طنز ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان میں اتنی شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ طبیعت پر بار محسوس ہوتا ہے لیکن جب شاعر کے حالات سامنے آتے ہیں تو ان کی اس تلخی اور جھلاہٹ کے لئے وجہ جواز پیدا ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

یہ نرالی طرز استدلال یہ جمہوریت
تیغِ قاتل سے ٹپکتا ہے کہ یہ قاتل نہیں
آپ طاقت ور ہیں ساری مملکت بھی آپ کی
ہے تو گستاخی، پہ عالی جاہ اس قابل نہیں

ستم گر کو میں چارہ گر کہہ رہا ہوں — غلط کہہ رہا ہوں مگر کہہ رہا ہوں
مجھے آج کانٹوں کا منہ چومنے دو — بہاروں کا رُخ دیکھ کر کہہ رہا ہوں

جنابِ شیخ ہی اب رہ گئے ہیں لے دے کر — وہ دن گئے جو کسی برہمن پہ چوٹ کروں
یہی کہیں گے کہ آنکھیں ہمارے پاس بھی ہیں — جو کم نگاہیِ اربابِ فن پہ چوٹ کروں
کریں گی یاد مجھے شاد کل نئی قدریں — جو آج رسم و رواجِ کہن پہ چوٹ کروں

کسی کے حسنِ سماعت پہ چوٹ ہے یہ بھی — کہ ہم فسانۂ غم بار بار کہتے ہیں
جو دشمنوں کے اشاروں پہ رقص فرمائیں — انھیں کو اصل میں ذی اختیار کہتے ہیں
وہ انقلاب کا رستہ نہ دیکھتے ہوں کہیں — جو داستانِ شبِ انتظار کہتے ہیں

جنابِ شیخ سیاست کے پھیر میں پڑ کر — بتانِ دیر کو پروردگار کہتے ہیں

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو — گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

آپ کی منصوبہ بندی کی طرح سرکار کو — ہم بھی کاغذ پر دکھا سکتے ہیں تعمیریں بہت

آج کل راتیں بڑی ہیں اس لئے دن گھٹ گیا — تھے کبھی ہم لوگ بھی شایانِ شانِ کجکلاہ دوست

(ع ل ا)

کوائف جامعہ

ہز ہائنس مہاراجہ ڈاکٹر کرن سنگھ کا گراں قدر عطیہ

امسال ۲۹ اکتوبر کو جامعہ ملیہ کا ۴۳ واں یوم تاسیس منایا گیا۔ جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ ملنے کے بعد یہ پہلا یوم تاسیس تھا اس لئے اس مرتبہ نسبتاً زیادہ جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا اور تقریروں کا انداز پہلے سے مختلف تھا۔ اس اہم موقع پر جناب شیخ الجامعہ صاحب نے جموں و کشمیر کے صدرِ ریاست ہز ہائنس مہاراجہ ڈاکٹر کرن سنگھ صاحب کو جلسے کی صدارت کے لئے مدعو کیا تھا، جسے موصوف نے ازراہِ عنایت منظور فرمایا۔

صدر ریاست کی آمد پر این سی سی نے سلامی دی، اس کے بعد پرچم کشائی کی رسم ادا ہوئی اور جامعہ کا ترانا گایا گیا، پھر صدر ریاست جلسے گاہ تشریف لے گئے۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی نے اپنا مضمون پڑھ کر سنایا، جس میں جامعہ کے ابتدائی دور کے حالات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے سنہ ۳۰ء سے سنہ ۳۶ء تک کے حالات بیان فرمائے، آخر میں شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے موجودہ حالات اور مستقبل کے عزائم سے بحث کی۔ اس کے بعد صدر جلسہ جناب مہاراجہ ڈاکٹر کرن صاحب نے صدارتی تقریر کی۔ تقریر سے قبل موصوف نے ریاست جموں و کشمیر کی طرف سے پچاس ہزار کے گراں قدر عطیے کا اعلان فرمایا، اس کے بعد فرمایا۔

شیخ الجامعہ صاحب، جامعہ میں میرے آنے کا یہ پہلا موقع ہے مجھے خوشی ہے اور آپ کا ممنون ہوں کہ جامعہ کے یوم تاسیس کے موقع پر مجھے یاد کیا اور جامعہ کو دیکھنے اور اس کے حالات سننے کا موقع ملا۔ میں خود جامعہ آنا چاہتا تھا، کیونکہ اس کی شہرت سن چکا ہوں، اس نے تعلیم کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں ان سے واقف ہوں، جامعہ سیکولرزم کی علامت ہے، ٹھیک اسی طرح ریاست جموں و کشمیر بھی سیکولر نظام کی نمائندہ اور علامت ہے۔

[illegible] صدر ریاست نے طالب علموں بالخصوص کالج کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:
آپ [illegible] کہ [illegible] کے بعد کا طالب علم ہوں، ہمیں تحریک آزادی میں حصہ لینے اور [illegible] [illegible] میں شرکت کرنے کی سعادت میسر نہیں آئی، مگر آزاد ہندوستان کے مستقبل کو سنوارنے اور گاندھی جی کے [illegible] کو پورا کرنے کی اہم اور کٹھن ذمہ داری ہمارے اوپر ہے، اس کی تعمیر کا ایک وسیع پروگرام ہمارے سامنے ہے، آپ کو چاہیے کہ اس میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیں۔ شاید آج سے ایک صدی قبل طالب علموں کی بے نظمی اور بے ضابطگی کا مسئلہ نہیں تھا، مگر آج اس آزادی اور ٹکنالوجی کے دور میں یہ ایک اہم مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ میں خاص طور پر آپ سے کہوں گا کہ آپ اس ادارے کے مقاصد اور اس کے بانیوں کی سیرت کو سامنے رکھیے۔ ہم چاہے کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں ہمارا فرض ہے کہ اس ملک کی خدمت کریں، اس کی تعمیر میں حصہ لیں اور اس کے سیکولر نظام حکومت کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنائیں۔

صدر ریاست کی تقریر کے بعد خازن جامعہ جناب کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے مہاراجہ ڈاکٹر کرن سنگھ کا شکریہ ادا کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ آپ نے جامعہ میں قدم رنجہ فرمایا، اور ہماری عزت بڑھائی۔ اس سے پہلے بھی ریاست کشمیر نے جامعہ کو شکرگزاری کا موقع دیا ہے سابق وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد صاحب نے بھی آپ ہی کی طرح ایک گراں قدر عطیہ عنایت فرمایا تھا، مگر اس عطیہ سے کہیں گراں قدر آپ کی ذات گرامی ہے، آپ کا خلوص، آپ کی سادگی، آپ کی محبت اور آپ کی شخصیت میں جو کشش اور جاذبیت ہے، اس کی بنا پر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری جامعہ سے آپ جیسے نوجوان نکلیں۔ آج آپ ایک خاص موقع پر جامعہ تشریف لائے ہیں، اگر ہماری خواہش ہے کہ اکثر آتے رہیں تاکہ جامعہ کے کاموں کو زیادہ تفصیل سے دیکھنے اور یہاں کے اساتذہ سے ملنے کا موقع ملے۔

آخر میں قومی ترانہ پیش کیا گیا۔

یوم یکجہتی: [illegible] کو جامعہ میں یکجہتی اور این سی سی کا دن منایا گیا۔ سب سے پہلے شیخ الجامعہ صاحب نے این سی سی کیڈٹ کی سلامی لی۔ اس کے بعد موصوف نے جامعہ کے طالب علموں، اساتذہ اور کارکنوں سے قومی یکجہتی اور ملک کی خدمت کا عہد لیا۔

طابع وناشر عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائٹل: دیال پریس دہلی

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد (۶۰)	بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۳ء	شمارہ (۶)

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب　　ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ　　ضیاء الحسن فاروقی

عبد اللطیف اعظمی (مرتب)

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

جامعہ ملیہ ــــ ماضی، حال اور مستقبل

جامعہ کے ۴۳ ویں یوم تاسیس کے موقع پر امسال ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو جموں اور کشمیر کے صدر ریاست جناب ہز ہائینس مہاراجہ ڈاکٹر کرن سنگھ نے جلسے کی صدارت کی۔ موصوف کی صدارتی تقریر کا مسودہ ہم جامعہ کی پچھلی اشاعت میں دے چکے ہیں۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، ڈاکٹر سید عابد حسین اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جامعہ کے مختلف ادوار پر مضامین پڑھے، جنہیں ہم آئندہ صفحات میں پیش کر رہے ہیں۔ ان مضامین میں جامعہ کی تاریخ اور خاص خاص حالات بڑی حد تک تفصیل سے آگئے ہیں مگر چند اہم تاریخیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:-

۱- ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ قائم ہوئی۔

۲- ۸ جولائی ۱۹۲۵ء کو دہلی منتقل ہوئی اور قرول باغ میں کرایہ کی عمارتوں میں کام شروع ہوا۔

۳- ۱۹۳۱ء میں قرول باغ میں جامعہ کی پہلی عمارت، تعلیمی مرکز، پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

۴- ۱۹۳۶ء میں ابتدائی اسکول اپنی مستقل آبادی جامعہ نگر منتقل ہوا۔

۵- ۱۹۳۸ء میں استادوں کا مدرسہ قائم ہوا۔

۶- ستمبر ۱۹۴۴ء میں تعلیم و ترقی، تعلیمی مرکز (غیر اقامتی بچوں کا ابتدائی اسکول)، کتب خانہ اور مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر منتقل ہوئے۔

۷- ۱۹۵۲ء میں انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس ایجوکیشن قائم ہوا۔

۸- ۱۹۵۵ء میں ریسرچ، ٹریننگ اینڈ پروڈکشن سنٹر اور نرسری اسکول قائم ہوئے۔

۹- ۱۹۵۹ء میں رورل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔

(لطیف اعظمی)

جامعہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

الٰہ آباد کے بہ ظریف نے ظرافت کے انداز میں کہا تھا۔

شیخ مرحوم کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے — دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے (اکبر الٰہ آبادی)

لیکن اس ظرافت میں انگریزی سیاست کی پوری تاریخ کی طرف اشارہ ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوداگروں کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ اس وسیع ملک کی حکمرانی کبھی ان کے نصیب میں آئے گی لیکن اپنوں کی ناچاقی نے غیروں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا اور بدیسی دو کاندار اس دیس کے مالک بن گئے۔

اس اتفاقی حادثہ کو مستقل حقیقت بنانے کے لیے ضروری تھا کہ ہندوستانیوں کے ذہن و دماغ کو اس طرح متاثر کیا جائے کہ وہ ایک دوسرے سے بدظن ہو جائیں اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہونے کی جد و جہد کے بجائے آپس ہی میں دست بگریباں رہنا پسند کریں چنانچہ اس نقطۂ نظر کے مطابق نصاب تعلیم مرتب کیا گیا اور تاریخ کے نام سے ایسے تفرقہ انگیز افسانے بنائے گئے کہ بچوں کے دلوں میں نفرت و عداوت کی بنیادیں پڑ گئیں اور وہ اپنے بھائیوں کو دشمن اور غاصبوں کو دوست سمجھنے لگے۔

انگریز حکمراں یہ سمجھتے تھے کہ ان کی اس تفرقہ انگیز سیاست پر ہمیشہ پردہ پڑا رہے گا، لیکن محبان وطن نے اس صورت حال کو جلد ہی محسوس کر لیا اور اس کوشش میں لگ گئے کہ ملک کے باشندگان ملک اس راز درون پردہ کو سمجھ لیں لیکن حکمرانوں کی ہیبت اور معیشت کا جبا ؤ اتنا سخت تھا کہ قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایک طرف قید و بند اور دار و رسن کا خدشہ تھا تو دوسری طرف فقر و فاقہ کا خطرہ۔ اس دوگونہ خوف نے حوصلوں کو پست کر دیا تھا لیکن ان

[illegible] کی تعلیم کچھ دور کی چیز تھی۔

[illegible] صدی کے اوائل میں کچھ ایسے حادثات پیش آئے کہ قوم خوابیدہ انگڑائی [illegible] جنگ عظیم ختم ہوئی تو خلافت عثمانیہ کے خاتمہ اور مظالم پنجاب نے ہندو مسلمان دونوں کو تحریک ترک موالات کے جھنڈے تلے متحد کر دیا۔ اب سرحد سے آسام کے کنارے تک اور کشمیر سے راس کماری تک ہندو مسلمان بھائی بھائی کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور بیرونی راج کا جوا گردن سے اتار پھینکنے کی جدوجہد جاری تھی۔

اس سیاسی جوش کے زمانے میں ہوش مند رہنماؤں نے سوچا کہ غلامی کی جڑیں اکھاڑنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم غیر ملکی اثر سے آزاد ہو جب تک یہ قلعے سر سبز ہوں گے انگریزی اقتدار برقرار رہے گا۔ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے سربرآوردہ رہنماؤں نے اپیل کی کہ تمام محکموں کی طرح حکومت کی تعلیم گاہوں کا بھی بائیکاٹ کیا جائے غالباً ۱۹۱۹ء میں تعلیمی تحریک موالات کا اعلان کیا گیا اس اعلان پر ملک کے نوجوانوں نے کافی توجہ کی اور تعلیمی مقاطعہ کی مہم شروع ہو گئی۔

اپنی طویل نظر بندی کے بعد جب مولانا محمد علی رہا ہوئے تو وہ اپنی مادر علمی کی زیارت کے لئے علی گڑھ گئے۔ ان کے اعزاز میں طلبہ نے ایک عظیم الشان جلسہ کیا جس میں مولانا محمد اسلم جیراجپوری [illegible] نے اپنی وہ مشہور نظم پڑھی جس کا یہ شعر آج تک بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

دہر میں مسلم ہے حق کی آزمائش کے لئے
تمغۂ ایماں نہیں ملتا نمائش کے لئے

مولانا محمد علی کی آمد سے ایم اے او کالج علی گڑھ[1] کے نوجوانوں میں آزادی کی لہر دوڑ گئی اور وہ سوچنے لگے کہ کس طرح اپنی درسگاہ کو برطانوی حکومت کے اثرات سے آزاد کریں کچھ عرصہ کے بعد مراد آباد میں خلافت کا ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا، اس موقع پر علی گڑھ کے چند طالب علم وہاں گئے [illegible] درخواست کی کہ وہ مہاتما گاندھی کو لے کر علی گڑھ تشریف لائیں۔ اس

---

[1] اس وقت تک یہ یونیورسٹی نہیں بنی تھی کالج ہی تھا۔

درخواست پر یہ حضرات علی گڑھ گئے کالج میں جلسہ ہوا اور بڑی پر زور تقریریں کیں لیکن کرایہ کے مقرروں نے جلسہ کو بے نتیجہ بنا دیا لیکن قوم پرور طلبہ نے ہمت نہیں ہاری اور کوشش کرتے رہے آخرکار ان بزرگوں کی اعلیٰ پر احسان کی شکستہ دلی نے دلوں کی دنیا بدل دی اور طلبہ نے تعلیمی ترک موالات کا فیصلہ کر لیا۔ آخر کار ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے مبارک خطبہ سے نیشنل مسلم یونیورسٹی[1] (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے قیام کا اعلان ہو گیا۔

شیخ الہند نے اپنے خطبہ میں اعلان کیا کہ:-

"ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا تھا قبل اس کے کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے ضرورت ہے کہ ہماری تعلیم اغیار کے اثر سے کلیۃً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات کے کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار وضع و اطوار کے ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔"

امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اس وقت کے حالات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"عجب زمانہ تھا وہ صاحبو! نشۂ جوانی کے سرمست نوجوانوں پر پہلی بار وہ مخلصانہ دینی کیفیت طاری تھی جس کا ایک لمحہ بھی کبھی کبھی ساری زندگی کا رنگ بدل دیتا ہے۔ یہ جوانوں کے تڑکے نمازیں پڑھنے والے راتوں کو روتے اور گڑگڑاتے سنائی دیتے تھے خود غرضیوں کی ہر وقت حرکت میں رکھنے والی زنجیریں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈھیلی ہو رہی ہیں ٹوٹ رہی ہیں۔ ملازمتوں کے متلاشی۔ سفارشوں کے لئے سرگرداں اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا نوجوان بیتاب تھے کہ اپنے وجود کو جو ہاتھوں کم کر دیں اور اپنی ساری قوتوں کو اس کی خدمت

---

[1] اصل نام نیشنل مسلم یونیورسٹی ہی رکھا گیا تھا جامعہ ملیہ اسلامیہ اس کا ترجمہ کیا گیا تھا بعد کو یہی ترجمہ زبانوں پر چڑھ گیا۔

[illegible] جوش اور اس خلوص کو ایک پائدار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا گیا [illegible] کسی بڑے مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا نہ کسی عمارت کا افتتاح ہوا تھا۔ چندوں کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ قافلہ سروسامان چھوڑ کر بے سروسامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا۔ یہ وقتی فائدوں کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرۃ زیادہ عزیز تھی وہ محنت و مشقت کا بوجھ لے کر تعمیر کے لئے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا۔ یوں اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا۔

بڑی بے سروسامانی کا دور تھا۔ نہ رہنے کا خاطر خواہ انتظام تھا نہ پڑھنے کی مناسب جگہ خیمے قیام گاہ [illegible] درختوں کے سائے تعلیم گاہ، مگر اس بے مائگی میں فارغ البالی اور اس پریشان حالی میں عجیب دلجمعی تھی۔ جن بزرگوں کو اس عہد پر محن میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملا ہے وہ آج تک اپنی خوش نصیبی پہ نازاں ہیں اور اس زمانے کے مصائب و مشکلات کی داستانیں اس لطف و مسرت کے ساتھ سناتے ہیں کہ پروردگان ناز و نعم بھی حسرت و تنگ دامانی کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ حکیم اجمل خاں مرحوم جامعہ کے پہلے امیر اور مولانا محمد علی شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مولانا محمد علی گرفتار ہو گئے تو جناب عبدالمجید خواجہ مرحوم اُن کے بجائے شیخ الجامعہ منتخب ہوئے۔

جامعہ کی بنیاد ایک شدید سیاسی ہیجان کے زمانہ میں پڑی تھی۔ اس لئے کچھ دنوں یہاں کی تعلیمی فضا پر سیاست کا اثر غالب رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ سیاسی اثر کم ہوتا گیا اور جامعہ ایک خالص تعلیمی ادارہ کا رنگ اختیار کرنے لگی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ تحریک خلافت کا زور ختم ہوا تو آمدنی کے سوتے خشک [illegible] یہ دور اہل جامعہ کے لئے بڑی پریشانی کا تھا سیاست کا زور کم ہوا تو وقتی جوش کے [illegible] آخرۃ کے بجائے عاجلہ کی فکر پھر دامنگیر ہوئی۔ جذبات کی رَو میں جو قدم انھوں نے [illegible] مصلحت اندیشی کا تقاضہ تھا کہ جلد سے جلد انہیں پیچھے ہٹایا جائے [illegible] کی جائے۔ اس مصلحت اندیشی نے بہتوں کو گریز پائی کی صلاح

ملی اور مشکلات کا مقابلہ ان حضرات کے سامنے ایسا ہی معلوم ہوتا تھا لیکن ان حضرات کی ہمت نے ہمت کی اور ... احساس ... کی بساط کو مشکلات و مصائب کے بھنور میں ڈوبنے سے بچالیا۔

فروری ۱۹۳۴ء کا جلسہ تقسیم اسناد ہمیشہ یادگار رہے گا ملک کے مایۂ ناز سائنس داں سر سی وی رمن نے کانووکیشن ایڈریس پڑھا۔ سر سی وی رمن کی بین الاقوامی شہرت نے ایک بار پھر نظروں کی آنکھیں کھول دیں انھوں نے اس درسگاہ کے مقاصد کی ترجمانی اس بلند آہنگی سے کی کہ گراں گوش بھی چونک پڑے جس وقت انھوں نے کہا۔

"آزادی اول، آزادی آخر اور آزادی ہمیشہ۔"

تو دور دور تک اس کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھے پھر جب انھوں نے بغداد و قاہرہ اور قرطبہ و غرناطہ کی یونیورسٹیوں کے علمی کارناموں کا ذکر کیا تو حاضرین فخر سے جھومنے لگے۔ اس خطبہ میں انھوں نے مسلمانوں کے علمی مذاق کا بہت موثر طور پر ذکر کیا، چند جملے آپ بھی سنئے۔

"علم کی محبت اور صداقت کا احترام اسلام کے خمیر میں داخل ہے۔ نبی عربی (علیہ السلام) نے علم اور سائنس کی طرف جس طرح توجہ دلائی ہے وہ انھیں دوسرے مصلحین سے نمایاں ممتاز کرتی ہے وہ فرماتے تھے طالب علم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے۔ جو طلب علم میں سفر کرتا ہے اسے خدا بہشت کی راہ دکھاتا ہے۔ گبن، سیڈی لاٹ، لین پول اور ڈریپر وغیرہ مورخین نے مسلمان علماء کی جرأت خیال، ندرت تحقیق اور تنوع مضامین کے بارہ میں جس طرح لکھا ہے اسے پڑھ کر کوئی شخص تعجب و استحسان کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

اسلام انسانوں کے درمیان روح فرسا امتیاز سے آشنا نہیں ہے وہ ایک خدا کی بالادستی کا قائل ہے۔ اس کے بعد وہ انسان کو اس کی پوری بلندی تک پہنچنے کی اجازت دیتا ہے۔"

جن بزرگوں نے جامعہ کی بنیاد رکھی تھی ان میں سے بعض ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی تعمیر کا ارادہ رکھتے تھے لیکن حالات کی رفتار نے جلد ہی واضح کر دیا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا نہیں ہے بلکہ ...

[illegible]

[illegible] سے [illegible] مولانا [illegible]

[illegible] کر [illegible] کی [illegible]

[illegible] ہوئے [illegible] ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اس فیصلے پر [illegible] حکیم

[illegible] کو [illegible] صورت حال سے مطلع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ

"ہم [illegible] چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کو تیار ہیں ہمارے آنے تک

جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے۔"

جامعہ کے طلبا، قدیم اساتذہ اور کارکنوں کا ایک وفد حکیم صاحب سے ملا اور درخواست کی کہ جامعہ کو بند نہ کیا جائے۔ حکیم صاحب نے پوچھا کہ جامعہ کو دہلی لے آؤں تو تم لوگ اس کے لئے کم تنخواہ پر کام کرنے کے لئے تیار ہو؟ سب کے ارکان نے یک زبان ہو کر کہا: "ہم بے معاوضہ بھی کام کرنے کو تیار ہیں"۔ حکیم صاحب نے انھیں اطمینان دلایا کہ جامعہ کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

مجلس امناء (ٹرسٹیز) کے جلسے میں بڑی پرزور تقریریں ہوئیں۔ اکثریت کا رجحان یہی تھا کہ جامعہ کو بند کر دیا جائے لیکن حکیم صاحب کی کوششوں سے یہ طے پایا کہ جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دیا جائے لیکن یہ منتقلی آسان نہ تھی۔ اس کے لئے زر خطیر درکار تھا لیکن مہاتما گاندھی کی توجہ سے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ آخر کار ۱۹۲۵ء کی تعطیل گرما میں جامعہ دہلی آگئی اور قرول باغ میں چند کرایے کے مکان لے کر تحریک ترک موالات کی اس تعلیمی یادگار کو نئی زندگی و تابندگی دینے کا بندوبست کیا گیا۔

دہلی آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد خواجہ صاحب مرحوم بھی اپنے حالات کی بنا پر جامعہ میں نہ رہ سکے۔ حسن حیات صاحب رجسٹرار بھی علیحدہ ہو گئے ابھی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے آنے میں چند ماہ کی دیر تھی اس لئے عارضی طور پر کام چلانے کے لئے پروفیسر طاہر السن محمدی صاحب کو قائم مقام شیخ الجامعہ اور [illegible] صاحب کو رجسٹرار مقرر کیا گیا۔ چند ماہ کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اپنے دو رفیقوں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب کے ساتھ جرمنی سے واپس آگئے ان صاحبوں کے [illegible] اساتذہ اور کارکنوں کی ڈھارس بندھی۔ حکیم صاحب مرحوم کو بھی بڑا سہارا ملا۔ [illegible] شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب [illegible] مقرر کئے گئے اور [illegible] انجام دینے لگے۔ ان کے انتظام سے [illegible]

[illegible] کے ساتھ [illegible]

جامعہ کا [illegible] کے [illegible] رہا تھا کہ اچانک [illegible] ان کا انتقال ہو گیا۔

جامعہ کی تاریخ میں یہ حادثہ اتنا سخت تھا کہ کلیجے منہ کو آنے لگے مجلس [illegible] کی ہمت ہارنے ہونے لگی کہ اس درسگاہ کو بند کر دیا جائے مگر امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی سرپرستی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی بہت عالی نے کارکنوں کو مایوس نہیں ہونے دیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے یہ نازک وقت بھی گزار دیا۔ اُمنائے قومی امانت چند نوجوانوں کے سپرد کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے ان نوجوانوں نے قلیل مشاہرہ پر بیس سال تک خدمت کا عہد کیا مجلس اُمناء کی جگہ انجمن تعلیم ملی کے نام سے ایک نئی سوسائٹی بن گئی جن صاحبان کے عزم و ایثار سے اس بزم خدمت کا آغاز کیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں
ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر محمد مجیب، مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم، خواجہ عبدالحی، حافظ فیاض احمد، ارشاد الحق صاحب، مولانا سعد الدین مرحوم، سعید انصاری، حامد علی خاں، شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم۔

بعد کو اور لوگ بھی اس جماعت میں داخل ہوتے گئے مگر السابقون الاولون کی فہرست میں انہیں کا نام ہے حالات بہت ناساز گار رستہ منزل دور اور راہ پر خار تھی قدم قدم پر مشکلات و موانع کا ہجوم تھا مگر اللہ کے ان بندوں نے خدمت قومی کی راہ میں اپنی جان کی بازی لگا دی [illegible] سالانہ جشن سیمیں کے بھرے مجمع میں ان کی تندہی جفاکشی اور ایثار و قربانی کا ان الفاظ میں اعلان کیا "میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے کسی اور ادارے کو نصیب ہوں گے انھوں نے بہت سختیاں اٹھائیں مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے یہ ہماری قوم کے مستقبل کے لئے ایک فال نیک ہے انھوں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں لیکن تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا۔

آغشتہ اند ہر سر خارے بخون دل   قانون باغبانی صحرا نوشتہ اند

اب ہم ۱۹۳۰ء کے حدود تک پہنچ گئے ہیں کہانی کا آغاز میں نے کر دیا ہے۔ اب داستان کے اس سلسلہ کو آگے بڑھانے کے لئے مجھ سے بہتر بزرگوں کے لئے گوش بر آواز ہو جائیے میں تو صرف داستان گو تھا لیکن وہ اس داستان کے سپرد ہے ہی میں نے تو دور سے موجوں کے قصے سنے ہیں اب [illegible] کا حال ان حضرات سے سنئے جو خود حوادث و آفات کے تھپیڑوں سے دوچار ہو کر [illegible] کی کشتی کو نکال کر ساحل مراد تک لائے ہیں۔

جامعہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۶ء تک

ڈاکٹر سید عابد حسین

جنابِ صدر، شیخ الجامعہ صاحب، بھائیو، بہنو، اور بچو

میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ جامعہ ملیہ کی سولہ سال کی تاریخ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۶ء تک آپ کو سناؤں۔ تاریخ کے معنی بہت سے لوگ سمجھتے ہیں واقعات کا ایک سلسلہ۔ مگر اصل میں محض واقعات کے سلسلے بیان کرنے کو تاریخ نگاری نہیں بلکہ وقائع نگاری کہتے ہیں۔ تاریخ واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے محرکات کا بھی ذکر کرتی ہے یعنی ان سماجی، معاشی، اور سیاسی حالات کا، اُن خیالات اور رجحانات کا جو واقعات کو جنم دیتے ہیں۔ میں نے اس مضمون میں اسی کی کوشش کی ہے۔ اس تمہید کا مقصود یہ دعویٰ کرنا نہیں کہ اس سرسری مضمون میں تاریخ نگاری کا حق ادا ہو گیا بلکہ یہ عذر کرنا ہے کہ وقائع نگاری کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ اس میں اصل بات کم ہے اِدھر اُدھر کی باتیں زیادہ ہیں۔ مگر شاید یہ اِدھر اُدھر کی باتیں بیکار نہیں ہیں بلکہ اصل بات پر روشنی ڈال کر اس کو نمایاں کرتی ہیں۔

آپ پہلے جامعہ کے علی گڑھ میں قائم ہونے اور پھر دہلی منتقل ہونے کا ذکر سُن چکے ہیں۔ یہ محض مقام کی تبدیلی نہیں بلکہ بڑی حد تک نصب العین کی تبدیلی یا یوں کہیے کہ نصب العین کا تعین تھا۔ جب تک جامعہ علی گڑھ میں رہی دو مقصدوں کے [illegible] میں جھولتی رہی۔ ایک یہ کہ وہ ایک مستقل تعلیم گاہ اور مسلمانوں کی تعلیم اور زندگی کا ایک اپنا نقشہ بنائے جس میں دینی اور دنیوی اقدار کے پرانے اور نئے زمانے کے رنگ سموئے گئے ہوں [illegible] کے نمائندے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور خواجہ عبدالمجید تھے۔ دوسرا یہ کہ جامعہ ایک [illegible] ہو جنگِ آزادی کے سپاہیوں کا جو قومی تحریک میں حصہ لے کر ہندوستان کو آزاد کرانے [illegible] سے علم و تربیت پائیں، جہاں سے وہ نکالے گئے تھے، قبضہ کریں اور اس کی اصلاح

کرتی ہیں۔ مقصود [illegible] کا یہ قول سننے میں آیا ہے "ہمارا کعبہ علی گڑھ کالج ہے یا جامعہ کا زمزم کا آب حیات کی زندگی ہے۔ آخر میں ہمیں گنگا کو فتح کرنا ہے" جن دنوں نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریکوں کا زور تھا۔ جامعہ کے طالب علموں کو ایسا لگتا تھا کہ بس اب ملک آزاد ہونے والا ہے اور جامعہ کے مہاجرین کعبۂ مقصود پر قبضہ کرنے والے ہیں اس لئے جامعہ کے بارے میں مسلمانوں کی عام رائے مولانا محمد علی کے ساتھ تھی۔ مگر ۱۹۲۵ء میں واقعات کا رخ بدل چکا تھا۔ نان کوآپریشن کی تحریک ختم ہو کر شل ہو گئی تھی اور خلافت کی تحریک دم توڑ رہی تھی۔ جب ان حالات میں مولانا محمد علی اور ان کے ہم خیالوں نے جامعہ سے ہاتھ کھینچ لیا اور چند من چلے طالب علموں کی درخواست پر حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے جامعہ کو دہلی منتقل کر کے اس کو چلانے کا ذمہ لیا تو گویا یہ فیصلہ ہو گیا کہ جامعہ ایک مستقل تعلیم گاہ ہے۔ اس کا اصل مقصد تعلیم ہے۔ سیاسی مقصد محض ضمنی ہے اور وہ بھی عملی سیاست میں حصہ لینا نہیں بلکہ صرف اپنے طالب علموں میں آزادی کا جذبہ اور قومیت کی روح پیدا کرنا۔ دہلی آنے پر جامعہ کی ذہنی فضا کی تبدیلی کا اندازہ آپ کو اس سے ہوگا کہ دو سال بعد جب مہاتما گاندھی جامعہ میں تشریف لائے تو اسکول کے بچوں نے خیر مقدم کے ایڈریس میں کہا "آپ خوب جانتے ہیں کہ ہماری جامعہ نے ایک بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ ہم کو ایسی تعلیم دینا چاہتی ہے جس سے ہم خدا کے نیک بندے، اپنے دیس کے سچے خادم اور سب انسانوں کے بھلائی چاہنے والے بن جائیں۔ وہ ہمیں یہ سکھانا چاہتی ہے کہ اپنے علم و ہنر سے اپنے اخلاق کو سنواریں، محنت اور مشقت سے اپنے اور اپنے عزیزوں کے لئے حلال کی روزی کمائیں اور خلوص اور ہمدردی سے اپنی قوم کی ترقی اور اپنے ملک کی آزادی کے لئے کوشش کریں۔

"آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آج کل زمانے کی ہوا ہمارے خلاف ہے۔ ملک میں لڑائی اور فساد کی آندھیاں چل رہی ہیں جن سے پیار اور محبت کی کھیتی مرجھائی جاتی ہے۔ ہم آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ پودے جنہیں آپ نے اور دوسرے بزرگوں نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا اگر سوکھ بھی جائیں تو ان کے بیج برباد نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمارے دلوں میں محفوظ ہیں اور [illegible]

[illegible]

[illegible] تھا اور ایک عجیب سی بات ہے کہ [illegible]

[illegible] اپنے وطن کی خاطر جان دینے کو تیار تھے [illegible] کی آزادی

[illegible] حاصل نہ تھی ۔۔۔ میں اس تعلیمی تحریک کے کچھ آثار یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوا

[illegible] کہ آپ آزادی اور اتحاد کے اس جھنڈے کو بلند رکھنے کے لئے پوری جانفشانی سے

[illegible] اگرچہ آپ کی تعداد کم ہے لیکن دنیا میں اچھے اور سچے آدمی بہت کم ہوا کرتے ہیں۔ میں آپ کو

[illegible] کہ اس قلتِ تعداد کا کچھ خیال نہ کیجئے بلکہ اس بات کو پیش نظر رکھئے کہ ملک کی آزادی

[illegible] آپ کے ذمہ ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے ۔۔۔

[illegible] اور انسانوں سے اور ان کے اس مجموعے سے جسے حکومت یا سلطنت کہتے ہیں بے خوف

[illegible] بچوں کی تعلیم اگر آپ کی اس درسگاہ میں نہیں ہو سکتی ہے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ کہاں ہو سکتی

ہے۔ [illegible] آپ کے پروفیسروں کو خوب جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان چیزوں کی تعلیم ضرور ہوتی ہوگی

۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۶ء تک جامعہ بڑے پرآشوب طوفانوں میں اپنا مٹی کا دیا جلاتی رہی اور خدا کی قدرت سے [illegible] کا تو کیا ذکر ہے اس کی لَو اور تیز ہوتی گئی۔ جن مشکلوں سے جامعہ کو [illegible] میں [illegible] پڑیں۔ ایک ملک کی فضا کا ناسازگار ہونا، دوسرے وسائل کی کمی۔ ملک میں اس وقت سیاست کا [illegible] ایک طرف قومی تحریک بدیسی حکومت سے بے تشدد لڑائی لڑ رہی تھی۔ دوسری طرف ہندو مسلمانوں کی فرقہ وارانہ تحریکیں آپس میں پرتشدد جنگ کر رہی تھیں۔ جذبات کے بہاؤ میں عقل کا تخریب کے سیلاب میں تعمیر کا ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان حالات میں جامعہ کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں تھیں۔

[illegible] ہندوستانی اور خاص طور پر مسلمان زندگی کا چٹخارا جلوسوں، جلسوں اور نعروں میں [illegible] تعمیری کام انہیں پھیکے سیٹھے لگتے تھے۔ جامعہ کی ہمت افزائی کرنے والے [illegible] تھے۔ بہت لوگ جو ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی جامعہ اور اس [illegible] دیکھتے تھے کہ یہ کیسے قوم پرست ہیں جو اپنے کو مسلمان [illegible]

کرتے رہتے ہیں کہ لوگ پوچھتے تھے کہ تم پہلے مسلمان ہو یا ہندوستانی ؟ یا پہلے ہندوستانی [illegible]
[illegible] جواب دیتے تھے کہ ہم پہلے، بیچ میں، ہر وقت اور ہر جگہ مسلمان بھی
ہیں اور ہندوستانی بھی اور انسان بھی تو سمجھتے تھے کہ یہ مذاق کر رہے ہیں یا دھوکا دے رہے ہیں۔
پھر آزادی کی جنگ میں ایسے نازک موقعے آئے کہ جامعہ والوں کا خود بھی جی چاہتا تھا اور ان سے تقاضا
بھی کیا جاتا کہ جامعہ وامعہ کا قصہ چھوڑو اور بے دھڑک آتش نمرود میں کود پڑو۔ ایسا ہی ایک موقع
۱۹۳۰ء میں آیا۔ گاندھی جی کے ڈانڈی مارچ نے ہر محب وطن کے دل کو جوش سے معمور کر دیا تھا۔ جامعہ
کے کارکن بھی، جن کی رگوں میں خون ٹھنڈا سہی مگر پانی نہیں تھا، قومی جھنڈے کے سائے میں [illegible]
کی لڑائی لڑنے کو بے چین تھے۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے، جو یہ جانتے تھے کہ قومی تعلیم بھی
قومی جنگ کا ایک اہم محاذ ہے، انھیں سمجھایا: "جہاں تک جامعہ کے اس تحریک میں حصہ لینے کا تعلق ہے
جامعہ خود جنگ آزادی کے لئے سپاہی تیار کر رہی ہے۔ لیکن مختلف محرکات کا مختلف لوگوں پر الگ
الگ اثر ہوتا ہے یہ ہو سکتا ہے، اور میں جانتا ہوں ایسا ہے، کہ ہمارے بعض ساتھی اس تحریک میں
شرکت کے لئے بیتاب ہوں۔ انھیں ضرور اس میں شریک ہونا چاہیئے لیکن چونکہ ان پر جامعہ کی خدمت
کا فرض پہلے سے عائد ہے اس لئے پہلے انھیں جامعہ سے اجازت لے لینی چاہیئے تاکہ جامعہ اپنے
کام کا انتظام کر لے" چنانچہ جامعہ کی اجازت سے سول نافرمانی میں شرکت کا فرض کفایہ حافظ
فیاض احمد صاحب اور شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم نے ادا کیا اور باقی لوگ اس ہنگامہ دار و گیر میں
جو سارے ملک میں برپا تھا، اپنے کنج عزلت میں خاموشی سے کام کرتے رہے۔

دوسری مشکل جس کا جامعہ کو مقابلہ کرنا پڑا مالی تھی۔ آپ سن چکے ہیں کہ ۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں
کے انتقال کے بعد جامعہ کے کارکنوں نے اس کے چلانے کا بوجھ اپنے کمزور کندھوں پر لے لیا تھا اور خرچ
کو کم کرنے کے لئے اتنی تنخواہوں پر کام کرنے کو تیار ہو گئے تھے جو بمشکل نیم فاقہ کشی کی زندگی بسر کرنے کو
کافی تھیں۔ آمد روپیہ بھی زیادہ تر گاندھی جی اور ڈاکٹر انصاری کی مسلسل توجہ سے اور ڈاکٹر صاحب
[illegible] کے بعض فیاض دلوں کی جان توڑ کوششوں سے بہم پہنچتا تھا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد مدت تک سالانہ

[illegible] سے انہیں محبت تھا۔ مگر [illegible] سے بھی [illegible] ۱۹۴۲ء میں شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم نے انجمن ہمدردانِ جامعہ قائم کی [illegible] کبھی ذاکر صاحب، کبھی مجیب صاحب، کبھی خواجہ عبدالحیٰ صاحب کو ساتھ لے کر ملنے لگے [illegible] دس دس اور چار چار آنے آٹھ آٹھ آنے مہینہ دینے والے غریبوں سے لے کر سینکڑوں روپے دینے والے رئیسوں تک ہزارہا ممبر بنا ڈالے۔ چندے کی رقم کئی ہزار ماہوار تک پہنچ گئی۔ یہ انجمن جامعہ ہی کی طرح ہندوستان میں بلکہ شاید دنیا میں اپنی طرز کا ایک ہی ادارہ تھا۔ اس میں ایسے ممبر بھی تھے جنہیں جامعہ کے مقاصد سے پورا اتفاق تھا، اس کے کاموں کی دل سے قدر کرتے تھے اور جو کچھ دیتے تھے خلوص و عقیدت سے نذر کے طور پر دیتے تھے اور ایسے بھی تھے جو ہمدردانِ جامعہ کے سفیر کے پہنچتے ہی جامعہ والوں اور ان کے سرپرست قومی لیڈروں کو دل کھول کر بے نقط سناتے اور جب وہ غریب چپ چاپ سنتے سنتے تنگ آجاتا اور اٹھ کر چل دیتا تو پکار کر کہتے ارے کہاں چلے آؤ ہمارا نام ممبروں میں لکھ لو اور اپنا چندہ لے لو۔ اور اکثر یہ بگڑے دل ہمدرد کابلیوں سے کچھ زیادہ ہی چندہ دے ڈالتے تھے۔

مگر دیکھئے کہ جامعہ کی آمدنی میں جو اضافہ ہوا اسے جامعہ والوں نے اپنی برائے نام تنخواہوں کے بڑھانے میں صرف کیا ہی نہیں۔ تنخواہیں تو وہی رہیں۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی پچھتر روپے ماہوار اور دوسروں کی اس سے کچھ کم۔ جس ادا اسی طریقے سے کبھی ہر مہینے اور کبھی کئی کئی مہینے بعد اکٹھی ملتی رہیں۔ اس طرح اپنا بھی اور کارکنوں نے جو روپیہ بچایا وہ بھی کھول کر جامعہ کے کاموں کی ترقی میں خرچ کیا۔ چند سال میں ایک طرف تو جامعہ کے پرائمری اسکول اور سیکنڈری اسکول نے کیفیت و کمیت دونوں کے لحاظ سے نمایاں ترقی کی اور جدید تعلیمی طریقوں کے کامیاب تجربوں کی بدولت سارے دیس میں بلکہ ایک حد تک پردیس میں بھی شہرت حاصل کرلی اور دوسری طرف چھوٹے پیمانے پر یونیورسٹی کے ٹھاٹھ نظر آنے لگے ـــــ اپنا چھوٹا سا کالج، اپنا نصاب، اپنا امتحان، اپنا تصنیف و تالیف کا شعبہ اردو اکادمی اور اس کا آرگن رسالہ جامعہ، اپنا

پبلشنگ ہاؤس مکتبہ جامعہ، اور اپنا پریس جس کے منیجر آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک گریجوایٹ تھے۔ جنھوں نے جرمنی میں طباعت کے فن میں مہارت حاصل کی تھی۔ اردو اکادمی کی طرف سے علمی کتابیں شائع ہوتی تھیں اور ممتاز ارباب علم ہر سال لکچر دیتے تھے۔ ایک سلسلہ جامعہ کے ایکسٹینشن لکچرز کا تھا جس کے ماتحت ترکی سے حسین رؤف بکے نے اور خالدہ ادیب خانم اور مصر سے ڈاکٹر بہجت وہبی لیکچر دینے کے لئے آئے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں بیسک ایجوکیشن کے سلسلے میں جس کی اسکیم گاندھی جی کی رہنمائی میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دوسرے ماہرین تعلیم کے ساتھ مل کر بنائی تھی، ہندوستان میں پہلا ٹریننگ کالج جامعہ ہی نے قائم کیا۔ اسی سال شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کی ہمت اور لگن سے بالغوں کی ہمہ گیر تعلیم کا ادارۂ تعلیم و ترقی کے نام سے قائم ہوا جو اُس وقت اُس میدان میں ہراول کی حیثیت رکھتا تھا۔

اسی کے ساتھ ساتھ جامعہ کے فاقہ مستوں نے عمارتیں بنانے کا سلسلہ بھی چھیڑ دیا اور اس میں ہرگز اُس سادگی سے کام نہیں لیا جو وہ اپنے رہن سہن میں برتتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں قرول باغ میں جہاں جامعہ علی گڑھ سے آکر کرائے کے مکانوں میں بسی تھی تعلیمی مرکز کی پہلی عمارت بنائی۔ ۱۹۳۵ء میں اوکھلے میں ببیبول بگھیہ زمین خرید ڈالی اور ایک بہت بڑے اجتماع میں جس میں خالدہ ادیب خانم بھی موجود تھیں مدرسۂ ابتدائی کے سب سے چھوٹے بچے کے ہاتھ سے مدرسے کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھوایا۔ اردو کے نامور شاعر مرزا ثاقب لکھنوی نے وقت کے وقت ایک شعر کہا تھا۔ اس میں جامعہ کے ان طائران بے بال و پر کی آشیاں سازی کی سچی تصویر ہے جن میں محض ہمت پروانہ نے طاقت پرواز پیدا کر دی تھی۔

محل منعم کے سونے سے یہ خون دل سے بنتے ہیں
خس و خاشاک کے یہ گھر بڑی مشکل سے بنتے ہیں

جامعہ کے اُس دور کا جس کا ذکر میں نے آپ کے سامنے کیا نقطۂ عروج نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی سلور جوبلی کا جشن تھا۔ ایسے زمانے میں جب ملک کے کئی حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات

کا وقت اور ملک کی فضا بھی بگڑ چکی تھی جامعہ والوں کو سلور جوبلی منانے کی سوجھی اور وہ بھی اتنے بڑے پیمانے پر کہ سارے ملک سے ہزاروں مہمانوں کو اور عارضی قومی حکومت کے، جو ابھی قائم ہوئی تھی، نائب صدر پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے ارکان کو دعوت دے ڈالی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے زمانے میں اس جنگل میں اتنی بڑی تقریب کیسے ہو سکتی ہے۔ مگر ہمت مرداں مدد خدا۔ جامعہ کے بے شمار ہمدردوں خصوصاً نواب صاحب رام پور اور ان کے چیف منسٹر بشیر حسین صاحب زیدی کے سہارے، اور پنڈت جواہر لال نہرو کے اشارے سے جنگل میں منگل ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خیموں اور شامیانوں کا ایک شہر بس گیا، اور بجلی کی روشنی سے، جو ایک عارضی لائن کے ذریعے شہر سے لائی گئی تھی منور ہو گیا۔ جوبلی کے شاندار جلسے تین دن تک ہوتے رہے۔ اور خاص اجلاس ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کی صدارت میں ہوا جامعہ کے ہزاروں ہمدردوں کے علاوہ، عارضی حکومت کے کانگریسی اور مسلم لیگی ارکان، کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح صاحب جن کا وائسریگل لاج کے علاوہ کہیں اور یکجا ہونا محال تھا۔ ایک پلیٹ فارم پر موجود تھے اور اپنی اپنی زبان میں جامعہ کو مبارکباد اور دعائیں دے رہے تھے۔ کالج کے طلبہ نے اس موقع پر رسالہ جوہر کا جوبلی نمبر نکالا تھا جس میں کئی قومی رہنماؤں کے مبارک باد کے پیام چھپے تھے۔ ان میں سے میں آپ کو پنڈت جواہر لال نہرو کے پیام کے کچھ ٹکڑے سناتا ہوں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ جامعہ نے اپنی پچیس سال کی زندگی میں جو کام کیا تھا اس کی قدر و قیمت ان کی نظر میں کیا تھی۔

"مجھے وہ ۱۹۲۰ء کا زمانہ یاد آتا ہے جب نان کوآپریشن کی تحریک شروع ہوئی تھی اور میں خاص طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو دیکھنے گیا تھا ...... اس وقت میں نے جامعہ پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں اسے عدم تعاون کی تحریک کا تندرست اور چونچال بچہ کہا تھا۔ کچھ سال بعد جامعہ دہلی منتقل ہو گئی۔ یہ اس کے لئے بڑا سخت زمانہ تھا اور اسے قدم قدم پر ناموافق حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے پاس ایک چیز تھی جو اس زمانے میں شاید ہی کسی تعلیمی ادارے کے پاس ہو اور وہ تھی مخلص، ایثار پیشہ اور غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے کارکنوں کی ایک جماعت

جو ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں کام کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرح کے گرم و سرد حالات کے باوجود وہ نہ صرف قائم رہی بلکہ برابر ترقی کرتی رہی اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ اس زمانے میں ایک ایسے تعلیمی ادارے کی بنا رکھی گئی جسے آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کرنی تھی۔ جامعہ بڑھتی رہی، ہر میدان میں ترقی کرتی رہی، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جنھیں پہلے اس کے بارے میں تامل تھا اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے پیش نظر طالب علموں کو محض ڈگریاں دینا نہ تھا بلکہ ان میں ایسے انسانوں کا کردار پیدا کرنا تھا جو اپنی شخصی اغراض سے اونچے اٹھ کر اپنے آپ کو کسی بڑے مقصد کے لئے وقف کر دیتے۔ یہی اس نصب العین کو سامنے رکھ کر اس نے نظام تعلیم کو نئی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے سب سے پہلے ہندوستان کے تعلیمی اداروں کو یہ راہ دکھائی ...... میں تمام جامعہ والوں اور خاص طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے مخلص ساتھیوں کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ جامعہ بڑھے پھولے پھلے اور ہمیشہ اپنے اصول و مقاصد پر قائم رہے اور اس میں ایسے لائق نوجوان تربیت پا کر نکلیں جو سچے معنی میں ہندوستان کے سپوت کہلانے کے مستحق ہوں اور عوام کی خدمت کر کے ان کو زندگی کے بلند معیار تک پہنچا سکیں۔"

یہ جامعہ کی زندگی کا ایک یادگار موقع تھا۔ اس کے بہت سے چاہنے والے اور کچھ تھوڑے سے نہ چاہنے والے خلوص اور انکسار کے جادو سے کھنچے چلے آئے تھے اور اس کی ناچیز خدمات کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کر رہے تھے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت تھا کہ جامعہ مصیبت اور ابتلا کے اس دور میں ہر آزمائش میں پوری اتری۔ آپ ابھی یہ سنیں گے کہ اس سے بھی کڑے امتحان میں جو اگلے چند سال میں ہوا، وہ اسی طرح سرخرو رہی اور اسی طرح جشن چہل سالہ میں جو پندرہ سال بعد ہوا اس کے کاموں کو سراہا گیا۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ اس کا سفر آج بھی ختم نہیں ہوا، ابھی اسے نئی منزلیں طے کرنی ہیں اور نئی آزمائشوں سے گزرنا ہے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

زندگی بڑی سنگدل کا ہے۔ اپنے مال کو بار بار کسوٹی پر کستی اور کٹھالی میں تپاتی رہتی ہے مگر جب تک سونا کھرا ہے ہر آزمائش کی آنچ میں تپ کر اور نکھرتا ہے۔ اگر کچھ میل آ گیا ہو تو چھنٹ جاتا ہے، خالص کندن رہ جاتا ہے۔

جامعہ ۱۹۶۳ء میں

پروفیسر محمد مجیب

حضرت عیسیٰ نے ایک حکایت بیان کی ہے کہ بونے والے نے بیج بکھیرے جن میں سے کچھ پتھریلی زمین میں گرے اور انھیں چڑیوں نے چگ لیا، کچھ کانٹوں میں گرے اور جب وہ پھوٹے اور ان میں سے پودے نکلے تو کانٹوں نے انھیں پنپنے نہ دیا، کچھ زرخیز زمین میں گرے اور ان سے تندرست پودے نکلے۔ تعلیمی حوصلوں کے بیج قومی زندگی کی زمین پر بکھیرے جاتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی یہی پیش آتا ہے۔ جامعہ کی ابتدا کسی ایک حوصلے سے نہیں ہوئی۔ یہ شروع ہی سے حوصلوں کا ایک مجموعہ تھی اور قومی زندگی کی بڑی زمین کے جس ٹکڑے میں اس کے بیج بکھیرے گئے اس میں بھی پتھریلے اور کانٹے دار اور زرخیز حصے تھے۔ اس وقت آپ جامعہ میں جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ انھیں زرخیز حصوں کی پیداوار ہے۔ ہم اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، مگر سوچتے بھی رہتے ہیں کہ یہ پیداوار کافی ہے یا نہیں اور اپنی قسم کی دوسری جگہوں کی پیداوار سے لگا کھاتی ہے یا نہیں۔

آزادی کے بعد ہمیں کئی مشکل کام دیئے گئے۔ دہلی کے شرنارتھیوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مانوس کرنے کی کوشش میں ہم سے پہل کرنے کو کہا گیا۔ ہم نے باڑہ ہندوراؤ میں شرنارتھی اور مسلمان بچوں کو بلایا، انھیں کھیل کھلائے، ان کے ماں باپ کو ان کی خوشی میں شریک کیا۔ اسی سال اسی میں پینتالیس مصیبت زدہ شرنارتھی مرد عورتوں کو استادوں کے مدرسے میں ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا۔ ہم نے ان کے دل کے زخموں کی مرہم پٹی کی، انھیں اپنایا، کام کے قابل بنا کر کام پر لگوایا۔ بالغوں کے لیے لٹریچر کی ضرورت تھی۔ ہم نے ہندی میں تین سو کتابچے تیار کئے، اور حکومت کی ہدایت کے مطابق انھیں مختلف ریاستوں میں بھیجا۔ دشواریوں کے باوجود ہم نے

اپنے اداے سے نئے کام شروع کئے۔ ۱۹۵۲ء میں ہم نے ریسرچ کے دو انسٹی ٹیوٹ، اور انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ ایجوکیشن اور نرسری اسکول قائم کئے، مدرسہ ثانوی کو ملٹی پرپز ہائیر سکنڈری اسکول بنانے کا سلسلہ شروع کیا، اور استادوں کے مدرسے میں بی ایڈ کی تعلیم جاری کی۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ اکثر محسوس ہوا کہ ملک میں ہماری عزت ہے، مگر ہمارے لئے جگہ نہیں ہے، ہم سے لوگ پوچھتے رہیں گے کہ ہم کو حکومت سے امداد کیوں نہیں ملتی، اور ہم اتنے دنوں تک اس سوال کا خاموشی سے جواب دیتے رہیں گے کہ لوگ ہم سے ہمدردی کرنا چھوڑ دیں گے، اس لئے کہ ہمدردی کو بھی کوئی ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ امداد ملنے کا سلسلہ ۱۹۵۰ء سے شروع ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں اس میں اضافہ ہوا، ۱۹۵۴ء میں حکومت نے ہمارے خرچ کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ حکومت سے ہم کو اور حکومت کو ہم سے لگاؤ نہ ہوتا، وزارت تعلیم کا ایک ایک افسر ہمارا ہمدرد اور قدردان نہ ہوتا تو ہم اس امداد کو غنیمت سمجھتے اور یہ سوچتے کہ ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ لیکن جامعہ کی ڈگریوں کی حیثیت نہیں بدلی، اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے دو برس غور کرنے کے بعد طے کیا کہ جامعہ کو اعلیٰ تعلیم کا ادارہ نہیں مانا جا سکتا ہے۔ امداد ملی تو اس طرح کہ گویا ایک فرض ادا کیا جا رہا ہے۔ پھر بھی اسی دوران میں بالغوں کی تعلیم سے متعلق ایک ریسرچ سنٹر اور جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ یہ دو ادارے قائم ہوئے، ہم اپنی ترقی کی راہیں نکالنے میں لگے رہے اور ہمارے حوصلے اور ہمارے صبر نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔

ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ حکومت کی امداد ہمیں جلد ملی ہوتی، ہماری ڈگریوں کی حیثیت اس سے پہلے تسلیم کر لی جاتی تو ہم اب تک بہت زیادہ کام کر چکے ہوتے، ہمارے کالج میں ہزار ڈیڑھ ہزار نہیں تو پانچ سو سے اوپر طالب علم ہوتے، اس کا اسٹاف بڑا ہوتا، ہمارے کتب خانہ کی عمارت ہوتی اور کتابوں کی جو کمی اس وقت ہر طرف محسوس ہوتی ہے وہ تعلیم کے لئے ایک اڑنگا نہ بن جاتی۔ مگر حوصلے کے ساتھ صبر نہ ہونے کے ایسے نتیجے دیکھنے میں آئے ہیں کہ شاید یہی بہتر تھا کہ ہماری آزمائش کی مدت کچھ لمبی ہو جائے۔ مجھے اس وقت ہماری تنخواہوں کا خیال آ رہا ہے

بیشتر اس طرح بڑھی ہیں کہ یہ محسوس نہ ہوا کہ آمدنی میں واقعی اضافہ ہوا ہے یا جامعہ کی ملازمت میں کوئی مالی فائدہ ہے۔ تنخواہوں کے ساتھ تعلیمی وسائل میں اضافہ نہیں ہوا، ۱۹۵۴ء سے پہلے ہم اپنی پچاس ساٹھ فی صدی آمدنی تعلیم کی مزدوروں پر خرچ کرتے تھے، باقی تنخواہوں پر۔ گرانٹ ملنے کے بعد یہ نسبت بدل گئی، صرف اس وجہ سے نہیں کہ تنخواہوں کی رقم بڑھ گئی بلکہ اس وجہ سے بھی کہ بجٹ کی جانچ کرنے والوں نے تعلیمی اخراجات میں کچھ کمی کر دی۔ اس وقت وسائل مل جانے کے باوجود کچھ برا نہ ہوگا اگر چند سال تک ہم پر یہ خیال حاوی رہے کہ تعلیمی خرچ کے لئے روپیہ بہت مشکل سے ملتا ہے، اس لئے بے سوچے سمجھے مانگنا اور بے پروائی سے خرچ کرنا مناسب نہیں ہے، اور اس خیال کی وجہ سے ہماری نظر کاموں پر رہے اور ہم وسائل کے محتاج نہ بن جائیں۔

مجھے اصل خوف اس کا ہے کہ وسائل ملنے کے بعد جو مطالبے ہم سے کئے جائیں گے یا جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوں گی انھیں ہم اس طرح پورا نہ کر سکیں گے کہ ہماری امتیازی حیثیت باقی رہے۔ بیشک ہم نے اب تک شوق اور محنت سے کام کیا ہے، مگر جانچ کرنے والوں نے ہماری مجبوریوں کا بہت لحاظ بھی کیا ہے، ہماری خوبیوں کو سراہا ہے تو ہماری خامیوں سے چشم پوشی بھی کی ہے۔ اس کے بعد میں اب ہماری جانچ نئے انداز سے کی جائے گی، ہم میں خامیاں نظر آئیں گی تو کوئی کہے گا کہ ہم چھوٹے آدمی تھے، چھوٹا ہی کام کر سکتے تھے، کوئی کہے گا کہ دراصل ہم میں اور ان یونیورسٹیوں اور استادوں میں جن کی شکایتیں سارے ملک میں کی جاتی ہیں کوئی فرق نہ تھا، اور اچھی تنخواہیں اور عمارتیں ملنے پر یہ حقیقت ظاہر ہو گئی ہے۔ ہم سے سب سے زیادہ امیدیں ہمارے دوستوں اور ہمدردوں کو ہوں گی، اور یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں تو سب سے زیادہ مایوسی انھیں کو ہوگی۔ بیشک یہ سچ ہے کہ یہ امیدیں کبھی بیان نہ ہوں گی، ہمارے دوستوں اور ہمدردوں کے دلوں ہی میں رہیں گی۔ اب بھی مشورہ تو مل سکے گا، مگر یہ طے کرنے کی ذمہ داری ہمارے ہی اوپر رہے گی کہ ہمیں کیا کیا کرنا چاہیئے اور کس طرح کرنا چاہیئے۔

جامعہ ملیہ کا مقصد صحیح اور سچی قومی تعلیم کا نقشہ اور نمونہ پیش کرنا تھا۔ یہ ایسا مقصد نہیں ہے جو کسی وقت بھی پورا پورا نظروں کے سامنے آسکے۔ ہم دراصل وہ تعلیمی کام کرتے رہے ہیں۔ جو مفید تھے اور جنھیں انجام دینا ہمارے بس میں تھا۔ ہماری خصوصیت شاید یہ تھی کہ ہم سمجھتے رہے کہ یہ طے کرنا ہمارا فرض ہے کہ کون سے تعلیمی کام مفید ہیں، اور اسی وجہ سے ان کی ذمہ داری لیتے وقت ہم نے اپنی مشکلوں اور مجبوریوں کا خیال نہیں کیا۔ اب ہمیں نئے سرے سے اس پر غور کرنا چاہیئے کہ صحیح اور سچی تعلیم کیا ہے اسے قومی رنگ کیسے دیا جا سکتا ہے، اور جامعہ کس طرح اس کا نقشہ اور نمونہ پیش کر سکتی ہے۔

میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں ان سوالوں کے جواب دے سکتا ہوں، میں بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جامعہ کا اصل مقصد صرف اس صورت سے پورا ہو سکتا ہے کہ ہم جو کچھ سوچیں اور کریں اس میں ہمارا محرک یہ احساس ہو کہ ہمیں ان تین بنیادی سوالوں کا جواب دینا ہے، ورنہ تعلیم کا مطلب نصاب کے مطابق پڑھانا اور قاعدے کے مطابق امتحان لینا ہوگا، اور یہ ایسا طریقہ ہے جس میں تعلیم کے صحیح اور سچے ہونے کا سوال نہیں اٹھتا، صرف امتحان کے نتیجے دیکھے جاتے ہیں، قوم کا ذکر دو چار مرتبہ تقریروں میں کر دیا جاتا ہے، اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ تعلیمی ادارہ جیسا بھی ہو، اسے ایک نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

اس سوال کا جواب کہ صحیح اور سچی تعلیم کیا ہے صرف اچھا اور سچا استاد دے سکتا ہے۔ ہم کو بہت سی کتابوں میں ایسے استاد کی شخصیت کے خاکے مل جائیں گے۔ گویا بہت سی خوبصورت مورتیاں بنی ہیں جنھیں دیکھ کر ہم اپنی صورت شکل درست کر سکتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ حسن ہوتا ہے تو اپنا ہی ہوتا ہے، مانگا یا چرایا، یا نقل کر کے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ اپنی کسی اچھی عادت کے بارے میں کہتے ہیں کہ انھوں نے اسے فلاں کو دیکھ کر اور اس سے اثر لے کر اختیار کیا ہے وہ دراصل یہ کہتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں ایک خوبی تھی جس کا انھیں احساس کسی دوسرے شخص کی وجہ سے ہوا۔ میں ان لوگوں کو جو میری طرح دفتر میں نہیں بیٹھے رہے ہیں، بلکہ اپنے علم کو طالب علموں تک پہنچانے میں مسلسل لگے رہے ہیں اور اس کے ساتھ جو دکھ سکھ وابستہ ہے اسے سہتے رہے ہیں،

نصیحت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بس ان سے یہ یاد رکھنے کی درخواست کر سکتا ہوں کہ اچھا اور سچا استاد بننا بہت مشکل ہے، کیونکہ ایسے استاد کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ خود اچھا اور سچا آدمی ہو، اسے عالم ہونا چاہیئے، تعلیم کو ایک فن کی طرح برت سکے، اور اپنی شخصیت کو تعلیم کی مصلحتوں اور ضرورتوں کے مطابق ڈھال سکنا چاہیئے۔ ہمارے ملک میں ہزاروں اچھے اور قابل استاد ہوں گے جنھیں اس بات کا خیال نہیں آتا کہ انھیں ایسی نظر پیدا کرنا چاہیئے کہ ان کا ہر طالب علم یہ سمجھے کہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں، لاکھوں ایسے استاد ہوں گے جو طالب علم کی ہمدردی میں کوشش کرتے ہیں کہ علم حاصل کرنا آسان کر دیں۔ کسی استاد کو کتابی علم کی زیادتی طالب علموں سے دور کر دیتی ہے، کوئی اپنا علم ناپ کر بس اتنا ہی رکھتا ہے جتنا کہ کلاس کو اطمینان سے پڑھانے کے لئے درکار ہو۔ دل اور دماغ کو بے چین کرنا، حقیقت کی تلاش میں بے تاب کرنا، رات کے اندھیرے میں صبح کی امید دلانا، دل کی روشنی میں تاریکی کے امکان سے ڈرانا، یہ اب استاد کے کام نہیں سمجھے جاتے، اور شاید کوئی سوچتا بھی نہیں کہ انھیں تعلیم سے نکال دیجئے تو پھر نصاب اور امتحان کی غلامی کے سوا کیا باقی رہتا ہے۔

میں کئی سال سے جامعہ کے استادوں کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تجربے کرنا اور نئے طریقے برتنا کافی نہیں ہے، انھیں ان تجربوں اور طریقوں کو رسالے اور کتابیں لکھ کر محفوظ کر لینا اور علمی دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ اب تک میری نظر میں بیشتر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مسائل تھے، اب کالج، استادوں کے مدرسے اور آرٹس انسٹی ٹیوٹ کے تعلیمی مسائل بھی ہیں۔ ہمارا ایک فرض سا ہو گیا ہے کہ ہر مضمون پر جو جامعہ میں پڑھایا جاتا ہے اردو ہندی میں ایسی کتابیں لکھیں جن کا مقصد ان زبانوں پر احسان کرنا نہ ہو بلکہ جو دنیا کے علمی معیار پر پوری اترتی ہوں۔ ہمارے کام کو سند نہیں مانا جائے گا اگر ہم انگریزی میں لکھنے سے معذور رہے، اس لئے جامعہ سے انگریزی میں بھی معیاری کتابیں شائع ہونی چاہئیں۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ لکھنے والا کتاب لکھ کر بیٹھ جائے، اب اچھی کتاب آسانی سے چھپ سکتی ہے اور بک سکتی ہے۔ اب ہم اپنے اس عقیدے پر پوری طرح عمل کر سکتے ہیں کہ پڑھے لکھے ہندوستانی کو اردو، ہندی، انگریزی تینوں

زبان میں بے تکلفی سے برتنا اور لکھنا چاہیئے، اور اردو ہندی کے جھگڑوں کو اس طرح ختم کرسکتے ہیں کہ بیان کا ایک طرز اختیار کریں جو علم کی شرطوں کو پورا کرے اور قابل قبول بھی ہو۔

مگر یہ ہمارے کام کا صرف ایک حصہ ہے۔ اس سے ہماری تعلیم میں خوبیاں پیدا ہوسکتی ہیں، ہم علم کی خدمت کرسکتے ہیں، قومی تعلیم گاہ کہلانے کے مستحق ہم تبھی ہوں گے جب قومی زندگی کا ہر پہلو اور ہر بڑی ضرورت ہماری نظر میں ہو۔ ہمارے ملک میں مذہبی تعصب اب تک موجود ہے، ایک سلگتی آگ کی طرح جس کے شعلے کسی وقت بھی بھڑک سکتے ہیں، زبان اور نسل کے پیدا کئے ہوئے تعصب موجود ہیں، ان کی شدت ہم آسام اور بمبئی میں دیکھ چکے ہیں، ذات پات کا خیال اس طرح حاوی ہے کہ بعض ریاستوں میں وزارت نہیں بن سکتی جب تک کہ اس میں ہر ذات کے لوگوں کی کافی نمائندگی نہ ہو، اور بہت سے حلقوں میں شہریوں کا نمائندہ وہی چنا جاسکتا ہے جس کی ذات کے لوگوں کی اس حلقے میں اکثریت ہو۔ بھلے آدمی ایسی ناگوار باتوں کا ذکر افسوس کے ساتھ کرتے ہیں، اور ان کے دلوں میں یہ خوف بھی ہوتا ہے کہ ان کا چرچا ہوا تو فساد بڑھے گا۔ استاد قومی زندگی کے ان عیبوں سے واقف ہیں، مگر ان کی اصلاح کرنا استاد اور تعلیم کا منصب نہیں سمجھتے۔ ہم بھی کچھ زیادہ نہیں کرسکتے، لیکن تعلیم کے سلسلے میں اپنے طالب علموں کو مختلف طریقوں سے ان قومی خطروں کی طرف متوجہ کرسکتے ہیں، اور رفتہ رفتہ جامعہ میں ایسی فضا اور ایسی ذہنیت پیدا کرسکتے ہیں کہ تعصب کی بیماری پھیل نہ سکے۔

لیکن ایسی ذہنیت پیدا کرنے میں ہمیں دشواریاں بھی پیش آئیں گی، اس لئے کہ آج کل ہر طرف رشتے ٹوٹتے نظر آتے ہیں اور استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی کچھ ٹوٹ سا گیا ہے۔ دوسروں کا لحاظ کرنا، چاہے وہ اپنے ہوں یا غیر، برابر کے یا بزرگ، اس طرح بات کرنا کہ دوسرے پر اچھا اثر پڑے، طبیعت کو قابو میں رکھنا، چاہے کوئی غصہ دلانے والی بات کرے، یہ قاعدے آج کل کی تربیت اور تعلیم میں شامل نہیں سمجھے جاتے، یونی ورسٹیوں میں طالب علموں کا ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر ہنگامے کرنا کوئی عجیب یا انوکھا واقعہ نہیں مانا جاتا۔ جامعہ ایک ایسے دور سے صحیح سلامت گذر چکی ہے جب حکومت اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی، حکومت سے واسطہ رکھنے والے مسلمان اس سے ڈرتے تھے، ہندو اسے مسلمانوں

کا ادارہ سمجھ کر اس سے الگ رہتے تھے پھر ایک دور آیا جب مسلمان اسے کانگریسی ادارہ سمجھتے تھے، اور چند ممتاز لیڈر و طلبا کے سوا کانگریسی اس کے رویہ سے مطمئن نہ تھے۔ اس دور میں جامعہ کو ہمت اور سچائی نے برقرار رکھا لیکن اب اس نئے دور میں جو جمہوری کہلاتا ہے صرف جامعہ ہی نہیں بلکہ ہر تعلیم گاہ کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ صرف غرض کا رشتہ صحیح اور قائم رکھنے کے قابل مانا جاتا ہے۔ ترقی کی غرض استاد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے، اور جگہ نہیں بدلتی تو بھی استاد اور یونیورسٹی کا رشتہ غرض کا رشتہ ہوتا ہے۔ طالب علم داخل لیتا ہے تو ڈگری لینے کی غرض سے، علم حاصل کرنے کے شوق میں نہیں، اور جس بات کا امتحان اور ڈگری سے تعلق نہ ہو اس سے اسے کوئی خاص واسطہ نہیں ہوتا۔ تہذیب انھیں غیر ضروری چیزوں میں سے گنی جاتی ہے، اس کے خریدار کم ہیں اور اندیشہ ہے کہ کم ہوتے جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تعلیم کو تہذیب سے الگ کیا گیا تو وہ ایک کاروبار، ایک دھوکا بن کر رہ جائے گی، لیکن تعلیم کو تہذیب سے وابستہ وہی استاد رکھ سکتے ہیں جو تہذیب کے لئے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں جو اپنی محنت کا طالب علم سے معاوضہ نہ مانگیں، جو ایسے طالب علموں سے بھی محبت اور شفقت برتیں جو ان کی عزت نہیں کرتے یا اگر کرتے ہیں تو اس طرح کہ اس کا احساس نہیں ہوتا۔

جامعہ کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہاں استاد اور شاگرد کا رشتہ اب تک قائم ہے یہی نہیں، بلکہ جامعہ چھوڑنے کے بعد یہ رشتہ قائم رہتا ہے، اور رفتہ رفتہ جامعہ کی ایک تعلیمی امت بن رہی ہے۔ اس امت میں ہر طبقے، ہر مذہب، ہر پیشے کے لوگ ہیں۔ ابھی تک جامعہ کی طرف سے ان پرانے طالب علموں سے جامعہ کے اخلاقی اور تہذیبی تصورات کا پرچار کرانے میں مدد لینے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی ہے، مگر مجھے پوری امید ہے کہ یہ کوشش سلیقے اور استقلال کے ساتھ کی گئی تو بہت بارآور ہوگی۔ تاسیس کے جلسے میں کئی مرتبہ نئے طالب علموں نے جامعہ کی زندگی کے بارے میں جو خیال ظاہر کئے اس سے یقین ہوتا رہا ہے کہ اخلاق اور تہذیب کا برا بھلا نقشہ جو یہاں نظر آتا ہے وہ بھی تسلی اور ہمت افزائی

کے لئے کافی ہے۔ ہمارے اوپر فضا کا اثر ہوتا ہے کوئی سال اچھا ہوتا ہے کوئی نہیں ہوتا، لیکن جب حساب لگاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حوصلوں کی شادابی کم نہیں ہوئی ہے۔

اس سال جامعہ کے کئی ہمدرد انجمن، مجلس منتظمہ اور مجلس تعلیمی کے رکن بن کر ہمارے بہت قریب آگئے ہیں بلکہ ایک نے خازن کا صبر آزما کام اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پندرہ برس کے بعد اس سال سے امیر جامعہ کا عہدہ قبول کرکے وہی شخصیت ہماری سرپرست بن گئی ہے جس نے جامعہ میں قومی تعلیم کو منصوبوں اور اداروں کی شکل دی، ہمیں فاقہ مستی کے آداب سکھائے، اور علم، اخلاق اور مروت کی ایسی مثالیں پیش کیں کہ جامعہ کی امکانی عظمت کا نقشہ آنکھوں میں پھرتا رہا۔

میں جامعہ کی برادری کو یوم تاسیس کی مبارک باد دیتا ہوں۔

مُغلیہ زمانے میں ہندو مُسلم برتاؤ اور تیوہار

جناب جنگ بہادر سنگھ

(پیشِ نظر مضمون میں شری جنگ بہادر سنگھ نے جو جامعہ کے قدیم طالب علم ہیں مغلیہ زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں میٹھے اور محبت سے لبریز آپسی تعلقات کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔ نئے ہندوستان کی تعمیر میں ہمیں اس طرح کے تعلقات کی بیحد ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اسے قائم کرنے میں ہمارے ادیب بہت ہی اہم حصہ لے سکتے ہیں، اور قومی تعمیر کے کام میں ان کی خدمات بیش قیمت ثابت ہوسکتی ہیں موصوف نے یہ مضمون آزادی سے پہلے لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ جناب شیلم سروپ شرما استاد جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ نے دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کی ایک ہندی کی کتاب سے کیا ہے۔ ترجمے میں مضمون نگار کے انداز بیان کو زیادہ سے زیادہ باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے)۔

مغلیہ زمانے میں ہندو مذہب اور اسلام کے لپٹ چپٹ کر ملنے سے جو ملی جلی تہذیب بنی، اس کا جلوہ اس ملک کی ہوا، مٹی اور پانی میں ظاہر ہوا۔ اس وقت نہ ریل گاڑیاں تھیں اور نہ ریلوے سٹیشن ہوتے تھے۔ نہ پیاسے مسافروں کی پیاس بجھانے کے بجائے پانی کے بجھوسے گھڑے چھلک چھلک کر کہتے تھے، "ہندو پانی، مسلم پانی"۔ تب پالکیاں چلتی تھیں یا چنڈول چلتے تھے، دونوں ہی آدمیوں کے کندھوں پر چلتے تھے، یا ہاتھی کی جوڑی، ورنہ اونٹ کی کبڑی پیٹھ پر انباریاں چلتی تھیں جن میں سوار ہوکر لوگ منزل پر منزل پار کرتے تھے۔ سپاٹے بھرنے کے لئے تیر سے بھی تیز دیے گئے، وہ گھوڑے استعمال کئے جاتے تھے۔ عورتیں بھی گھوڑ سواری کرتی تھیں۔ ازبک اور تاتاری عورتیں جو سفر میں مغل بادشاہوں کے حرم کی حفاظت کے لئے متعین ہوتی تھیں، پکی گھوڑ سوار ہوتیں۔ راجپوت

عورتیں بھی گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا سے باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ سواریوں میں ہی نہیں، کچھ لباسوں میں بھی مغلوں کے زمانے میں اسی طرح کی ہندو مسلم یکسانیت ہو گئی تھی کہ دو چار کو چھوڑ کر باقی کی یہ کچھ مشکل تھی کہ کون ہندو پوشاک ہے اور کون مسلم۔ فارس جہاں سے مغل آئے تھے۔ ڈھیلم ڈھال کپڑوں کا گھر تھا۔ ہندوستان میں مغلوں نے بدن سے چپکے ہوئے کپڑے پہننے شروع کر دیئے۔ آہستہ آہستہ جسم کی تراش کے ساتھ کپڑے کی کاٹ چلنے لگی۔ راجپوتوں اور مغلوں کے کپڑے اور زیورات وغیرہ دیکھ کر ایک دم یہ بھی کہنا مشکل تھا کہ کون راجپوت رانی ہے اور کون مغل ملکہ۔

میں نے آج کل کے ریل کے مسافروں اور ہندو پانی اور مسلم پانی سے بات شروع کی، پھر مغلیہ زمانے کے گھوڑ سوار مسافروں کے پاس پہنچ کر بھٹک گیا۔ اس زمانے میں مسافروں کو، ایسے مسافروں کو جن کے حلق اور زبان پر پیاس کے کانٹے اُگ آئے ہوں، پیاس بجھانے اور تسکین حاصل کرنے کے لئے پنگھٹ کی پناہ لینی پڑتی تھی۔ وہاں کنوؤں سے ہندو پانی اور مسلم پانی کی گونج نکل کر فضا کو زہریلے نہیں بناتی۔ وہاں پاک دامن خوب صورت دوشیزاؤں کی دلفریب مہمان نوازی میں جو وہ اپنے فراخ کلسوں سے ڈھلکا ڈھلکا دیتی تھیں، سب تفرقات ڈوب جاتے تھے۔ اس مطلب کی ترجمانی کرنے والی، مغلیہ زمانے کی ملی جلی زندگی کی ایک زندہ جاوید تصویر لاہور کے میو سکول آف آرٹس کے پرنسپل خانصاحب میاں محمد حسین کے پاس ہے، جو تقریباً تین سو سال پرانی ہے اور اس وقت اور اس سے کچھ پہلے کے تفکر و تدبر کی ایک جھلک ہمیں اس میں دکھائی دیتی ہے۔ دُور ایک پہاڑی کے دامن سے لگی ہوئی مسافروں کی ایک لین دوڑی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شہزادی پالکی میں مرنے میں بیٹھی ہوئی چلی جا رہی ہے اور اس کے نوکر اور محافظ پیدل اور گھوڑوں پر اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔ جو ذرا نزدیک کی پہاڑی ہے اس کے پاس ایک سفید گھوڑے پر ایک رانی سی اور ایک مٹیلے گھوڑے پر ایک راجا جیسا شخص ہے، بالکل نزدیک ایک پیارا پنگھٹ ہے۔ یہ پنگھٹ کا نظارہ ہی اس تصویر کی جان ہے۔ پنہاریاں یا منہاریاں کنوے کے سینے پر جمی ہیں اور کچھ کھڑی ہیں۔ ہر ایک ایسی ہے جیسے خوبصورتی کے رس سے بھری ہوئی سونے کے کلس۔ سب ہی

سکے چہرے سے پاک اور سادہ زندگی کی بے خوبی اور پاکیزگی ٹپکتی ہے۔ سب کی سب ہندو شہری معلوم ہوتی ہیں۔ پاس ہی ایک چنچل گھوڑے پر سوار ایک نوجوان کھڑا ہے۔ وہ کوئی مسلمان شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ عزت دار مسافر کے چہرے سے اس کے کردار کی بلندی صاف ٹپکے ہی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مانگ رہا ہے۔ اس تصویر کی پنہاریاں یوں کہتی سی معلوم ہوتی ہیں —— دیکھو جناب، کیا پانی چاہیئے؟ ٹھہریئے، ٹھنڈا پانی بھی ملے گا اور میٹھی محبت بھی ملے گی۔ اس زمانے کی یہ کیسی عمدہ تصویر ہے! موجودہ زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک ضروریات کو جب ہماری آنکھیں تلاش کرتی ہیں تو وہ ہندو پانی اور مسلم پانی کے گھڑوں کا اکھاڑہ دیکھتی ہیں، جہاں وہ کم بخت گھڑے ٹکراتے ہیں اور ٹوٹتے ہیں۔

مغلیہ حکومت کی مشعل ابھی اچھی طرح روشن بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہندو مسلم محبت کی شیریں دھار نے راجپوتانے کی ریگ کو تر بتر کر دیا۔ ایک مصیبت زدہ راجپوتنی کی راکھی منظور کر کے ہمایوں نے بہن بھائی کی پریت کی ریت دل وجان سے نبھائی۔ وہ ہندوستان مسلم شان بن گیا۔ اگر اُن دنوں کی ہندو مسلم تہذیب بغیر ٹوٹے پھوٹے، پڑھتے بڑھتے ہوئے آج تک چلی آتی تو ہندوؤں اور مسلمانوں کا آج بھی وہی راکھی والا پیارا رشتہ قائم ہوتا۔ انفرادی برتاؤ ہی میں نہیں سماجی تیوہاروں میں بھی مغل بادشاہوں نے ایسی مثالیں سماج کے سامنے پیش کیں جو مستقبل کی راہوں کو پُر نور کرنے والی مشعلیں بن گئیں۔ مغل بادشاہ جس تپاک، خلوص اور ہنسی خوشی سے مسلم تیوہار میں حصہ لیتے تھے۔ اُسی جوش وخروش اور پیار ومحبت سے ہندو تیوہاروں میں بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ اکبر تو بیچارے تعصب کی ایسی دنیا میں جہاں نہ کبھی آزاد خیالی کی ہوا چلتی ہے اور نہ علم کی روشنی پھیلتی ہے، اپنی مذہبی درپادلی کے لئے بدنام تھے۔ اور بدنام ہیں۔

دُنیا کی بڑی ہستیوں کی ایسی بدنامی ہی انسانیت کو سُکھ چین دینے والے تمدنی رشتے کا سنگ بنیاد ہوتی ہے۔ لیکن اکبر ہی نہیں اس کے لڑکے جہانگیر بھی —— جنھوں نے مختلف مذہبی اصولوں کو ملا کر اپنی مرضی کے مطابق ان کا عرق نکالنے کی کوشش نہیں کی —— ہندو

تیوہار بڑی شان و شوکت اور دھوم دھام سے مناتے تھے۔ انھوں نے تزکِ جہانگیری میں لکھا ہے ——— "سنیچر کو دسہرہ پڑا۔ اس روز شاہی گھوڑے خوب سجائے گئے اور ان کا شان سے جلوس نکالا گیا......" تیوہار کی دلچسپی کی طرح جہانگیر کا دلچسپ بیان چلتا ہے۔ دسہرے کی کی ہی نہیں دیوالی کی بھی مغل بادشاہوں کی زندگی میں اونچی جگہ تھی۔ شاید ہر سال کی گردش پوری ہونے پر ان کے بلند حوصلوں سے دیپ مالائیں جھم جھم چمک کر ہندو مسلم تمدنی دوستی کی روشنی پھیلاتی تھیں۔ پرانی مغل تصویروں کو ہوشیاری سے محفوظ رکھنے والی دہلی کی امرا لینڈ شوگر کمپنی کے پاس ایک غیر معمولی تصویر ہے، جس میں نور جہاں بیگم دیوالی مناتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ تصویر پرانی ہے، اورنگ زیب کے وقت کی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس وقت بھی دیوالی دھوم دھام اور شان و شوکت سے منائی جاتی تھی۔ نور جہاں مصوّر کے سامنے چاہے منہ کھول کر نہ آئی ہوں، اُن کا عکس بھلے ہی خیالی ہو، لیکن دیوالی ضرور اس کے سامنے لاتعداد نوبیں بن کر آئی، اس کی مصوری سچی ہے۔ مغل بادشاہ اور ملکہ یہ تقریب تیوہار دل کھول کر منایا کرتے تھے۔

لندن کے چیسٹر بی ٹی کے تصاویر کے بیش قیمت مجموعے ہیں، جو شاہجہاں کے البم سے لی گئی ہے، ایک ایسی دل کو گدگدانے والی تصویر ہے جس میں جہانگیر کو رنگ محل میں ہولی کی رنگ رلیوں میں مست پیش کیا گیا ہے۔ وہ تصویر قابلِ دید ہے۔ اُس میں جہانگیر دیکھتے ہی پہچانے جاتے ہیں، چہرے میں ہندوستانیت زیادہ اور تیموریت کم، کان میں موتی، پگڑی پوشاک دونوں ہندوستانی۔ اغل بغل سامنے ہندو اور مسلمان لڑکیوں کا چھوٹا سا، پر بڑا شرارتی میلا، دو ہی لڑکیوں کے بارے میں پوری طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ کیونکہ ان کے سروں پر ترکی ٹوپیاں جلوہ دکھا رہی ہیں۔ اور بھی مسلمان لڑکیاں اس چلبلے جھنڈ میں ہوں گی لیکن ان کو پہچانا کیسے جائے؟ ہندوؤں اور مسلمانوں کی پوشاک اور زیورات میں کوئی فرق رہ گیا ہو تب تو ان کے ذریعے سمجھا جائے کہ کون کون ہے؟ سب نے یا تو کرتیاں پہن رکھی ہیں یا انگیا اور لہنگے۔

کہتے ہیں کہ انگیا اور لہنگوں کی بہار مغلوں نے راجپوتوں میں دیکھی اور وہ ان کے دلوں پر کچھ ایسی چھا گئی کہ مغل محلوں میں انگیا کسکنے اور لہنگے لہرانے لگے۔ تصویر میں ان کی کسکن اور لہر دن کے ساتھ ہولی کے جوبن کا چڑھاؤ دکھایا گیا ہے۔ جہانگیر کے ایک طرف ایک لڑکی ہے اور دوسری طرف دوسری اور آنگن میں طرح طرح کے رنگوں کی پچکاریاں چل رہی ہیں۔ رنگ برنگ ابیر اور گلال کی مٹھیاں کھل رہی ہیں۔ ایک حسینہ لوچ کی کمان بنی پچکاری چلا رہی ہے۔ دوسری ویسی ہی بنی پچکاری بھر رہی ہے۔ تیسری، چوتھی، پانچویں ..... شرارت کی پڑیا۔ بنی ہوئی سہیلیوں کے کھڑے رنگوں سے رنگے ہی ہیں۔ سفید چاندوں کو لال، نیلے چاند بنا رہی ہیں۔ پاس ہی ہولی کی ترنگ کے ساتھ ساز و سنگیت چل رہا ہے۔ ایک دوشیزہ دف بجا رہی ہے اور دو مہ جبین خواتین چنگ بجانے میں مشغول ہیں۔ جس ملک کی ہولی ہے اس ملک کے یہ دونوں ساز نہیں ہیں۔ لیکن مزا یہ ہے کہ اس کے ساتھ چل خوب رہے ہیں۔ جہانگیر وغیرہ مغل بادشاہوں نے اس طرح تمدنی مرکب سے محبت کا جو امرت پیدا کیا ہے اُسی سے آج کل کے ہندوستانی سماج کی سوکھتی زندگی کو تراوٹ مل رہی ہے۔

تزکِ جہانگیری میں مغل شہنشاہ نے اپنے والد کی چلائی ہوئی ایک ایسی رسم کا ذکر کیا ہے جس میں مسلمانوں کے جذباتی جوش کی نازکی اور مذہبی خوشی کے ساتھ ہندوؤں کے اہنسا کے اصول کی نہایت خوبصورت آمیزش ہوئی ہے۔ ہر سال ربیع الاول کی ۱۸ویں تاریخ سے جو اس کی تاریخ پیدائش تھی مسلسل کئی دن تک جانوروں کو ذبح نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے جمعرات اور اتوار کو ـــــ دو دن کہیں کوئی قربانی نہیں کر سکتا تھا۔ اس رسم کی سیاسی اور سماجی اہمیت جو تھی، وہ تو تھی ہی، اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی بہت قیمت تھی۔ یہیں دودھ گھی سونگھنے کو مشکل سے ملتے ہیں۔ ہمارے بزرگ دودھ میں نہاتے اور گھی کے چراغ جلاتے تھے۔ کتنا روشن اور پرنور تھا یہ ہندو مسلم تمدن؟ خیرات کا رواج اسلام کے ساتھ اس طرح چپاں ہے جس طرح ہندو مذہب کے ساتھ: تُلادان کی پرانی ہندو رسم کو مغل بادشاہوں نے درباری جشنوں و جلسوں کا ایک خاص حصہ بنا کر اصول کے لحاظ سے کوئی نئی بات نہیں کی لیکن اس سے انھوں نے ہندو مسلم تمدنی دوستی پر غیر فانی شاہی مغل مہر لگا دی۔ اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک ہر ایک مغل بادشاہ تُلادان کا جشن منایا کرتے تھے۔ ریشم کی ڈوریوں والے سونے کے ترازوؤں میں خاص خاص دن

بیٹھ کر وہ خود کو سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات وغیرہ سے تلواتے تھے اور لا محدود دولت سادھو سنتوں اور غریب غربا میں تقسیم کر دیتے تھے۔ وہ لوگ تلادان منانے کے لیے بہانوں کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ کوئی دعوت یا ضیافت کا موقع آیا نہیں کہ تلادان ہوا نہیں۔ نوروز کے موقعے پر جو تلادان ہوتا تھا وہ پرشین چوکھٹے اور شیشے میں جڑی ہوئی ہندوستانی تصویر سا لگتا تھا۔ یوں تو بہت ہی پرانی پوتھیوں کی کہانیوں کے مطابق ایرانی نئے سال نوروز کی ابتدا میں بھی ہندوستانی اثر پایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں جمشید جنھوں نے نوروز چلایا اور کوئی نہیں ہندو کہانیوں میں پائے جانے والے وہی یم راج تھے۔ جب ایران میں نوروز منانے کا رواج چلا تب لوگوں کی خوشی رنگین، خوشبودار پانی کے فوارے بن کر اور رنگ اور چمک کی آتش بازی بن کر چھوٹی۔ نوروز کیا ہوتا تھا، ایرانیوں کی ہولی دیوالی ایک ساتھ ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے پر رنگ دار پانی ڈالتے تھے اور روشنی اور آگ کے تماشے کرتے تھے۔ جب اسلام ایران میں آیا تو اس نے ایران کو عید الفطر اور عید الضحیٰ دیا اور ایران کا نوروز اپنا لیا۔ اسلام نے نوروز کے موقعے پر نہ جانے کتنے سال اپنی آنکھوں کے سامنے خوشی سے ہولی دیوالی ہوتے دیکھی۔ لیکن جب خلیفہ معتضد باللہ نے یہ دیکھا کہ رنگ کھیلنے کے بہانے لوگ بیوقوفیاں کرتے ہیں اور گندگی پھیلاتے ہیں اور آتش بازی ایسی خطرناک لاپرواہی سے چھوڑتے ہیں کہ لوگوں کی جان جوکھم میں پڑ جائے تب انھوں نے رنگ کھیلنا اور آتش بازی چھوڑنا مذہب کے خلاف قرار دے دیا۔ ویسے اسلام تنگ نظر نہیں۔ آخر اس نے عید الضحیٰ کو جسے پہلے سے ہی مکّہ کے حاجی مناتے آئے تھے۔ فوراً اپنا لیا تھا۔ حضرت محمدؐ نے بغیر ہچکچائے قربانی کے تیوہار کو جائز قرار دے دیا تھا۔ ویسے تو عید الفطر ہی جو لمبے برت کا تیوہار ہے اصل مسلم تیوہار ہے۔ شب برات منانا چھوٹی موٹی دیوالی منانے کے برابر ہے۔ اُسے منانے میں مسلمان لوگ خلیفہ معتضد باللہ کے نوروز والے حکم کو بھلا کر دنادن پٹاخے داغتے ہیں، پھر جھیرا نار چھوڑتے ہیں اور شُوں شُوں چھچھوندریں دوڑاتے ہیں۔ شب برات ہندوستان کی دیپ مالا سے سنوری ہوئی تہذیب میں خوب ہی کھپ گیا۔ اور عید بھی ہندوستان کی برت دھاری زندگی میں آسانی سے سما گئی۔ مغلیہ زمانے میں عید، شب براتؔ، نوروز بسنت، ہولی، دیوالی، شورا تری، دسہرہ وغیرہ بادشاہ اور رعایا سب بہت محبت اور مزے سے مناتے تھے۔

خلیفہ معتضد باللہ نے جب کہا کہ رنگ نہ کھیلو تو ان کا یہ مطلب تھا کہ اصولوں کی بلندیوں سے گر کر اپنا منہ کالا نہ کرو۔ اگر سبھی ہندو اور مسلمان بھائی چارے اور بہناپے کے رنگ میں ڈوب کر سرخ رو ہو جائیں تو خلیفہ صاحب کی روح انھیں بخوشی دعائیں دے گی۔ وہ چراغ جس سے ہندوستان میں آگ لگے، نہ پیچھے مسلمان کو لپیٹ میں آئے گا اور نہ پیچھے ہندو کو۔ مغل بادشاہوں نے دیوالی کے موقع پر ہند و مسلم محبت کا وہ چراغ روشن کیا کہ جس سے ہمارا راستہ آج تک روشن ہے۔ اُسے بجھا دیں تو یہ ہماری بہت بڑی بیوقوفی ہوگی۔ مغل بادشاہوں نے عید کے موقع پر ایسی سِنوئیاں بانٹیں کہ جس سے ہمیں آج بھی طاقت اور تازگی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں ہم من ماؤں کے بچھو کے ڈنک اور دشمنی کے سانپ کے پھن ملا دیں تو یہ ہمارا خطرناک پاگل پن ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی

کے باہمی تعلقات اُن کے خطوط کی روشنی میں

عبداللطیف اعظمی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے خطوط بنام مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ابھی ابھی شائع ہوئے ہیں[1]۔ مشاہیر کے خطوط کو، چاہے وہ نجی ہوں یا ادبی اور علمی، آج کل بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ اہمیت پہلے بھی تھی مگر صرف اہم اور مشہور ادیبوں کے خطوط شائع کئے جاتے تھے اور وہ بھی انتخاب کے بعد لیکن آجکل اہم اور غیر اہم کا امتیاز اٹھ گیا ہے اور ہر خط، چاہے وہ کیسا ہی ہو، بلا تامل شائع کر دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان خطوط کو بھی بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے جنھیں غیر اہم ہونے کی بنا پر یا کسی مصلحت کی وجہ سے خارج کر دیا گیا تھا اور جس طرح آجکل رسائل زندہ ادیبوں اور شاعروں کے نمبر نکالنے لگے ہیں، اسی طرح مکتوب نگاروں کی زندگی ہی میں ان کے خطوط شائع کر دئے جاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مکتوبات سلیمانی کی اشاعت اختلافی مسئلہ بن گئی ـــ جہاں تک مجھے معلوم ہے رفقائے دارالمصنفین ان خطوط کی اشاعت کو مصلحت اور دوراندیشی کے خلاف سمجھتے تھے، دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض معتقدوں کو یہ خیال گزرا کہ مولانا عبدالماجد ان کو شائع کر کے مولانا آزاد کی بدنامی کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ چنانچہ مولانائے مرحوم کے ایک پاکستانی معتقد جناب شورش کاشمیری کے ہفت روزہ اخبار چٹان (لاہور) میں ابھی حال میں

---

[1] مکتوبات سلیمانی (حصہ اول)، سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۹۸، مجلد۔ قیمت پانچ روپے۔
ناشر: صدق جدید بک ایجنسی۔ کچہری روڈ۔ لکھنؤ۔

ایک کھلا خط شائع ہوا تھا جس میں مکتوب نگار نے یہاں تک لکھ دیا تھا:

"فلسفۂ جذبات" کے مصنف کے دل معاند و حاسد کو پل بھر کے لئے چین نصیب نہیں، نیکیوں کو کھانے والی آگ اس کے دل میں شعلہ زن ہے، مکاتیب شائع ہو جائیں تو یہ آگ بجھ جائے گی اور دل برف کی سل بن کر ٹھنڈا پڑ جائے گا۔"

چٹان (لاہور) ۲۸ اکتوبر ۶۳ء

تیسری طرف بہت سے لوگوں کو اصرار تھا کہ ان خطوط کو جیسے ہیں، جو ایک برگزیدہ عالم دین کے رشحات قلم ہیں، ضرور شائع ہونا چاہیئے۔ اس تیسری قسم میں یہ راقم الحروف بھی تھا۔ میں نے مکتوب الیہ مولانا عبدالماجد دریابادی سے زبانی اور تحریری دونوں طریقوں سے درخواست کی تھی کہ مولانا سے مرحوم کے سبھی اہم خطوط کو شائع ہونا چاہیئے اور کم سے کم سنسر سے کام لیا جائے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی جب خلاف توقع، اس قدر جلد اس مجموعہ کا پہلا حصہ موصول ہوا۔ میں تمام ضروری کاموں کو چھوڑ کر اس کے مطالعہ میں لگ گیا اور اس وقت تک اس کو الگ نہیں کیا جب تک ایک ایک حرف پڑھ نہیں ڈالا۔ میرا خیال ہے کہ ان کو پڑھنے کے بعد ہر شخص اتفاق کرے گا کہ ان خطوں کی اشاعت سے علمی اور ادبی سرمایہ میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے۔ بلاشبہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، جنھیں افسوسناک کہا جا سکتا ہے لیکن اگر دونوں بزرگ عالموں کے حالات و کوائف پر غور کیا جائے تو ان کے اسباب و وجوہ مل جائیں گے۔ فی الحال میں سید صاحب مرحوم کے خیالات کے علل و اسباب سے بحث کرنی نہیں چاہتا، اگر حالات نے اجازت دی تو انشاء اللہ اگلی اشاعت میں اس پر گفتگو کروں گا، اس وقت میں مکتوبات سلیمانی کے ان اقتباسات کو پیش کرتا ہوں جن میں مولانا آزاد مرحوم کے بارے میں اچھی یا بُری رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی طرح مولانا آزاد کے خطوط کے وہ اقتباسات بھی پیش کروں گا جن میں مرحوم نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ مولانا آزاد کے جس قدر خطوط مجھے مل سکے ان سب کو کھنگال ڈالا مگر کسی میں سید صاحب کا ذکر نہیں ملا، اس لئے یہ اقتباسات صرف ان خطوط سے نقل کر رہا ہوں، جو سید صاحب کے نام لکھے

گئے ہیں اور معارف میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس مجموعہ کا پہلا خط یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء کا ہے۔ اس وقت تک سید صاحب الہلال کے ادارہ میں شامل نہیں ہوئے تھے اور الندوہ میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ مولانا دریابادی نے الندوہ کے لئے مضمون بھیجا تھا، لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ الندوہ بند ہونے والا ہے تو مضمون کی واپسی کا تقاضا کیا۔ اس پر سید صاحب نے ان کو لکھا:

"۔۔۔ چند روز ہوئے کہ آزاد صاحب نے الہلال کے لئے مضمون مانگا، کیونکہ وہ آج کل سخت مصائب خانگی میں مبتلا ہیں اس لئے وہ خود کم لکھتے ہیں۔ میں نے مجموعۂ مضامین الندوہ مولانا (یعنی مولانا شبلی) کے سپرد کر دیا، لیکن ان کا قرعۂ انتخاب آپ ہی کے مضمون پر پڑا اور وہ کلکتہ روانہ ہو گیا۔"

دوسرا خط ۲۶ اکتوبر ۱۳ء کا ہے۔ اس وقت مولانا کو الہلال میں کام کرتے ہوئے پانچ چھ ماہ ہو چکے تھے۔ (مئی ۱۳ء میں سید صاحب الہلال کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے تھے) مولانا عبدالماجد صاحب سے "حظ و کرب" کے متعلق تاریخی بحث جاری تھی، مولانا دریابادی نے سید صاحب سے اس کے بارے میں ان کی ذاتی رائے معلوم کی۔ موصوف نے پہلے اس کے متعلق اپنی رائے دی اس کے بعد لکھتے ہیں:-

"بہت سے پھول صرف دیکھنے کے لئے ہوتے ہیں، سونگھنے کے نہیں۔ مولوی آزاد وہی پھول ہیں۔ افسوس کہ میں علم، سیاست اور مذہب کو متحد سمجھتا ہوں، ۔۔۔ اسی چیز کا مشتاق ہو کر یہاں آیا تھا۔۔۔۔ میرا بال بال رانہ ہے اور افسوس ہے کہ اب زیادہ اپنے ضمیر کو مجروح نہیں کر سکتا اور اس لئے پابہ رکاب ہوں اور اس ذخیرۂ اسرار مخفی کو اس وقت تک محفوظ رکھتا ہوں جب تک اس کا وقت نہ آئے۔"

تیسرا خط ۳۱ جنوری ۱۴ء کا ہے۔ اس وقت سید صاحب الہلال سے بہ وجہ اختلاف الگ ہو کر پونا کالج جا چکے تھے۔ خاصا طویل خط ہے، اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"سنا! آپ کے مولانا ابوالکلام نے مجھ کو ایک رجسٹرڈ خط لکھا کہ ۱۳۰ ہم دیتے ہیں اور دس روپے ماہوار کی ترقی تا ۲۰۰۔ تمام اسٹاف آپ کی زیر نگرانی، نام آپ کا اڈیٹری میں ظاہر رہے گا۔ فوراً چلے آیئے"

سید صاحب نے جس خط کا حوالہ دیا ہے وہ بجنسہٖ حاشیہ میں درج کر دیا گیا ہے، اس کے کچھ ٹکڑے ملاحظہ ہوں:-

"بہر حال میں آج اپنے شورش قلبی سے مجبور ہو کر ایک بار اور کوشش عمل کرتا ہوں، لیکن ہر مقدمہ ہو چکا ہے تو بغیر از صبر چارہ نہیں۔ معلوم نہیں اس خط کا نتیجہ کیا نکلے، ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ بھی بدگمانیوں کی خوراک نہ ہو تاہم خدائے علیم و بصیر میرے دل کو دیکھ رہا ہے کہ اس وقت ہر حرف جو لکھ رہا ہوں کس عالم میں لکھ رہا ہوں۔ خدارا یقین کیجئے کہ سچائی اور صداقت، محبت و وفا اور ایک گہرے حزن و ملال کے سوا اور کوئی چیز اس وقت میرے دماغ میں نہیں۔ . . .

آپ آکر الہلال بالکل لے لیجئے، جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجئے، مجھے سوا اس کے بھول دیا بھی کے (جس میں آپ مجھ سے متفق ہیں) اور کسی بات سے تعلق نہیں، میں بالکل آپ پر چھوڑ دیتا ہوں اور خود اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتا ہوں، صرف اپنے مضامین دے دیا کروں گا، اور کچھ تعلق نہ ہوگا . . . .

سردست آپ تشریف لے آئیں اور ایک سو تیس روپیہ منظور فرمائیں تیس کلکتہ کے مصارف اور انتظام کے لئے ہیں، اس کے بعد ہر ماہ دس کا اضافہ ہوگا، یہاں تک کہ دو سو روپے ہو جائیں"

سید صاحب کے جس خط کا میں نے اوپر اقتباس دیا ہے، اس میں انھوں نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ مولانا آزاد بار بار مجھ سے میری علیحدگی کے اسباب اور رنجش کے موجبات پوچھتے ہیں، چنانچہ اس خط میں بھی بااصرار پوچھا تھا، میں نے ایک ایک کر کے مختصراً لکھا اور رجسٹرڈ جواب بھیجا۔ لیکن اب تک آواز سے برنہ خاست"

مولانا آزاد نے سید صاحب کی شکایتوں اور اعتراضوں کا تفصیل سے جواب دیا تھا، جسے مولانا دریابادی نے حاشیہ میں درج کر دیا ہے۔ موصوف کو مکمل خط نہیں مل سکا، مگر جس قدر ملا ہے وہ بھی بہت طویل اور کافی اہم ہے۔ اس کے ضروری حصے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں جواب خط سے اعتراضات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

صدیقی الجلیل الاعز

میں تو جواب سے مایوس سا ہو گیا تھا، لیکن الحمد للہ کہ آپ نے جواب عنایت فرما کر احسان عظیم کیا، جس وقت خط آیا، میرے گھر میں مرض قدیم کا دورہ شروع ہو گیا تھا اور اب تک ہے۔ پھر باوجود اس حالت کے

ایک ضرورت شدیدسے دہلی چلا گیا۔ باکی پورٹھہرا اور ان اسباب سے جواب میں تاخیر ہو گئی خواستگار معافی ہوں۔"

برادر جلیل و اعز! سب سے پہلے تو میں آپ کا سچا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سچائی اور راست بازی کے ساتھ حسب وعدہ اپنے تمام خیالات ظاہر کر دیئے اور اس کے بعد احسان مند ہوں، اس احسان عظیم کے لئے کہ آپ کے اس اظہار خیال سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ آپ یقین فرمائیں کہ آپ کے خط کو میں نے تین بار پڑھا اور اس کے اثر سے بہت دیر تک روتا رہا۔۔ اس لئے کہ آپ نے جو کچھ لکھا وہ سب کچھ سچ تھا بلکہ اس لئے کہ اس میں سچ بھی تھا جس کے لئے میرے دل نے گواہی دی اور جو حالت ہمیشہ رہتی ہے اس کے لئے ایک تحریک قوی و مزید ہو گئی۔

آپ نے کل دس باتیں لکھی ہیں۔ ان میں کچھ تو خاص میری ذات کے متعلق ہیں کچھ الہلال کی تحریر و مضامین کے متعلق اور کچھ مالی امانت و خیانت کے متعلق۔

ان میں پہلی قسم بالکل سچ ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو اس احتساب حق کا اجر اور مجھے توفیق عمل دے۔

دوسری قسم کا تعلق جہاں تک ارادہ اور نیت سے ہے پورے یقین کے ساتھ انکار کرتا ہوں علم اللہ کہ آغاز کار سے اس وقت تک کبھی بھی میرا خیال اس شیطنت و ابلیسی ادعا کا نہیں ہوا۔ واللہ علیٰ ما اقول شہید مگر ممکن ہے کہ میری تحریروں سے ایسا خیال ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں ذمہ دار ضرور ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔

البتہ تیسری قسم سے الحمدللہ کہ لکلی منکر ہوں۔ آپ کو اس بارے میں وہی غلط فہمی ہوئی جس کا مجھے خیال تھا اور یہ تذکرہ آپ نے مولوی عبدالرحمن گیاوی سے غالباً کیا تھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ میری حالت ابتداء سے کچھ عجب طرح کی ہے۔ میں نے ایک مذہبی سوسائٹی میں پرورش پائی لیکن ایسے اسباب جمع ہوئے کہ مجھ پر ان کا کچھ اثر نہیں پڑا۔ پھر میں طرح طرح کی بداعمالیوں میں پڑ گیا اور شاید ہی فسق و فجور کا کوئی درجہ ایسا ہو جو مجھ بدبخت سے رہ گیا ہو۔ عملاً یہ حال تھا اور اعتقاداً ملحد یا مثل ملحد کے تھا۔ یہ حالت عرصے تک رہی، لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس عالم میں کبھی کبھی انفعال و انابت کا قوی دورہ ہو جاتا، لیکن پھر قائم نہ رہتا۔

تقریباً پانچ برس ہوئے ہیں جبکہ بمبئی میں تھا کہ یکایک بعض حالات غم آلود ایسے پیش آئے کہ کہ میری حالت میں انقلاب عظیم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے توبہ و انابت کی توفیق دی۔ میں نے عہد واثق کیا کہ جمیع منہیات سے محترز رہوں گا اور اس کے بعد اوامر پر عمل کروں گا۔

اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ عملاً اعمال فسق و فجور ترک ہو گئے اور پھر ان کی طرف قدم نہیں بڑھا لیکن جس چیز کو دل اور جذبات کا تقویٰ کہتے ہیں وہ حاصل نہیں اور دل میں گناہ کی خواہش پیدا ہوتی رہی۔ اس کے بعد وقت گذرتا گیا اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جس قدر ایک آدمی اندر ہی اندر اپنے تئیں بدل دینے کی کوشش کر سکتا ہے میں نے کی، لیکن سچی خدا پرستی کے حاصل کرنے سے عاجز رہا۔

یہ تو آپ نے صحیح نہیں لکھا کہ میں صوم و صلوٰۃ کا پابند نہیں، لیکن میرے خیال میں ایک لحاظ سے بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چاہتا ہوں وہ میسر نہیں۔

اب میری موجودہ حالت جو کچھ ہے وہ میں آپ پر ظاہر کرتا ہوں۔ میں عملاً تو منہیات اخلاق سے بچا ہوا ہوں، لیکن اس پر مطمئن نہیں اور دل اور خیال کا گناہ باقی ہے۔ طبیعت میں استغنا، اور ولولۂ انابت قوی ہے اور جیسا کچھ ہے اسے بیان نہیں کر سکتا اور وہی ایک شئی ہے جس پر جی رہا ہوں، لیکن استقامت حاصل نہیں ہوتی اور کوشش کرتے کرتے تھک جاتا ہوں۔ . . .

رہی یہ بات کہ آپ لکھتے ہیں کہ تم کیوں لوگوں کو دینی پابندی کی تعلیم کرتے ہو؟ تو یہ سوال صدہا بار خود اپنے دل سے کر چکا ہوں۔ اس کے جواب میں دو باتیں کہوں گا۔ اوّل تو دینی پابندی سے تصور، بمقابلہ الحاد و ترک اعمال دینیہ حتی الامکان اعتقاد و عمل بالاسلام ہے اور اس کا تعلق جہاں تک ارکان و جوارح سے ہے، کرتا ہوں۔ دوسرے حق کا اظہار ہر مسلمان کا ویسا ہی فرض ہے جیسے نماز پڑھنا اور گویا عبادت پھر اگر لوگوں سے کہتا ہوں کہ اچھے کام کریں اور حق کو حق سمجھیں تو اپنا ایک فرض ادا کرتا ہوں۔ باقی فرائض میں اگر مجھ سے قصور ہو تو اس کی وجہ سے اس فرض کو کیوں چھوڑوں۔ لیکن ان تمام باتوں کے علاوہ ایک شئے البتہ مجھ میں ہے اور اس کا ہونا میرے لئے

اس درجہ یقینی ہے کہ میرا تمام غم والم اس کو دیکھ کر دور ہو جاتا ہے یعنی حق کی خدمت کرنے کا غیر متزلزل اور راسخ جذبہ اور اس کی راہ میں فنا ہو جانے کا نا قابل فنا عشق اور آج تین سال سے یہ اس طرح روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے کہ ایک منٹ اور ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی چیز اس پر غالب نہیں آئی ہے اور اس نے مجھے نہیں چھوڑا ہے۔ دنیا کی محبوب سے محبوب شے پر بھی وہ غالب ہے اور پورے وثوق اور اعتقاد کے ساتھ دعویٰ کرتا ہوں کہ کوئی شخص کیسا ہی جاں نثار حق ہو مگر انشاء اللہ میں اس سے زیادہ جاں نثار اور مستقل ثابت ہوں گا۔

نیز یہ کہ مجھے خدا پر جو اعتقاد ہے وہ بہت ہی پختہ اور راسخ ہے اور میں مذہب کی نسبت جو کچھ کہتا ہوں دل کے اصلی اور سچے جوش اور یقین سے کہتا ہوں اور لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو رسمًا کہتے ہیں میں آپ سے کیا کہوں کہ مجھ پر کیسے کیسے وقت گزرتے ہیں اور کیسے کیسے خیالات طاری ہوتے ہیں یہ مجھ کو یہی چیزیں روز بروز یقین دلاتی رہتی ہیں کہ خدا مجھ کو پورا آزر کیا اور کامل عمل ضرور عطا فرمائے گا۔ نیز یہ کہ مجھے ضائع نہ ہونے دے گا اور مجھ سے کام لے گا۔

میں متقی اور کامل الاعمال آدمی نہیں ہوں مگر کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ کیا اس بات کو کہنا چھوڑ دوں جس کو اچھا سمجھتا ہوں؟ اور پھر باوجود اس کے اپنے دلی جوش کو کیسے دباؤں جو خدا جانتا ہے کہ بڑا ہی قوی اور مجھے مبہوت دلا یعقل کر دینے والا ہے۔

میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا اور اپنے یقین کے خلاف یقین دلانا نہیں چاہتا، میرا حال ایسا ہی ہو رہا ہے میں کیا عرض کروں، کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔

میں خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کوئی بیان آج تک نہیں کیا ہے، مذہب راستبازی خدا پرستی وحق حریت کے متعلق جس کے لئے ایک اصلی جوش اور دل کا ولولہ میرے اندر موجود نہ ہو۔ و لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔

ہاں حال میں ایک شخص کا خط آیا ہے جو جناب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو اور اسی وجہ سے مولانا سلیمان چلے گئے۔ میں نے جی میں کہا کہ یہ تو سچ نہیں ہے معلوم نہیں آپ کی نسبت اس کا بیان سچ

ہے یا غلط؟ میں شراب پیتا تھا اور شراب پر کیا موقوف ہے میں نے سبھی طرح کی کجرویاں کی ہیں، لیکن الحمد للہ کہ خدا نے مجھے توبہ کی توفیق دی اور اب نہیں کرتا۔

الہلال کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "دعویٰ الہام و امامت خود پرستی و تعصب و تحقیر ناس وادعا، و تبختر وغیرہ وغیرہ"

میں نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کہاں کہاں کیا ہے۔ اگر دعوی الہام سے مقصود وہ مضامین ہیں جن میں ایک مخصوص طرز تحریر سے خدا پرستی وخدا رسی کی تعلیم ہے تو تعجب ہے کہ آپ ایسا سمجھیں۔ گر اس کے معنی ادعا، الہام کے ہیں تو اس طرز کے چند مضامین آپ نے بھی لکھے ہیں جو از سرتا آخر انجیل کی زبان میں ہیں تحقیر ناس سے گر مقصود بعض خاص اشخاص کی تذلیل ہے تو اس سے آپ بھی متفق ہیں، یعنی ان لوگوں کو جو قوم کو ضرر پہنچاتے اور آزادی کو روکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میں نے کسی کی تحقیر کی ہے تو آپ ذرا کھول کر مجھے یاد دلایئے۔ واللہ باللہ میں سچے دل سے توبہ کروں گا اور اس سے بچوں گا۔

آپ نے لکھا ہے کہ "تم" "میں" لکھتے ہو اور اس سے استدلال کیا ہے، لیکن میں نے بہت غور کیا اور سمجھ نہ سکا کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں "تو" "میں" اور "ہم" دونوں لکھتا ہوں۔ بعض موقعوں پر "ہم" تحریر میں اچھا نہیں معلوم ہوتا، بربنائے انشا، و حسن بیان۔ دلیل اس کے لئے نہیں دی جا سکتی تاہم اب اسے چھوڑ دوں گا اور کیا کروں...

حب اللہ کے متعلق جو آپ نے لکھا ہے کہ اس سے مقصود صرف اپنی پرستش کرانی ہے تو اس کے جواب میں بھی اس کے سوا اور کیا عرض کروں کہ اگر ایسا چاہتا ہوں اور یہی میرا مقصود ہو تو اللہ اور اس کے ملائکہ کی مجھ پر لعنت۔ تعجب ہے کہ آپ کا ایسا خیال ہے۔ ... خدا کے لئے تھوڑی سی زحمت اور گوارا کیجئے اور مجھے حوالہ دے کر اور مثالوں کے ساتھ بتلایئے کہ بلا وجہ آپ کوئی بات نہیں کہہ سکتے، ضرور اس کے اسباب ہیں۔

ایک دفعہ آپ نے چندہ کے متعلق لکھی ہے اور اس کی بنا وہی واقعہ ہے جو میں سمجھا تھا۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے سامنے لوٹ پڑتے دیکھا ہے۔ میں اس غلط فہمی پر بہت متاسف ہوا، نیز معاف کیجئے گا، سوء التفاق پر ہنسا بھی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ انجمن مسجد کانپور کلکتہ کے جو جلسے ہوتے تھے، اس کے ایک جلسے کا تمام روپیہ جو چار سو کئی روپیہ تھا میرے یہاں آ گیا اور مسٹر قطب الدین نے جن کے پاس رہتا تھا، صندوق یہاں رکھ دیا۔ اسی شما

میں ٹون ہال کا جلسہ ہوا اور ... روپیہ کی ضرورت ہوئی، اس میں سے لے کر روپیہ خرچ کیا، پھر ایک دن منشی
عبدالجبار نے تنخواہ کے لئے روپیہ مانگا، روپیہ پاس نہ تھا اور بنک کا وقت گزر گیا تھا، نیز دوسرے دن تعطیل
تھا۔ انھوں نے کہا کہ روپیہ موجود ہے، اس میں سے لے لیں، پرسوں آپ شامل کر دیجئے گا۔ یہ میں نے ضرور
کیا کہ منظور کر لیا اور مسٹر قطب الدین کو بلوا کر یا کنجی لے کر روپیہ لے لیا۔ اس کی تعداد ایک سو اسی تھی جو تنخواہ
میں کم ہوتے تھے۔ چندہ متفرق پیسوں، دونیوں، چونیوں میں تھا، اس کے ایک ہفتہ کے بعد ایک سو روپیہ
کی پھر اسی طرح ضرورت ہوئی اور تین بج چکے تھے، بنک سے آ نہیں سکتا تھا، تحویل خالی تھا، میں نے
کہا کہ جس قدر روپیہ باقی ہے، سب نکال کر گن لو اور لے لو، بیشتر کا بھی روپیہ ہے، میں مسٹر رسول (خزانچی) کو
چک مجموعی رقم کا بھیج دوں گا۔ چنانچہ اس کے بعد حساب کیا گیا، ٹون ہال کے بعض ضروری مصارف کمیٹی
نے منظور کئے اور میں نے تین سو لوے روپیہ کا چک مسٹر رسول کو بھیج دیا۔ یہی نوٹ ہے جو جناب نے دیکھی اور
اس کے بعد مولوی عبدالرحمن نے اس کا تذکرہ کیا، میں سمجھتا تھا کہ آپ بھی لکھیں گے کاش آپ یہیں اس کا ذکر فرماتے، لیکن آپ بالکل خاموش رہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بھی شان امانت کے خلاف ہے، اگر میں نے ضرور کیا اور ایک مرتبہ اور بھی کر چکا
ہوں، لیکن اس مرتبہ پانچویں روز واپس کر دیا۔ اور اس مرتبہ دوسرے ہی دن الگ کر دیا اور ہفتے کے بعد
بھیج دیا۔ پہلی مرتبہ بھی ایک سونزاسی روپیہ مجبوراً چندے سے لے کر دئے تھے، جو پانچویں دن واپس کر دئے۔ اسی
بنا پر آپ نے لکھا ہے اور شک کیا ہے کہ چندوں کا بھی یہی حال ہوگا۔ بیشک آپ کے اس بیان سے
دل بہت زخمی اور غمگین ہوا کہ آپ کے نزدیک میں ایسا حرام خور اور خبیث ہو گیا ہوں، لیکن پھر تسکین
ہوئی کہ یہ بھی آپ اپنی ایمانی قوت اور راست بازی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے
خود بھی کچھ روپیہ اپنی حالت کے مطابق طرابلس اور بلقان میں دیا ہے اور سوائے چھ سو یا قریب چھ سو کی کوئی
قسطوں کے جو مہاجرین کے لئے آئی تھیں اور نہیں گئیں۔ کیونکہ ایک سو پاؤنڈ کے انتظار میں رہا اور الحمد للہ
کہ ایک پائی بھی میں نے اپنے علم میں ضائع نہیں کی اور یہ روپیہ بھی اب پرسوں چلا جائے گا۔ کیونکہ ڈاکٹر انصاری
کو ایک شخص نے پچاس پونڈ دئے ہیں اور دونوں شامل چلے جائیں گے.....

آپ کا وقت بہت ضائع ہوا۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے نہیں کی کہ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کو
اور مجبور کرنا چاہتا ہوں، کہ آپ آئیے، اللہ کی مرضی ہماری خواہشوں سے بہتر ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ

میں آپ سے محبت رکھتا اور آپ کو نیک اور مخلص آدمی یقین کرتا ہوں اسی لئے آپ کے خط نے مجھے بہت متاثر کیا اور جتنا حصہ اس کا سمجھ سکا اور مطابق پایا اس سے مجھے بہت نفع ہوا پس ان تفصیلات کا لکھ دینا بہتر ہے۔
آپ مجھے نہ بھولئے اور بھلائی کی کوشش نہ کیجئے اور میرے لئے دعا کیجئے۔ صرف یہی دعا جو میں مانگتا ہوں، یعنی خدا تعالیٰ مجھ پر رحم فرمائے اور میری عاجزیوں اور منتوں کو قبول کرے۔ اگر ایسا نہیں ہے، تو میں گمراہ ہو کر گمراہ کرنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے دنیا سے اٹھالے۔ ...

مولانا آزاد کا مذکورہ بالا خط بہت ہی صاف اور واضح ہے اور ایک ایک حرف سے خلوص اور صداقت نمایاں ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی غلط فہمی اس سے بھی دور نہیں ہوئی، چنانچہ طنز و تعریض کا سلسلہ اگلے خطوط میں بھی جاری ہے، مگر کم اور ہلکا۔ اس خط کے کوئی ایک سال بعد، ۲۶ جنوری ۱۹۱۵ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں؛

"مولوی آزاد کا خط آیا ہے اپنی پیماری کا اعلان ظاہر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ دار المصنفین کی ایک اسکیم تیار کرلی ہے۔ ضرورت ہے کہ دار المصنفین کو علی گڑھ اور الہلال دونوں ... علی گڑھ میں جو چیز ہوگی آفتاب احمد خان و اشتہار کے نتیجہ میں ہوگی۔ الہلال کا کام تخیل ہو کر ہی آگے آئے گا (ص ۱۳۷)

یہاں مولانا عبدالماجد صاحب حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ "مولانا ابوالکلام سے تعلقات میں تلخی اب تک باقی ہے۔" لیکن اس تحریر کے نصف ماہ کے اندر ہی سید صاحب دار المصنفین کے بارے میں چند اکابر سے گفتگو کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان میں مولانا آزاد بھی شامل ہیں۔ ۹ فروری ۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں: "دار المصنفین کی نسبت ڈاکٹر اقبال، سید اکبر حسین، عماد الملک اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں اور مولوی ابوالکلام سے گفتگو کر رہا ہوں۔ مولوی عبدالحق کو بھی خط لکھا ہے۔" (صفحہ ۳۸)۔

مزید تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہ انیس سال کے بعد سید صاحب۔ الہلال اور البلاغ کے متعلق بڑی شاندار رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں کی قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے الہلال اور البلاغ نے پیدا کیا اور جس اسلوب بلاغت، کمال انشاپردازی اور زور تحریک کے ساتھ انھوں نے انگریزی

خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی آیتوں کو پیش کیا، اس نے ان کے لئے بیان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دئے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔" (معارف، اکتوبر ۳۳ء)

بعد کے خطوط میں مولانا آزاد کا اگر کہیں ذکر آیا ہے تو عام طور پر سرسری طور پر تلخی اگر کہیں ہے تو بہت خفیف۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"البلاغ دیکھا ہوگا، اب تو پہلے سے بھی زنگ زیادہ شوخ ہو گیا ہے۔ علامہ مرحوم کے بعد مشرقی علوم میں اب وہ کس کا ڈر کرتے ہیں۔" (۱۷ نومبر ۱۹۱۵ء صفحہ ۴۵)

"لطیفہ سنئے، ایک صاحب 'صحائف ابوالکلام' کی ترتیب کی خدمت سپرد کرتے ہیں کہ علاوہ فوائد مالی دارالمصنفین کی شہرت بھی ہے۔" (۶ ستمبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۵۹)

مولانا دریابادی نے اس ٹکڑے پر نوٹ لکھا ہے کہ "سید صاحب کے اس وقت کے تعلقات کی جو نوعیت مولانا ابوالکلام کے ساتھ تھی، اس کے لحاظ سے یہ فرمائش ایک عجیب ستم ظریفی تھی۔"

پھر مولوی ابوالکلام صاحب نے تذکرہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے بھی اس طرز کا رسالہ (مراد قرآنی بسیرۂ نبوی) لکھا ہے، شاید عالم مثال میں زیر طبع ہو۔" (۲۰ مارچ ۲۰ء صفحہ ۲۱۱)

مولانا عبدالماجد صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "خود سید صاحب بھی اخیر زمانہ میں مولانا کی طرف سے بڑی حد تک صاف ہو گئے تھے، بلکہ درمیان میں تو ایک دور خاص لطف و محبت کا بھی آگیا تھا۔" (ص ۹)

مگر حصہ اول کے خطوط سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ کل خطوط کی تعداد ۲۷۲ ہے اور آخری خط ۱۹۵۳ء کا لکھا ہے۔ لیکن پہلے حصے میں صرف ۲۰۰ خط ہیں اور آخری خط ۴ فروری ۱۹۳۲ء کا ہے، گویا اکیس سال کے ۲۴ خطوط ابھی شائع ہونے کو باقی ہیں، غالباً ان خطوط کی اشاعت کے بعد صحیح صورت حال معلوم ہوگی۔

اب مولانا ابوالکلام آزاد کے ان خطوط کے جو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کو لکھے گئے تھے، ایسے اقتباسات پیش کئے جاتے، جن سے سید صاحب کے متعلق ان کے صحیح خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ ان اقتباسات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے دل میں سید صاحب کی بڑی عزت اور وقعت

ہے اور ان کا خلوص شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :۔

"بہرحال مجھے ہر حال میں اپنا رفیق و ہم عنان یقین کیجئے اور ہر دم خدمت گذاری کے لئے تیار۔ افسوس ہے کہ ملاقات کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ کاش اللہ یک جائی کا سامان کرتا۔ قوتیں مجتمع نہیں ہوتیں۔ بعد تفرق و عدم توجہ نے ان نتائج سے بھی محروم کر دیا ہے جو باایں ہمہ بے سر و سامانی حاصل ہو سکتے تھے۔

دارالمصنفین نہایت آسانی کے ساتھ ایک وسیع النتائج چیز بن سکتا ہے اور ندوہ کا حقیقی بدل بل نعم البدل۔ اصلی کام وہی ہے باقی سب کے سب فروعی ہیں۔ آپ کی زندگی کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ آدمی پیدا ہوں۔"

(معارف، اکتوبر ۱۹۵۳ء)

"دارالمصنفین کا پراسپکٹس پہنچا، آپ مجھے اس سلسلہ میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے۔ آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے، اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو جب بھی میں منظور کر لوں، بشرطیکہ کام ہو اور مجمع صحیح و خالص۔"

(معارف اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۳۱۱)

"قلی" کے لفظ پر معارف کی طرف سے حسب ذیل نوٹ ہے :

"یہ خط مولانا کی عظمت اور علم دوستی کی بہت بڑی دلیل ہے، اس لئے اس کو بجنسہ شائع کر دیا گیا۔"

صدیقی العزیز، السلام علیکم

معافی کا خواہاں ہوں جواب میں بہت تاخیر ہوئی، لیکن بلا عذر نہ تھی۔ مولوی مسعود علی صاحب نے از راہ عنایت سیرۃ وغیرہ بھیج دیا جن کے لئے شکر گذار ہوں۔ دارالمصنفین سے تحائف تو ہمیشہ پہنچتے ہیں لیکن کبھی کوئی بل نہیں آیا، آخر آپ نے کوئی سالانہ ماہوار فیس تو رکھی ہوگی۔

جلسے کے موقع پر ملاقات کی امید تھی مگر پوری نہ ہوئی۔ الایام وھی کما ھیا، آپ کے ہموم و غموم[۱] کا حال پڑھ کر بہت افسوس ہوا مجھے تفصیل معلوم نہ تھی، لیکن آپ کی شاعرانہ مایوسیوں سے متفق نہیں ہوں۔ اوائل حوادث میں ایسے ہی احساسات ہوتے ہیں، لیکن خان ما تحذرین قد وقع کے بعد خود بخود طبیعت سکون پذیر ہو جاتی ہے۔ آپ نے لکھا کہ معنوی زندگی کا خاتمہ ہو گیا، مگر بقول آپ کے معنوی زندگی

---

۵۱ غالباً یہ غم دوسری اہلیہ کے انتقال پر تھا۔ مولانا دریابادی کو سید صاحب نے لکھا ہے کہ "سچ یہ مجھے معلوم نہ تھا کہ مجھ کو اپنی بیوی سے اس درجہ محبت ہے۔" (مکتوبات سلیمانی صفحہ ۶۸)

کے لئے مادی سروسامان ومحرکات ناگزیر ہیں اور نیز بقول آپ کے چاک دامنی کے لئے ایام گل کا اشارہ تو بتیجۃً خود ہی طبیعت اس کا انتظام کرے گی، آپ گھبرائیں نہیں۔ . . .

معارف کے متعلق یہ آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی تو ایک پرچہ ہے، اور تو ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو صرف خدمتِ علم وتصنیف وتالیف کے لئے وقف ہے۔" (معارف اکتوبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۱۲، ۳۱۳)

آپ کے دلچسپ خط نے پوری ملاقات کا لطف دیا، آپ کو اس قدر جلد اعظم گڈھ کے گوشۂ عافیت سے برداشتہ خاطر نہیں ہونا چاہیئے، ساری باتیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ جہاں دلچسپیوں کی شورش ہے، وہاں امن وجمعیت خاطر کہاں . . .

آپ نے دار المصنفین کی موجودہ مالی حیثیت کا ذکر کیا، نہایت درجہ خوشی ہوئی۔ یہ سب آپ کے قیام وسعی کا نتیجہ ہے۔ بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کے آخر حیات کی امیدیں بار آور ہوئیں، لیکن یہ بڑی مصیبت ہے کہ آپ وہاں کے قیام سے اکتا گئے ہیں۔ اگر آپ نے وہاں رہنا چھوڑ دیا تو پھر سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا ایسا انتظام کیجئے کہ "سہ ماہ می خور دونہ ماہ پارسامی باش" کی اسکیم پر عمل درآمد ہو سکے، مستقل قیام وہاں رکھئے۔ عارضی ہر جگہ۔ (معارف اکتوبر ۵۳ء، صفحہ ۳۱۴، ۳۱۵)۔

مدت ہوئی جب آپ کلکتہ میں تھے اور ایسے ہی ایک اطلاع ملی تھی، شب کو میں نے اپنے کمرے میں آپ کو بلایا تھا اور آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا، خدارا اس کو سامنے لایئے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسے وقعت دیجئے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اسی وقت اپنے کاموں میں کوئی تبدیلی کیجئے، البتہ اگر اس کا آپ بذریعہ تحریر مجھ سے وعدہ کریں کہ جب وقت آئے گا تو آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف ایک کام کے ہو رہیں گے تو میں بڑی ہی تسکین پاؤں اور اطمینان کے ساتھ آنے والی حالت کو قبول کرلوں، وہ تسکین جو بدبختی سے اور کسی کے پاس نہیں۔

آپ مجھ سے بلا تاخیر بذریعہ تحریر وعدہ کریں کہ اگر میری نسبت آپ کو کوئی نئی خبر ملے تو آپ کا پہلا کام یہ ہوگا کہ آپ فوراً کلکتہ آئیں اور البلاغ کو جو نکل چکا ہے (اور انشاء اللہ محفوظ ہے) اپنی ایڈیٹری

میں نے لیں اور ایک خالص دینی و اصلاحی رسالے کی شکل میں مع اس کے خصائص کے اس کو جاری رکھیں کسی پرخطر راہ کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، نہ جنگ پر رائے زنی کی ضرورت ہے، صرف قرآن و سنت کے معارف و دعوت کو باندازۂ اصول البلاغ مخصوص جاری رکھنا چاہیئے اور جب تک اس طرح کیا جائے گا اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

یہاں تمام لوگ آپ کے استقبال کے لئے منتظر ملیں گے اور وہ آپ کا اسی طرح ساتھ دیں گے جس طرح میرا دیتے ہیں اور اسی طرح حکم مانیں گے اور ماتحت رہیں گے جیسے میرے رہتے ہیں۔۔۔

البلاغ کے علاوہ بالکل علیحدہ ایک معتدل مسلک کا روزنامہ اخبار اقدام بھی جاری ہوا ہے، وہ بھی آپ کے ماتحت ہو جائے گا اور ایک بڑا اسٹاف اپنے ماتحت آپ پائیں گے۔

امید ہے کہ دارالمصنفین وغیرہ اس میں مانع نہ ہوں گے، کیونکہ اس کو تو ہر حال میں قائم رکھ سکتے ہیں۔

(معارف نومبر ۵۳ء صفحات ۳۸۲ تا ۳۸۴)

صدیقی العزیز

آپ کا خط ینزل الغیث من بعد ما قنطوا[1] کا مصداق تھا۔

کلکتہ ۔ ۲۵ اگست

اخ الاعز الاجل، انعم اللہ علی بلقائکم والسلام علیکم

والا نامہ پہنچا، مجھے خدشہ تھا کہ کہیں آپ پونہ سے چلے نہ گئے ہوں۔ یہ آپ نے کیونکر کہا کہ میں آپ کو بھول جاتا ہوں۔ غالباً تواتر و تسلسل مراسلات علائق قلبیہ کے لئے شرط نہیں ہیں۔ آپ یقین کریں کہ موجودہ عہد کے جہل عام اور فساد محیط میں اتحادِ مشرب و فکر کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی کسی کو بھولنا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا۔۔۔

بہرحال کسی طرح کام کو جاری رکھا۔ یہ کام دراصل یوں تھے کہ باہم یکجائی ہوتی اور دیر دیر تک صحبتیں اس بارے میں کی جائیں لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تو جس حال میں جو کچھ ہو جائے اور توفیق مساعد ہو اسی پر شکر کرنا چاہیئے۔۔۔

---

[1] مایوسی کے بعد باران رحمت کا نزول۔

اگر میں یہ کہوں تو کیا آپ اسے سچ سمجھیں گے کہ میرا جی آپ سے ملنے کو بہت چاہتا ہے اور آپ کی یاد ہمیشہ اس طرح آتی ہے، گویا میں اپنے حقیقی بھائی کی نسبت سوچ رہا ہوں۔

(معارف نومبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱)

اخ الجلیل الاعز، انعم اللہ علی بلقائک

خط پہنچا، ایسی حالت میں کہ آپ کے عدم تعین مکان و عالم اطلاقِ مقام سے سخت پریشان تھا اور حیران تھا کہ کیونکر خط و کتابت کروں۔

...[۵] ایسی حالت میں بہت سوچتا ہوں لیکن آپ کے سوا کسی کو نہیں پاتا جس سے امید رکھوں۔

ابوالحسنات کو لکھا، معلوم ہوا وطن میں ہیں۔ .. اگر آپ کو قیام رانچی میں میری کوتاہیاں محسوس نہ ہوئیں تو اس سے ان کا عدم نہیں، بلکہ آپ کی محبت کا استغراق ثابت ہوتا ہے۔ اس بات نے دل کی ندامت و اعتراف کو اور زیادہ کر دیا۔

(معارف نومبر ۱۹۵۳ء ص ۳۸۸)

آپ نے ترجمان القرآن جلد دوم کی اشاعت کے لئے جو امادگی ظاہر کی ہے۔ یقین کیجئے اس سے میرا دل نہایت درجہ متاثر ہوا۔ یہ محبت و اخلاص کا بڑا سے بڑا ثبوت ہے، جس کا میں آپ سے متوقع ہو سکتا تھا۔ فعلاً یہ بات ظہور میں آسکے یا نہ آسکے لیکن میرے دل پر آپ کی محبت کا نقش ثبت ہو گیا۔

جی چاہتا تھا آپ سے ملاقات ہو، دیکھئے اب کب ہوتی ہے

"جناب کی نئی غزلیں شائع ہوئیں بصرف خبر سنی، آج کل کوئی پرچہ نہیں منگواتا" (معارف دسمبر ۱۹۵۳ء ص ۴۵۹)

صدیقی العزیز،

ترجمان القرآن کی پہلی جلد کسی نہ کسی طرح چھپ کر نکل گئی، آپ کو اس لئے نہیں بھیجی گئی کہ خیال تھا

---

[۵] اس سے پہلے کی عبارت حسب ذیل ہے:-

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میری فرصت موجودہ اب قریب الاختتام ہے اور مشیت الٰہی جس طرح مہلت دے کر کام کرانا چاہتی تھی، اسی طرح آخری ابتلا کو بھیج کر کوئی عظیم الشان مقصد پورا کرانا چاہتی ہے۔ آثار گریاں ہیں اور علائم قطعی اخبار موقف اور اطلاعات معتمد تاہم سب کچھ اس کے ہاتھوں میں ہے اور میں نے اس دور حیات میں بڑے بڑے کرشمے دیکھے ہیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل ٹھیک ٹھیک کیا ہوگا اور وہی ہو جو اس کی مرضی ہے۔

کلکتہ سے مجلد نسخے آجائیں تو بھجواؤں، لیکن آج ایک تار سے معلوم ہوا کہ دو ہفتہ کی مزید دیر ہوگی ادھر پنجاب کے حالات نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کتنے دنوں بلکہ گھنٹوں تک جیل سے باہر رہ سکوں گا اس لئے طبیعت نے تقاضا کیا کہ غیر مجلد ہی بھجوا دوں۔

دہلی دریا گنج مورخہ ۶/ ۱/ ۳۲ (معارف جنوری ۱۹۶۵ ص ۷۱)

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کے ۸۳ خطوط معارف میں شائع ہوئے ہیں۔ فاضل مدیر معارف نے لکھا ہے: "بعض اور خطوط بھی علمی و ادبی حیثیت سے اہم اور قابل اشاعت تھے مگر وہ اس قدر بوسیدہ ہوگئے ہیں کہ پڑھے نہیں جا سکتے۔" مولانا دریا بادی نے زیر نظر کتاب مکتوبات سلیمانی میں مولانا آزاد کا ایک غیر مطبوعہ خط شائع کیا ہے، ممکن ہے کہ ایسے اہم خط کچھ اور ہوں جو مصلحتاً شائع نہ کئے گئے ہوں۔

بہر حال اوپر میں نے جو اقتباسات پیش کئے ہیں وہ معارف کے انہی ۸۳ خطوط سے ہیں ان سے نہ صرف مولانا آزاد کے خلوص، محبت اور تعلق خاطر کا پتہ چلتا ہے، جو سید صاحب سے ان کو تھا۔ بلکہ ان کی غیر معمولی شرافت، طبیعت کی بلندی اور شخصیت کی عظمت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ مولانا عبدالماجد صاحب کی ریڈیو کی تقریر ۳۰ نومبر کے صدق جدید میں شائع ہوئی ہے، اس میں مولانا نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "نظریاتی اختلاف کیا دینی اور کیا سیاسی، اپنے معاصرین میں خدا معلوم کتنوں سے تھا، وہ ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن اپنے ذاتی تعلقات میں فرق نہ کسی دینی اختلاف کو آنے دیا نہ کسی سیاسی اختلاف سے اور نہ اپنی طرف سے کسی اختلاف کو مخالفت میں تبدیل ہونے دیا۔" یہ اس شخص کا حال تھا جو مولانا دریا بادی کے الفاظ میں اور جو کہیں موقع اس کا آگیا کہ چوٹ مولانا کے ضمیر اخلاقی یا حسن دینی پر پڑی تو چاہے وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر، اب سماں ہی دوسرا ایک شیر ہے کہ گرج رہا ہے، دلائل کی خطابت کی آگ بھڑک رہی ہے اور زبان ہے کہ اب پھر صدا لگائے ہے کہ

ہے قلم میرا تیغ جوہر دار

ایک مختصر بزم مشاعرہ

جامعہ کے تعلیمی میلے کے موقع پر امسال دہلی میں ایک وسیع پیمانہ پر یوم ظفر منایا جا رہا تھا جس کے پروگرام میں ایک کل ہند مشاعرہ بھی شامل تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میلے کے پروگرام میں اس مرتبہ مشاعرہ کا بھی اضافہ کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ حسب پروگرام ۸ر نومبر کو سہ پہر میں بزم مشاعرہ منعقد ہوئی۔ جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے میر مشاعرہ کے فرائض انجام دیے اور جناب غلام ربانی تاباں صاحب نے اسٹیج سکریٹری کے جناب تاباں نے سب سے پہلے اپنی غزل پیش کی، جو حسب ذیل ہے:

پریشاں ہو گئے ہم صورت گرد سفر آخر
کہاں تک ساتھ دیوانوں کا دیتی رہ گزر آخر

تپش نشو و نما کی اہل دل کو سازگار آئی
کہ ہر موج چمن بنتی گئی موج شرر آخر

تری محفل کی خاطر ربط ہر محفل سے توڑا تھا
یہاں سے اٹھ کے اب جائیں تو ہم جائیں کدھر آخر

ہجوم درد اتنا ہے کہ تمکین وفا گم ہے
کہاں تک دل کو بہلائے گی امید اثر آخر

تمہارے نام دل ہر آرزو منسوب کرتا ہے
کہانی بن گئی بس اک نگاہ مختصر آخر

ابھی چشم تمنا محو نظارہ سہی لیکن
تماشا خود سکھا دیتا ہے آداب نظر آخر

جفائے دوست آئی اور سرگرم تپاک آئی
غمِ پنہاں اگر ہونے لگا صرف اثر آخر
وہی دل ہے، وہی ہیں رازدانِ دل کے ہنگامے
کہاں سے لائیں تاباں فرصتِ عرضِ ہنر آخر

اس کے بعد حسبِ ذیل شعراء نے اپنا کلام پیش کیا:۔

حضرت جمیل مظہری

کرشمے راہ میں ہیں اپنی منزل تک نہیں آئے
میری آنکھوں تک آئے ہیں میرے دل تک نہیں آئے
جمیلؔ اک سطر سے دریا کی لہریں گن رہے ہو تم
گنا ہے ان سفینوں کو جو ساحل تک نہیں آئے

حضرت روشؔ صدیقی

حضرت روشؔ نے میر تقی میر پر نظم پیش کی:

آپ اپنا نقاب اٹھائے ہوئے
خلوتِ دل کو جگمگائے ہوئے
مرگِ ہستی کے وہم سے آزاد
پیرہن کو کفن بنائے ہوئے
غیریت کے خیال سے بیزار
نقش دیر و حرم مٹائے ہوئے
اپنی مجبوریوں کے پردے میں
اختیارِ بشر چھپائے ہوئے
ماہ و انجم تراشنے کے لئے
اک بجھا سا دیا جلائے ہوئے
محو نظارۂ جمالِ ازل
عشق کو آئینہ بنائے ہوئے
قشقہ آلودہ، لوحِ پیشانی
صبحِ ایماں کو جگمگائے ہوئے
وحدتِ حسن و عشق پر نازاں
اک صنم کو خدا بنائے ہوئے
وحشتِ دل، ادب شناسِ وفا
اپنے دامن میں منہ چھپائے ہوئے
اک غزالِ رمیدہ خو کے لئے
زندگی کو غزل بنائے ہوئے
خاکساری غرور آمادہ
سربلندی نظر جھکائے ہوئے
رازدانِ نگاہِ حسن طلب
درد ہی کو سکوں بنائے ہوئے

ہمتِ دوش ناتواں لے کر بارِ انسانیت اُٹھائے ہوئے
وادیٔ دل سے اک کلیم اٹھا پیر سا شاعرِ عظیم اٹھا

حضرت پرویز شاہدی

جوشِ تصور سے کیا ہوگا چشمِ تماشا ساتھ چلے
وقت کے جلوے گرمِ سفر ہیں دیکھنے والا ساتھ چلے
راست روی کے معنی سمجھے اتنا ہی یارانِ سفر
اس کو رہبر مان لیا جو آڑا ترچھا ساتھ چلے

حضرت سکندر علی وجد

خوشی یاد آئی نہ غم یاد آئے محبت کے ناز و نعم یاد آئے
یہ کیوں دم بہ دم ہچکیاں آ رہی ہیں بھلایا کسی نے کہ ہم یاد آئے
گلوں کی روش دیکھ کر گلستاں میں فہمیدوں کے نقشِ قدم یاد آئے
سرِ شام رہبر کی تقریر سن کر تری زلف کے پیچ و خم یاد آئے
بروں کا بہت نام جپتی ہے دنیا جو اچھے زیادہ تھے کم یاد آئے
دمِ نزع جونہی اجل مسکرائی اچانک تمھارے کرم یاد آئے
مصیبت میں بھی بار ہا وجد مجھ کو خدا جانتا ہے صنم یاد آئے

حضرت نشور واحدی

وقت کا قافلہ آتا ہے گزر جاتا ہے آدمی اپنی ہی منزل میں ٹھہر جاتا ہے
ایک بگڑی ہوئی قسمت پہ ہنسانے دوست جانے کس وقت یہ انسان سنور جاتا ہے
اُس طرف عیش کی شمعیں تو اِدھر دل کے چراغ دیکھنا یہ ہے کہ پروانہ کدھر جاتا ہے
جام و صہبا کی مجھے فکر نہیں اے غمِ دل میرا پیمانہ تو اشکوں ہی سے بھر جاتا ہے
ایک رشتہ بھی محبت کا اگر ٹوٹ گیا دیکھتے دیکھتے شیرازہ بکھر جاتا ہے

ذوقِ مے عشق میں تبدیل ہوا ہے اکثر ۔۔۔ شعلۂ جام بھی سینے میں اتر جاتا ہے
حال میرے لئے ہے لمحۂ آئندہ نشور ۔۔۔ وقت شاعر کے لئے پہلے گزر جاتا ہے

جناب حسن نعیم

پیکرِ ناز پہ جب موجِ حیا چلتی تھی ۔۔۔ قریۂ جاں میں محبت کی ہوا چلتی تھی
ان کے کوچے سے گزرتا تھا اٹھائے ہوئے سر ۔۔۔ جذبۂ عشق کے ہمراہ انا چلتی تھی
دل میں جو یاد رہا کرتی ہو صورت بن کر ۔۔۔ کل وہی یاد بہ انداز ندا چلتی تھی
میں ہی تنہا نہ خرابوں سے گزرتا تھا نعیم ۔۔۔ شام تا صبح ستاروں کی ضیا چلتی تھی

جناب شہاب جعفری

مدتیں بن کے رہیں ہم بھی تمہارے دل میں ۔۔۔ ہائے کیا کیا ہیں ابھی ارمان ہمارے دل میں
کوئی ایسا بھی نہیں جس پہ گماں ہو تیرا ۔۔۔ تیری صورت کے کئی عکس اتارے دل میں
گھر کی رونق ہے یہی کشمکشِ یاس و اُمید ۔۔۔ ایک ہنگامہ سا رہتا ہے ہمارے دل میں
کس غضب کا ہے اندھیرا شبِ تنہائی کا ۔۔۔ ٹوٹتے ہیں مری یادوں کے ستارے دل میں
مدتوں سے نہیں دیکھی شبِ مہ کی صورت ۔۔۔ دن کے ہنگامے ابھی تک ہیں ہمارے دل میں
یونہی آنکھوں میں کٹیں ہجر کی لمبی راتیں ۔۔۔ تجھ سے روٹھے ترے گیسو بھی سنوارے دل میں
رات بیتی تری یادیں بھی دبے پاؤں چلیں ۔۔۔ ایک اک کر کے اتر آئے ستارے دل میں
بڑی مشکل سے ابھی آنکھ لگی ہے غم کی ۔۔۔ شوقِ رسوا سے کہو اب نہ پکارے دل میں

جلنے کیا بات ہے روشن ہے شبِ ہجر شہاب
اتنی رونق تو نہ ہوتی تھی ہمارے دل میں

کوائف جامعہ

جلسۂ میلاد النبیؐ

جامعہ میں ہر سال میلاد النبیؐ کا جلسہ بڑے اہتمام سے کیا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں کے طالب علم آنحضرتؐ کی سیرت یا ان کی تعلیمات کے کسی پہلو پر مضامین اور نعت پڑھتے ہیں۔ ملک کے کسی مشہور مقرر کو بھی تقریر کی زحمت دی جاتی ہے۔ امسال جناب پنڈت سندرلال صاحب کو زحمت دی گئی تھی۔ موصوف نے کوئی سوا گھنٹے تقریر کی، تقریر اس قدر دلچسپ اور پر از معلومات تھی کہ اساتذہ اور طلبہ سبھی نے غور و توجہ سے سنی۔ پنڈت جی نے فرمایا کہ سب سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اللہ اور اس کی توحید کو مانتا ہوں، ساتھ ہی میں الہام کا بھی قائل ہوں، اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ حضرت محمدؐ صاحب پر بھی اللہ کی طرف سے وحی آئی ہے۔ ابھی کسی بچے نے بہت صحیح بات کہی تھی کہ سب سے بڑا، اور کامیاب انقلاب اگر کوئی ہوا ہے تو وہ عرب کا انقلاب ہے۔ آپ ذرا اس وقت کے عربوں کی حالت پر غور کیجیے، وہ نہ تو ایک قوم تھے، نہ پورا علاقہ آزاد تھا، نہ سماجی حالت اچھی تھی اور نہ اخلاقی حالت۔ کونسی خرابی تھی جو ان میں نہیں تھی، مگر صرف بائیس سال کی کوشش میں ان کی کایا پلٹ گئی، مجھے دنیا کی تاریخ میں اتنے عظیم الشان انقلاب کی کوئی مثال نظر نہیں آئی۔ آخر میں پنڈت جی نے فرمایا مسلمانو! تم ایک بہت بڑی قوم کے نام لیوا ہو، تمہارے مذہب کی تعلیمات بڑی شاندار ہیں، تمہارے رسول کی زندگی بے شمار ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے، جن کو اختیار کر کے تم دنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو ہو سکتے ہو، مگر اپنی حالت پر غور کرو اور سوچو کہ کیا کمی ہے، جس کی وجہ سے آج کے مسلمان دورِ اول کے مسلمانوں جیسے نہیں ہیں۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اس کے بعد صدر جلسہ جناب مولانا قاضی زین العابدین صاحب نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں پنڈت جی کی بعض باتوں کی تائید کرتے ہوئے مزید وضاحت کی۔ آخر میں ناظم شعبۂ دینیات۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے پنڈت جی اور حاضرین جلسے کا شکریہ ادا کیا۔

حلقۂ مطالعہ جامعہ کالج، ڈاکٹر اسمتھ کی شرکت

اس تعلیمی سال میں اب تک حلقہ کی جو چند نشستیں ہوئی ہیں اُن میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اپنی زیرِ تصنیف کتاب 'ہندوستانی مسلمان' - آج اور کل' کے ابواب سناتے رہے ہیں، نشستوں میں شریک ہونے والوں کی تعداد اور تبادلۂ خیالات کے معیار کے اعتبار سے یہ نشستیں بہت کامیاب رہی ہیں۔ ایسی ہی ایک نشست میں ۱۴ر نومبر ۱۹۶۳ء کو انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، میکگل یونیورسٹی (کینیڈا) کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر ولفرڈ کینٹول اسمتھ بھی شریک ہوئے، ڈاکٹر اسمتھ اب مذاہب کے تقابلی مطالعے کے پروفیسر ہو کر ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) جا رہے ہیں، حلقہ مطالعہ جامعہ کالج کے منتظموں کی درخواست پر انھوں نے ۱۹ر نومبر ۱۹۶۳ء کو ایک گراں قدر مقالہ پڑھا، مقالہ کا عنوان تھا۔

The concept of the Shari'ah among some mutakallimin

اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ فرمایا ہے کہ بغدادی، اشعری، غزالی اور شہرستانی وغیرہ نے شریعت کے لفظ کا استعمال بہت کم کیا ہے، اُن کے یہاں 'شرع' کا لفظ ملتا ہے، ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ یہ بات بہت اہم ہے، شریعت کے لفظ کا استعمال بعد میں بہت کثرت سے ہوا ہے اور جیسا کہ بعد میں تبادلۂ خیالات کے دوران انھوں نے پروفیسر محمد مجیب صاحب کی اس رائے سے اتفاق ظاہر کیا کہ شریعت اور تقلید کا مفہوم لوگوں نے ایک سمجھ لیا اور جب تقلید مسلم نظام فکر کا سنگ بنیاد بن گئی تو اسی کو شریعت کا نام دے دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بات کو بہت خوبی سے ظاہر کیا کہ 'شرع' مصدر ہے اور اس سے ایک تسلسل مراد ہے، ایک Process اور کوئی مدون اور منجمد سی چیز نہیں، یہ بات اگر مان لی جائے تو بدلتے ہوئے زمانہ میں احوال و ظروف کے مطابق 'شرع' کی تعبیر ہوتی رہے گی اور اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب سے جب سوال کیا گیا کہ تفاسیر اور فقہ کی اولین کتابوں میں بھی کیا یہی صورت ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ میرا یہ مقالہ محض چند متکلمین کی مشہور تصنیفات پر مبنی ہے مفسروں اور فقیہوں کے بارے میں ابھی تک بے خبر ہوں کہ انھوں نے 'شرع' کا لفظ کثرت سے استعمال کیا ہے یا شریعت کیا ہے۔

(ض - ح - ف)

تعلیمی میلا، غزل پر سمپوزیم

حسب معمول امسال بھی تعلیمی میلا منایا گیا اور ۸ ، ۹ اور ۱۰ نومبر کو جامعہ کی زندگی میں چہل پہل پیدا ہوگئی۔ معمول کے مطابق سبھی پروگرام تھے، جامعہ کے تعلیمی کاموں کی نمائش کی گئی، ڈرامے کیے گئے، بیت بازی، محفل موسیقی، مباحثہ، مشاعرہ، ابتدائی تعلیم اور غزل پر سمپوزیم غرض سبھی کچھ تھا۔ میلے کے موقع پر مشاعرہ پہلی مرتبہ کیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل الگ سے شائع کی جارہی ہے، ابتدائی تعلیم پر سمپوزیم کا انتظام استادوں کے مدرسے نے کیا تھا اور غزل پر مکتبہ جامعہ نے۔ غزل کے سمپوزیم کی تمام تقریریں ماہنامہ کتاب نما کی جنوری کی اشاعت میں شائع کی جارہی ہیں۔

انجمن اتحاد کی مسند نشینی

۱۲ نومبر کو انجمن اتحاد کی مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ ملک جاوید نائب صدر، حبیب الرحمٰن ناظم اور صغیر احمد انصاری ایڈیٹر نے اپنے عہدے سنبھالے۔ امیر جامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے بھی شرکت فرمائی، شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے جامعہ کی امتیازی خصوصیات کو یاد دلایا اور امیر جامعہ کی تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائٹل: دیال پریس دہلی

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

۲/۲/۱۹۶۳

یہ کتاب اُس تاریخ کو جو سب سے آخیر میں ڈالی گئی ہے
واپس کرنی ہے، ورنہ پانچ پیسے روزانہ کے حساب سے
ہرجانہ ادا کرنا ہوگا

~~1.8.77~~		
5.11.78		